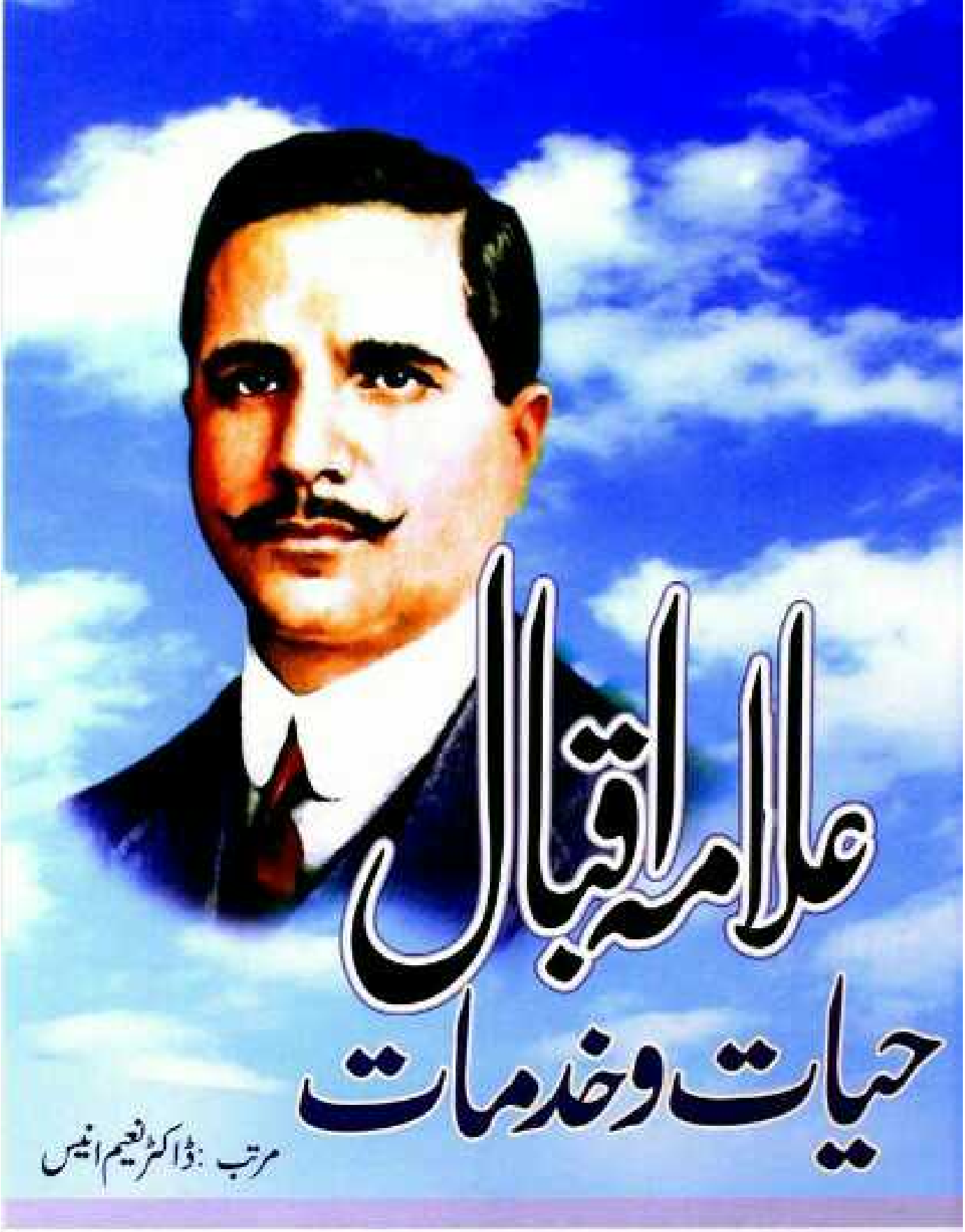

علامہ اقبال

حیات و خدمات

مرتب: ڈاکٹر نعیم انیس

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

علامہ اقبال: حیات و خدمات

مرتب:

ڈاکٹر نعیم انیس

ناشر

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

جملہ حقوق محفوظ بحق

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

۷۵/۲-۱اے، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا-۷۰۰۰۱۶

سال اشاعت : ۲۰۱۵ء

تعداد اشاعت : ۱۰۰۰

قیمت : ۲۵۰ (دوسو پچاس) روپے

صفحات : ۴۳۲

کمپوزنگ : شاہین پروین، کولکاتا

مطبع : درپن پبلی کیشنز انٹرنیشنل لمیٹڈ

بھاٹی پوٹا، ڈاک خانہ: بھوجیر ہاٹ، ضلع: جنوبی ۲۴ پرگنہ

ALLAMA IQBAL : HAYAAT-O-KHIDMAAT

Compiled By: **Dr. Nayeem Anis**

ISBN **978-93-84286-15-6**

Price **Rs. 250/-** Edition : **2015**

Published by: **West Bengal Urdu Academy**

75/2A, Rafi Ahmed Qidwai Road, Kolkata - 16

انتساب

عالی جناب سلطان احمد

(چیئرمین، استقبالیہ کمیٹی سہ روزہ ''جشن اقبال'' تقریبات)

کی اردو دوستی اور ادب نوازی

کے نام

مشمولات

○ پیغام	محترمہ ممتا بنرجی	7
○ پیغام	پروفیسر سید منال شاہ القادری	9
○ پیغام	جناب سلطان احمد	11
○ پیغام	ڈاکٹر ولید اقبال	13
○ اپنی بات	محمد شاہد	15
○ علامہ اقبال : بہ یک نظر		17
○ مقدمہ	ڈاکٹر نعیم انیس	19

مضامین

• اقبال اور آرزوئے انقلاب	پروفیسر عبدالحق	41
• اقبال کے شعری ابعاد اور تعینِ قدر کا مسئلہ	پروفیسر شارب ردولوی	58
• اقبال کی اردو شاعری میں تمثال کاری	پروفیسر یوسف تقی	70
• اقبال کی آفاقیت پر چند باتیں	پروفیسر علی احمد فاطمی	78
• فیض کی اقبال فہمی	ڈاکٹر خالد ندیم	91
• علی سردار جعفری پر اقبال کے اثرات	پروفیسر توقیر احمد خان	113
• بحیثیت محب وطن اقبال کا انفراد و اختصاص	ڈاکٹر زین رامش	124
• علامہ اقبال کے افکار پر جرمن اثرات	ڈاکٹر محمد نعمان خان	133
• اقبال اور کالی داس کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی	ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	142
• علامہ اقبالؒ اور مسلم فلسطین کی گم شدہ میراث	ڈاکٹر محمد افتخار شفیع	161
• اقبال اور تصوف	ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد	174

• اقبال اور ٹیپو سلطان	ڈاکٹر محمد منصور عالم	182
• اقبال کی شاعری میں دیش بھگتی	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر	191
• علامہ اقبال اور ہمارے ادبی رویے	شاہنواز قریشی	200
• اقبال کی شاعری میں فلسفۂ خودی کا تصور	ڈاکٹر دبیر احمد	206
• ریڈیائی تحریروں میں فکر اقبال کی عکاسی	ڈاکٹر محمد شکیل اختر	218
• علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی مراسلت	ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	240
• جواب شکوہ کا موضوعاتی مطالعہ	ڈاکٹر شمیم احمد	283
• مغربی افکار و تصور اور اقبال	ڈاکٹر ابوبکر عباد	299
• فنون لطیفہ اور اقبال	ڈاکٹر محمد کاظم	310
• ''بانگ درا'' کی نظمیں: ایک تاثر	ڈاکٹر عطیہ رئیس	322
• اقبال کی متصوفانہ فکر پر ایک نظر	ڈاکٹر احمد امتیاز	331
• تفہیم اقبال: ایک مطالعہ	ڈاکٹر عمر غزالی	346
• اقبال اور ضمیر کن فکاں	ڈاکٹر سرفراز جاوید	371
• اقبال کی شخصیت عطیہ فیضی کے خط کی روشنی میں	ڈاکٹر علی احمد ادریسی	380
• اقبال، بنگال اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی	ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی	386
• اقبال کا تصور حیات	ڈاکٹر افسانہ حیات	390
• اقبال کی سیاسی بصیرت	ظفر اقبال	395
• اقبال بحیثیت طنز نگار	ابوالبشر	400
• اقبال کا تصور ابلیس	نوشاد منظر	408
• شیخ محمد اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور: مشترکہ ثقافتی ورثہ	ڈاکٹر سنگھا مترا باسو اردو ترجمہ: شاہد اقبال	424

❖❖❖

ممتا بنرجی
وزیر اعلیٰ، مغربی بنگال
چیئر پرسن، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا

پیغام

زندگی میں کئی مواقع ایسے آتے ہیں جب آپ خود کو آسمان کی بلندی پر محسوس کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع کا احساس مجھے 29 مئی 2015ء کو نذرل منچ، کولکاتا میں ہوا جہاں مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' کی افتتاحی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم و مذہب کے رہنماؤں نے حصہ لیا اور یہ آزادی کسی فردِ واحد کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ مگر اس جدوجہد کو ایک نئی راہ اس وقت ملی جب ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ''ترانۂ ہندی'' یعنی 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' لکھا۔ اس نظم سے ثابت ہوجاتا ہے کہ انھیں اپنے ملک سے کتنی محبت تھی۔ اس کے ہر مصرعے سے ان کا خلوص جھلکتا ہے۔ بلاشبہ ان کی شاعری آفاقی حیثیت کی حامل تھی۔ وہ اردو جیسی شیریں زبان میں شاعری کرتے تھے جو مجھے بھی بہت پسند ہے۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی دعوت پر ڈاکٹر سر محمد اقبال کے پسر زادے ڈاکٹر ولید اقبال پاکستان سے کلکتہ تشریف لائے اور اپنے دادا کے نام پر ''ترانۂ ہندی ایوارڈ'' قبول کیا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ یہ جشنِ اردو اکاڈمی کا بہت بڑا قدم تھا جسے کولکاتا اور اطراف کے محبانِ اردو نے زبردست کامیابی سے ہم کنار کیا۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی حیات و خدمات پر ''جشنِ اقبال'' کے دوران منعقد ہونے والے سیمینار میں پیش کیے گئے مقالے اس کتاب کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں، جس کے لیے میں اکاڈمی کے عہدے داروں کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

پروفیسر (ڈاکٹر) سید منال شاہ القادری
وائس چیئرمین، مغربی بنگال اردو اکاڈمی
کولکاتا

عرضِ خدمت

29 مئی تا 31 مئی 2015ء کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' منایا، جس میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو بعد از مرگ ''ترانۂ ہندی ایوارڈ'' دیا گیا۔ اس ایوارڈ کو مغربی بنگال کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ ممتا بنرجی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے علامہ اقبال کے پسر زادہ جناب ولید اقبال کے حوالے کیا، جو خاص اس ایوارڈ کو لینے کے لیے پاکستان سے آئے تھے۔ اس جشن کو کامیاب بنانے میں جناب سلطان احمد (ایم پی لوک سبھا) اور جناب ندیم الحق (ایم پی راجیہ سبھا) نے نمایاں طور پر حصہ لیا۔

جشن کے دوسرے دن علامہ اقبال کی حیات و خدمات پر ایک بین اقوامی سیمینار بھی منعقد کیا گیا تھا جس میں عالم گیر شہرت کے حامل اقبال شناس حضرات نے حصہ لیا اور بیش بہا مقالے پیش کیے جن سے حاضرینِ مجلس مستفید ہوئے۔ لیکن جو علما و فضلا، اسکالرس، طلبا و طالبات اور علامہ اقبال کے شائقین سیمینار میں شریک نہ ہو سکے، ان کے لیے سیمینار میں پیش کردہ مقالات کو جمع کر کے اکاڈمی کی جانب سے شائع کیا جا رہا تا کہ وہ بھی مستفید ہو سکیں اور یہ کتاب علامہ اقبال پر ایک حوالے کی شکل اختیار کر لے۔ کتاب کو ترتیب دینے کی ذمہ داری اکاڈمی کی گورننگ باڈی کی میٹنگ میں ڈاکٹر نعیم انیس کو دی گئی تھی جنھوں نے پوری محنت کے ساتھ کتاب ترتیب دی ہے۔ انھیں مبارک باد پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

سلطان احمد
چیئرمین، استقبالیہ کمیٹی
سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' تقریبات

پیغام

مغربی بنگال کی سرزمین فرقہ وارنہ اور لسانی ہم آہنگی کا مرکز رہی ہے۔ یہاں کے عوام امن وآشتی پسند ہیں۔ وزیر اعلیٰ محترمہ ممتا بنرجی کی قیادت میں ریاست کی موجودہ حکومت ریاست میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی سرپرستی کرتی ہے جن میں اردو بھی شامل ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد ہی اردو کو اس کا واجب حق یعنی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا جو ریاست بھر کے اہالیانِ اردو کا دیرینہ مطالبہ تھا۔

علامہ اقبال اردو کے مقبول ترین شاعر ہیں جن کی شاعری میں انسانیت کی سربلندی کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس عظیم ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے 29 مئی تا 31 مئی 2015ء کو سہ روزہ ''جشنِ اقبال'' منایا جس کے دوران انھیں بعد از مرگ ''ترانۂ ہندی'' ایوارڈ دیا گیا جو ان کے پسرزادے ڈاکٹر ولید اقبال نے قبول کیا۔ جشن کے دوسرے روز یعنی 30 مئی 2015ء کو علامہ اقبال کی حیات وخدمات پر بین اقوامی سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا جس کے دوران گراں قدر مقالے پیش کیے گئے۔ اکاڈمی کی گورننگ باڈی نے اس سیمینار کے مقالوں کو کتابی شکل میں لانے کا فیصلہ کیا اور اس کی ترتیب کی ذمہ داری ڈاکٹر نعیم انیس کو سونپی گئی۔ سیمینار میں کیے گئے وعدے کے مطابق یہ کتاب اہلِ علم وادب کی نذر کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ کتاب کی اشاعت کے لیے میں مرتب کو پیشگی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اقبال فہمی میں معاون ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر ولید اقبال
لاہور، پاکستان

پیغام

سرزمین ٹیگور و نذرل کولکاتا میں گذشتہ 29 مئی 2015ء کو علامہ سر محمد اقبال کو ''ترانۂ ہندی ایوارڈ'' کی صورت میں جو عظیم الشان خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، وہ فقید المثال ہے۔ اس کے لیے میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے اربابِ حل و عقد خصوصاً چیئر پرسن محترمہ ممتا بنرجی (وزیر اعلیٰ، مغربی بنگال)، پروفیسر (ڈاکٹر) سید منال شاہ القادری (وائس چیئرمین، مغربی بنگال اردو اکاڈمی) اور معزز رکن عالی جناب سلطان احمد (ممبر لوک سبھا) کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ علامہ اقبال ایک شاعر کے ساتھ ساتھ سیاست داں بھی تھے اور انھوں نے عملی سیاست میں حصہ بھی لیا تھا۔ علامہ ایک آئیڈیل سیاسی رہ نما میں جو خوبیاں تلاش کرتے تھے، وہ محترمہ ممتا بنرجی میں بخوبی موجود ہیں۔ ان کا ایک شعر جو انھوں نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

محترمہ پر صادق آتا ہے۔ وہ سادگی کا پیکر ہیں۔ زمین سے جڑی ہوئی ہیں اس لیے غریبوں و اقلیتوں کا خصوصی خیال رکھتی ہیں۔

یہ خبر باعثِ مسرت ہے کہ ''جشنِ اقبال'' کے دوران علامہ کی حیات و خدمات کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے دوران پیش کیے جانے والے مقالوں کو کتابی شکل دی جا رہی ہے۔ میں اس کے لیے مرتبِ کتاب ڈاکٹر نعیم انیس و دیگر وابستگانِ اکاڈمی کو اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

محمد شاہد
سکریٹری، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا

اپنی بات

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے 29 مئی تا 31 مئی 2015ء کو اردو و فارسی کے عظیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے سہ روزہ ''جشن اقبال'' کا اہتمام کیا تھا۔ اس جشن کی افتتاحی تقریب میں انھیں بعد از مرگ ''ترانۂ ہندی ایوارڈ'' دیا گیا جو ان کے پسر زادے ڈاکٹر ولید اقبال نے قبول کیا۔ جشن کے دوسرے دن ایک بین اقوامی سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں پاکستان سے بطور خاص معروف محقق اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر خالد ندیم (استاذ، شعبۂ اردو، سرگودھا یونیورسٹی) تشریف لائے۔ ہندوستان کے بھی صف اول کے محققین، نقاد اور ریسرچ اسکالر حضرات نے سیمینار میں حصہ لیا اور گراں قدر مقالے پیش کیے جن میں ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق اور معرف نقاد پروفیسر شارب ردولوی بھی شامل تھے۔ سیمینار کے بعد مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی گورننگ باڈی کی میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ مقالات کی اہمیت کے پیش نظر انھیں یک جا کر کے کتابی شکل دی جائے۔ کتاب کی ترتیب کا اہم کام اکاڈمی کی پبلی کیشن سب کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر نعیم انیس کو سونپا گیا۔

بالآخر کتاب تیار ہے جس کے لیے میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی جانب سے ڈاکٹر نعیم انیس کا شکر گزار ہوں۔ امید ہے کہ یہ کتاب ''علامہ اقبال: حیات و خدمات'' اقبال شناسی کے نئے در کھولے گی اور اساتذہ، ریسرچ اسکالرز نیز اردو ادب کے عام قاری اس کتاب سے مستفیض ہوں گے۔

علامہ اقبال

بہ یک نظر

1877ء 9 نومبر کو سیالکوٹ میں پیدائش ہوئی۔

1892ء اسکوٹش مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کیا۔

1897ء گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔

1898ء عربی زبان میں پوزیشن حاصل کرنے پر ''فقیر سید جمال دین میڈل'' ملا۔

1899ء گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ''خان بہادر شیخ نامک بخش میڈل'' سے نوازے گئے۔

1903ء گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر بنائے گئے۔

1904ء ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' جیسی مشہور نظم لکھی۔

1905ء اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانگی۔

1907ء اپنے ''تھیسس'' ''دی ڈیولپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا'' پر میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

1908ء بار (وکلا کی تنظیم) میں بلائے گئے۔

1911ء مشہور نظم "شکوہ" لکھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر بنائے گئے۔

1914ء 9 نومبر کو والدہ امام بی بی کا انتقال

1915ء "اسرارِ خودی" کی اشاعت

1918ء "رموزِ بے خودی" کی اشاعت

1920ء "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ اے آر نکولسن نے کیا۔

1923ء مشہور نظم "پیامِ مشرق" کی اشاعت

1924ء "بانگِ درا" کی اشاعت، جاوید اقبال کی پیدائش

1926ء پنجاب قانون ساز کونسل کے لیے منتخب ہوئے۔

1927ء "زبورِ عجم" کی اشاعت

1928ء "اسلام میں مذہبی فکر کی تعمیرِ نو" کے تحت تقاریر کی ایک سیریز

1930ء الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ سیشن کی صدارت، والد نور محمد کا انتقال

1931ء لندن میں سیکنڈ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت

1932ء لندن میں تھرڈ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت، نپولین کے مقبرے پر حاضری

1933ء مسولینی سے ملاقات، پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ ان لٹریچر کی اعزازی ڈگری

1935ء "بالِ جبریل" کی اشاعت اور آخری وصیت تحریر کی۔

1936ء "ضربِ کلیم" کی اشاعت

1938ء پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات، 21 اپریل کو لاہور میں انتقال اور بادشاہی مسجد کے احاطے میں تدفین، بعد از مرگ "ارمغانِ حجاز" کی اشاعت۔

❖❖❖

مقدمہ

شہرِ نشاط کولکاتا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جدید اردو نثر کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے لے کر اب تک اردو نثر کے فروغ میں اس شہر نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ بات اردو صحافت کی ہو یا اردو کے شعری و نثری ادب کی، دونوں ہی حوالوں سے کولکاتا کی ایک شان دار اور مضبوط ادبی روایت رہی ہے۔ یہ شہر بھی محبِ اردو ہے جہاں بنگلہ زبان والے اس زبان کو محبت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب یہاں آئے اور اس پھر اس شہر کی یادوں کو تادمِ آخر اپنے ذہن و دل سے فراموش نہیں کر سکے۔ یہ مہا کوی رابندر ناتھ ٹیگور اور مشہور انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کا دیار ہے۔ علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ ایک عالم اس سے تہذیب و ثقافت کے درس لیتا آیا ہے۔ ساتھ ہی یہاں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے پرستاروں کی کمی نہیں جس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ یہاں علامہ کی نظمیں اور غزلیں پہلی جماعت سے ایم. اے. تک نصاب میں شامل ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ''اقبال چیئر'' قائم ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے نصاب کا ایک مکمل پیپر علامہ اقبال کی شاعری پر مبنی ہے۔ مئی 2015ء میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی

کے زیر اہتمام جشن اقبال میں وزیر اعلیٰ محترمہ ممتا بنرجی کی اقبال کے تئیں عقیدت اور عالی جناب سلطان احمد (رکن پارلیمنٹ و رکن گورننگ باڈی، مغربی بنگال اردو اکاڈمی) کی ذاتی دلچسپی و کاوشوں سے عالیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم ہو چکا ہے۔ یہاں بھی بی اے اور ایم اے کے نصاب میں علامہ اقبال کے فن پر ایک مکمل پرچہ شامل نصاب ہے۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ جشن اقبال کی افتتاحی تقریب میں وزیر اعلیٰ مغربی بنگال محترمہ ممتا بنرجی نے علامہ اقبال کے پسر زادے ڈاکٹر ولید اقبال کو "ترانۂ ہندی ایوارڈ" سے نوازتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ عالیہ یونیورسٹی میں ہم اقبال چیئر بھی قائم کریں گے۔ اس اعلان کے کچھ ہی دن بعد وزیر اعلیٰ (جو مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی چیئر پرسن بھی ہیں) نے اپنے اس قول کو عملی صورت عطا کرتے ہوئے سرکاری سطح پر کارروائی کرتے ہوئے اور اس کی تکمیل کی مہر ثبت کرتے ہوئے برصغیر میں ایک نئی تاریخ رقم کی نیز اردو زبان و ادب اور علامہ اقبال سے اپنی محبت کا واضح ثبوت پیش کیا۔

اہل بنگال ہمیشہ سے علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت کا دل سے احترام کرتے آئے ہیں۔ یہاں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے ادبی و ثقافتی مقابلوں میں اقبال کی نظمیں اور غزلیں سنانا باعث افتخار مانا جاتا رہا ہے۔ علامہ اقبال کے نام سے بے شمار علمی، ادبی، ثقافتی اور سماجی ادارے قائم ہیں جو اپنے اپنے طور پر قوم و ملت کی خدمت کا فریضہ احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے نام سے نہ صرف اردو میڈیم اسکول قائم ہیں بلکہ شاہراہیں بھی منسوب ہے۔

محترمہ ممتا بنرجی کو نہ صرف اردو سے سچی محبت ہے بلکہ وہ علامہ اقبال کی شاعری سے بھی بے حد متاثر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تقاریر میں اکثر علامہ اقبال کے اشعار نہایت جوش و خروش کے ساتھ پڑھتی ہیں۔

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی مجلس عاملہ کی تشکیل نو کے بعد اردو زبان و ادب کے فروغ کے حوالے سے مسلسل جو کام کیے جا رہے ہیں، ان سے سبھی واقف ہیں۔ اکاڈمی سے وابستہ تمام ممبران کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہم حکومت کی سرپرستی میں اکاڈمی کو بلندی پر لے جائیں۔ "جشن اقبال" اس خوب صورت اور مضبوط روایت کا ایک سلسلہ ثابت ہوا ہے۔

''جشنِ اقبال'' تقریبات کا خیال اکاڈمی کے ذمہ داران میں سے خصوصی طور پر عالی جناب سلطان احمد صاحب کو اس وقت آیا جب 9 نومبر 2014ء کو علامہ اقبال کی یوم ولادت کے موقع پر اکاڈمی کی جانب سے توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا اور اس میں مقرر کی حیثیت سے پروفیسر توقیر احمد خان (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) اور پروفیسر یوسف تقی (سابق صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) تشریف لائے اور اپنے گراں قدر مقالوں سے اس خصوصی تقریب کو کامیاب بنایا۔

علامہ اقبال کی حیات و خدمات کے حوالے سے اس توسیعی خطبے میں جہاں مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، وہیں پروفیسر یوسف تقی نے سلطان صاحب کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی میں علامہ اقبال کے حوالے سے خاطر خواہ کتابیں موجود نہیں ہیں۔ اگر مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی لائبریری میں گوشۂ اقبال قائم کیا جائے اور علامہ اقبال کی حیات و خدمات پر لکھی جانے والی کتابیں یہاں رکھی جائیں تو ادب نواز حضرات کے علاوہ طلبا اور ریسرچ اسکالروں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔ انھیں اقبال شناسی میں نہ صرف مدد ملے گی بلکہ علامہ اقبال پر تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں گی، جس کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ اس موقع پر پروفیسر یوسف تقی صاحب کی بات مکمل ہوتے ہی سلطان احمد صاحب نے یہ اعلان کیا کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی لائبریری میں بہت جلد نہ صرف ''گوشۂ اقبال'' قائم ہوگا بلکہ شاعرِ مشرق کی حیات وفن اور عہدِ حاضر میں ان کے خیالات وافکار کی اہمیت پر ایک عالمی سیمینار بھی منعقد کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اکاڈمی کی جانب سے علامہ اقبال کے حوالے سے مطبوعات کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی ایسے طلبا و طالبات کو وظیفہ بھی دے گی جو علامہ اقبال کے حوالے سے تحقیقی کام کرنے کی خواہش مند ہوں گے۔ سلطان صاحب کے اس اعلان کا حاضرینِ مجلس نے گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔

پروفیسر توقیر احمد خان نے اپنا توسیعی خطبہ پڑھنے کے بعد مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی اردو خدمات اور اقبال نوازی کے لیے اکاڈمی کے تمام ممبران کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلطان صاحب کے اس جذبے کو سلام۔ اگر موصوف کی سرپرستی میں یہ کام

پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اس سے آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوں گی اور آپ کے اس نیک عمل کی ہمیشہ شکر گزار بھی رہیں گی۔ توسیعی خطبے کی تقریب ان خوش گوار اعلانات پر اختتام پذیر ہوئی۔ دوسرے دن شہر کے تمام اردو اخبارات نے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی تقریب میں سلطان صاحب کی جانب سے ادا کیے جانے والے ان کلمات کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی لائبریری میں علامہ اقبال کے گوشے کا قیام وقت کی اشد ضرورت ہے اور یہ اکاڈمی کا ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔

تقریب کے بعد جب اردو اکاڈمی کی گورننگ باڈی کی میٹنگ ہوئی تو 'علامہ اقبال' میٹنگ کا موضوع خاص رہے۔ اکاڈمی کی لائبریری سب کمیٹی کے چیئرمین جناب سید شہاب الدین حیدر صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ 'گوشۂ اقبال' کے قیام کے لیے فوراً کام شروع کردیں اور علامہ اقبال کی فکر وفن پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی فہرست تیار کر کے لائبریری کے لیے جس قدر جلد ممکن ہو، منگوالیں اور اس طرح علامہ اقبال کے سلسلے سے منظم طور پر اکاڈمی میں سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ اکاڈمی کی جنرل کونسل کا وقت قریب آگیا تو اس سے قبل اکاڈمی کی ایک میٹنگ میں سلطان صاحب نے کہا کہ اکاڈمی کی لائبریری میں 'گوشۂ اقبال' کے قیام کی تیاری جاری ہے۔ ہم لوگ اس پروگرام کو اور منظم طور پر کرنا چاہتے ہیں اور تقریبات سہ روزہ ہوں گی۔ جنرل کونسل کی میٹنگ میں اس کا خاکہ پیش کردیا جائے گا کیوں کہ وزیر اعلیٰ مغربی بنگال نے بھی علامہ اقبال کے حوالے سے ادبی وثقافتی تقریبات منعقد کیے جانے پر ذاتی دلچسپی دکھائی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ تقریب علامہ اقبال کے شایانِ شان ہوں۔

سلطان صاحب پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی جاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے جشنِ اقبال کے سلسلے میں وہاں اہلِ علم حضرات سے رابطے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پروفیسر توقیر احمد خاں نے دہلی میں اپنے استادِ محترم اور ماہرِ اقبالیات پروفیسر عبدالحق صاحب سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی میں منعقد ہونے والے توسیعی خطبے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اہلِ بنگال کس قدر اقبال کے عقیدت مند ہیں اور اکاڈمی کے ذمہ داران بالخصوص سلطان احمد صاحب اقبال کے حوالے سے ایک عظیم الشان تقریب کا

اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ تو عبدالحق صاحب نے اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایسے ادب نواز انسان سے تو ضرور ملنا چاہیے۔ اس طرح سلطان صاحب کی ملاقات دہلی میں عبدالحق صاحب سے ہوئی، جن سے مل کر انھیں اس کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ علامہ اقبال کے حوالے سے جس طرح کی تقریبات کا خواب دیکھ رہے ہیں، اسے عملی صورت عطا کرنے میں پروفیسر عبدالحق کی رہنمائی بڑی کارگر ثابت ہوگی۔

سلطان صاحب نے عبدالحق صاحب سے یہ گذارش بھی کی کہ علامہ اقبال کے خاندان میں سے کسی فرد کو اس تقریب میں آنے کی دعوت دی جائے اور عالمی سیمینار میں ہندو پاک کے نام ور ادبا شرکت کریں تاکہ یہ تقریب اہل علم و ادب حضرات کے ذہنوں پر ان مٹ نقوش قائم کرے۔ پروفیسر عبدالحق صاحب نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا پورا تعاون پیش کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ دہلی سے واپسی پر سلطان صاحب نے راقم الحروف کو بلا کر ساری تفصیل بتائی اور کہا کہ آپ بھی لوگوں سے رابطہ قائم کریں تاکہ جنرل کونسل کی میٹنگ میں اس تقریب کی پوری تفصیل پیش کر دی جائے۔

سلطان صاحب جشن اقبال کے سلسلے سے پوری طرح سنجیدہ ہو چکے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ جشن ایسا ہو کہ اس کی گونج پورے برصغیر میں سنائی دے اور برسوں تک لوگ اسے یاد رکھیں۔ وہ جب بھی دہلی جاتے تو پروفیسر عبدالحق سے مشورہ کرتے رہتے۔ مجھے انھوں نے اس بات کی اجازت پہلے ہی دے رکھی تھی کہ آپ بھی متعلقہ افراد سے رابطہ بنائے رکھیں۔ ان کے جذبۂ شوق کی پرواز کے مدنظر میں نے دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر توقیر احمد خاں سے رابطہ کیا اور ان سے گذارش کی کہ لاہور میں علامہ اقبال کے صاحب زادے جسٹس جاوید اقبال کا فون نمبر اور مکمل پتہ مجھے ای میل کر دیں تاکہ خط و کتابت کی جا سکے۔ توقیر صاحب کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی میں علامہ اقبال پر توسیعی خطبہ کے دوران سلطان صاحب کی ادب نوازی اور اقبال سے گہری عقیدت و محبت کا ثبوت مل چکا تھا۔ لہٰذا انھوں نے دوسرے ہی دن مجھے جسٹس جاوید اقبال صاحب کے گھر کا پتہ میل کر دیا جس میں تمام تفصیلات موجود تھیں۔ پھر فون پر بتایا کہ میں نے یہ تفصیلات سابق ڈائریکٹر اقبال اکاڈمی، لاہور، پاکستان جناب محمد سہیل کی مدد سے حاصل کی ہیں۔ انھوں نے موجودہ ڈائریکٹر اقبال

اکاڈمی، جناب احمد جاوید سے ذاتی گذارش کی تھی کہ اس سلسلے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے احمد جاوید صاحب نے اپنے پرسنل سکریٹری قیصر محمود شاہ کو ہدایت دی کہ محمد سہیل عمر صاحب کی مطلوبہ معلومات ان کو پہنچادی جائیں اور تمام معلومات حاصل ہوجانے کے بعد انھوں نے یہ ہدایت بھی لکھی تھی کہ جسٹس جاوید اقبال صاحب کی عمر 90 سال سے تجاوز کرچکی ہے۔ ان دنوں ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا وہ کسی سے فون پر بات نہیں کرتے۔ آپ ناصرہ اقبال سے رابطہ کریں۔ ان کا بھی فون نمبر اور ای میل آئی ڈی بھیج رہا ہوں۔ میں نے توقیر صاحب کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ بھی آپ کے تعاون کی ضرورت ہمیں پڑتی رہے گی۔ انھوں نے بے حد انکساری سے کہا کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہوں۔

11 اپریل کو اکاڈمی کی جنرل کونسل کی میٹنگ تھی کہ اسی روز پروفیسر عبدالحق صاحب کا فیکس آیا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ پاکستان میں کئی ماہرین اقبالیات سے ان کی گفتگو ہوئی ہے اور وہ اس جشن میں شرکت کے خواہش مند بھی ہیں۔ موصوف نے ڈاکٹر ولید اقبال، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر اے رحمت علی کے پتے اور فون نمبر بھی بھیج دیے۔ جنرل کونسل کی میٹنگ میں سلطان صاحب اور اکاڈمی کے وائس چیئرمین پروفیسر سید منال شاہ القادری نے ''جشن اقبال'' کا تفصیلی خاکہ پیش کیا جس کی شرکائے مجلس نے بھرپور حمایت کی۔ اسی میٹنگ میں سہ روزہ جشن اقبال کی تاریخ 29 مئی تا 31 مئی 2015ء طے پائی۔ سبھی نے یہ بھی کہا کہ جشن اقبال کی تقریبات کا اہتمام شان و شوکت کے ساتھ کیا جائے گا۔ اکاڈمی کے سکریٹری محمد شاہد اور لائبریرین نیاز الحق صاحبان کو جشن اقبال کی تیاری کے سلسلے میں ملک و بیرون ملک سے ادبا و شعرا سے رابطہ قائم کرنے کی ذمے داری سپرد کی گئی۔

گورنگ باڈی، جنرل کونسل، اکاڈمی کے ملازمین کے علاوہ مغربی بنگال کے اردو داں طبقے میں بھی اس جشن کے حوالے سے بے حد جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا اور جب سلطان احمد صاحب نے یہ خوش خبری سنائی کہ ان کی اور جناب ندیم الحق کی کوششوں سے یہ امید بندھ چلی ہے کہ پاکستان سے کئی نام ور اسکالروں کے علاوہ علامہ اقبال کے پسر زادے ڈاکٹر ولید اقبال بھی اس جشن میں شرکت کے لیے کولکاتا آئیں گے تو ہم سبھی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ

نہیں رہا۔ انھوں نے مزید کہا کہ پروفیسر عبدالحق کے توسط سے علامہ اقبال کے صاحب زادے جسٹس جاوید اقبال صاحب سے اس تقریب میں شرکت کی بات ہوئی تھی مگر وہ ان دنوں سخت بیمار ہیں، سفر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ اپنے ہونہار فرزند ڈاکٹر ولید اقبال کو اس جشن میں خانوادۂ اقبال کی نمائندگی کے لیے بھیج رہے ہیں۔

2 مئی 2015ء کو اکاڈمی کی گورننگ باڈی کی میٹنگ ہوئی جس میں اتفاق رائے سے سلطان احمد صاحب کو "جشنِ اقبال" کے سلسلے سے ہونے والی سہ روزہ تقریبات کی استقبالیہ کمیٹی کا چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اس میٹنگ میں یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ اس موقع پر اکاڈمی کی جانب سے وزیراعلیٰ کے ہاتھوں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی شعری خدمات کے اعتراف میں انھیں بعد از مرگ "ترانۂ ہندی ایوارڈ" سے نوازا جائے گا، جسے ان کے پسرزادے ڈاکٹر ولید اقبال وصول کریں گے۔

علامہ اقبال کی حیات و خدمات پر منعقد کیے جانے والے عالمی سیمینار کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں ملک و بیرون ملک میں ادبی سیمینار میں ایک خالی پن کا احساس ہوتا ہے اور آڈیٹوریم کی خالی کرسیاں اپنا حالِ زار بیان کرتی نظر آتی ہیں، وہیں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے مولانا آزاد آڈیٹوریم میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق کرنے والے معزز افراد کے علاوہ طلبا اور ریسرچ اسکالروں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ ایسا منظر پہلی بار دیکھا گیا کہ سیمینار ہال میں داخلہ بذریعہ کارڈ ہو رہا تھا۔ بہت سارے لوگ جو تاخیر سے آئے، ہال میں کھڑے ہو کر مقالے سنے اور بے زاری یا اکتاہٹ کا اظہار ذرا بھی نہیں کیا۔ پہلے اور دوسرے سیشن کی مجموعی طور پر ایک ہی صورت حال تھی۔ اہلِ کلکتہ کی مہمان نوازی، علمی و ادبی ذوق اور اقبال نوازی کے جذبے کو دیکھ کر ڈاکٹر ولید اقبال بے ساختہ کہہ اٹھے کہ کولکاتا علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا اپی سینٹر ہے۔ ایسی مہمان نوازی اور سیمینار میں لوگوں کا ہجوم دیکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اس طرح کی مہمان نوازی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف مغربی بنگال میں ہی ممکن ہے۔ آپ حضرات نے علامہ اقبال کی جس طرح سے پزیرائی کی ہے، اس نے میرا دل سرشار کر دیا ہے۔ میں ان لمحوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

پروفیسر عبدالحق جن کی قائدانہ سرپرستی میں "جشن اقبال" کا لائحۂ عمل تیار کیا گیا اور جس طرح انھوں نے پورے ایک ماہ تک مسلسل صبح و شام سلطان احمد صاحب و مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے ذمہ داران سے رابطہ بنائے رکھا، انھوں نے سیمینار کے حوالے سے کہا کہ بنگال کے اردو دوستوں نے اپنی موجودگی سے جس محبت کا ثبوت دیا ہے، وہ میں نے اسلام آباد اور لاہور میں بھی نہیں پایا۔ اقبال سے یہ والہانہ لگاؤ، یہ عقیدت و احترام اور محبت ہندوستان کے کسی خطے میں نظر نہیں آتی۔ حیرت ہے کہ اتنی کثیر تعداد میں ادب نوازوں کا مجمع افتتاح سے اختتام تک ہال میں موجود رہا۔ یہ اقبال کی جاذبیت کا اعجاز ہی تو ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے جشن اقبال منعقد کر کے تاریخ سازی کی ہے۔

اس عالمی سیمینار میں پیش کیے جانے والے تمام مقالے کامیاب تھے، جس میں مقالہ نگاروں نے علامہ اقبال کی حیات، شخصیت اور شاعری کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کرتے ہوئے نہ صرف خوب صورت گفتگو کی بلکہ تحقیق و جستجو کے نئے در بھی وا کیے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سیمینار نے اقبال فہمی اور اقبال شناسی کا فریضہ بھی احسن طریقے سے انجام دیا۔

اس طرح مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام سرزمین کلکتہ میں پہلی بار ایک ایسی سہ روزہ تقریبات کا اہتمام "جشن اقبال" کے عنوان سے ہوا جس کی دھوم عالمی سطح پر سنائی دی۔ ایسا بے مثال خراج عقیدت، خانوادۂ اقبال کی ایسی شان دار پذیرائی، ایسا کامیاب عالمی سیمینار اور لاجواب عالمی مشاعرہ، اکاڈمی کی لائبریری میں لائبریری سب کمیٹی کے چیئرمین سید شہاب الدین حیدر کی نگرانی میں گوشۂ اقبال کا قیام اور اس میں علامہ اقبال کے حوالے سے نادر و نایاب کتابوں کی فراہمی کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے۔ ہر تقریب کا رنگ جدا، انداز منفرد، لوگوں کا جم غفیر، اقبال کے پرستاروں کی دیوانگی، جدھر دیکھیے اقبال، اقبال اور اقبال کی صدائے والہانہ۔ ایسا منظر پہلے کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔ دوردرشن نے تمام تقریبات کو براہ راست دکھایا اور پوری اردو دنیا ایسی باوقار تقریب دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ "جشن اقبال" کی تقریبات نے مغربی بنگال اردو اکاڈمی میں ایک نئی تاریخ رقم کی جس کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔

سیمینار کے موقع پر ہی یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ان مقالوں کو جلد ہی کتابی صورت میں اہل علم و ادب اور قدر شناسان اقبال کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وزیر اعلیٰ

106KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Ha...

مغربی بنگال محترمہ ممتا بنرجی ، وائس چیئر مین مغربی بنگال اردو اکاڈمی پروفیسر سید منال شاہ القادری ،''جشنِ اقبال'' کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئر مین جناب سلطان احمد اور جناب ندیم الحق کی سرپرستی میں سیمینار میں کیا ہوا وعدہ عملی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال انسانیت کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں پوری دنیا کے لوگوں کی دکھ درد کی آواز شامل ہے۔ ان کے یہاں انقلابی تصور بھی ہے اور وطن سے بے پناہ عقیدت بھی۔ ان کے یہاں زندگی کے مسائل بھی ہیں اور ان کا مناسب حل بھی۔ اقبال کی شاعری میں جہاں دردمندوں کا گلہ ہے وہیں اس کا سلیقہ سے جواب بھی موجود ہے۔ اقبال کو جتنی بار پڑھیں ہر بار ایک نیا لطف ، ایک نئی سرشاری کے احساس میں ہم ڈوب جاتے ہیں اور ایک نئے جہان سے ہماری آگہی کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں جو تنوع ہے وہ ہمیں اپنی جانب کھینچتا ہے۔ اقبال ہمارے مطالعہ کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔

اقبال آفاقی شاعر ہیں لہٰذا ان کا پیغام بھی آفاقی ہے۔ انھیں یا ان کی شاعری کو سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے نام کے ساتھ مسلمانوں کے شاعر کا لاحقہ جوڑ کر ان کے ادبی قد کو کم کرنے کی سازشیں ضرور رچی گئیں۔ لیکن یہ اقبال کی شاعری کا اعجاز ہی تو ہے کہ اس نے اپنی شاعری سے جس طرح انسانیت کا سبق دیا ہے، ایسا عالمی ادب کے منظرنامے پر کم ہی نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنی فکری جہتوں سے جو نقش و نگار بنائے ہیں ، وہ انمٹ ہیں۔ انھوں نے جس طرح اپنی شاعری سے زندگی کی حقیقتوں کو آشکارا کرتے ہوئے ہمیں ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کیا ہے وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ برصغیر کے مغربی خطے سے علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اور ایک عالم کو منور کرتے ہوئے قوم و ملت کے فکری خدوخال کو نمایاں کرتے ہوئے اسے ایک مثبت سوچ و فکر کا تصور بھی عطا کیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا اہم وصف ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

سرزمینِ مغربی بنگال سے اقبال شناسی پر یہ دوسری اہم کتاب ہے۔ اس سے قبل 1984ء میں پروفیسر ظفر اوگانوی مرحوم (صدر، شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) نے ''رموزِ اقبال'' نامی کتاب ترتیب دی تھی۔ اس دوران تقریباً 3 دہائیاں گزر جانے کے باوجود مغربی بنگال سے

22
of 428

15.4KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

اقبال کے فن پر کوئی اہم کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ زیر نظر کتاب ''علامہ اقبال: حیات و خدمات'' میں کل 31 مضامین ہیں جن میں سے آخری مضمون ڈاکٹر سنگھا مترا باسو کا انگریزی مقالہ ہے جس کا ترجمہ اردو میں نوجوان شاعر و ادیب شاہد اقبال نے کیا ہے۔ ''جشن اقبال'' کے دوران منعقدہ بین اقوامی سیمینار میں 20 افراد کو مقالہ خوانی کی دعوت دی گئی تھی لیکن ان میں سے صرف 11 افراد ہی شریک ہو سکے۔ دیگر حضرات چند نامساعد حالات کی وجہ سے سیمینار میں حاضر نہیں ہو سکے تھے لیکن انھوں نے اپنے مقالہ بھیج کر اپنی موجودگی ضرور درج کرادی تھی۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں فکر اقبال کے حوالے سے کچھ ایسے مقالے بھی شامل ہیں جو اقبال فہمی میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ذیل میں ان تمام مضامین کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر عبدالحق دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمرطس ہیں۔ کتاب میں شامل ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال اور آرزوئے انقلاب'' ہے۔ اقبال کی شاعری کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان پہلوؤں میں ایک اہم انقلابی روح کا اضطراب ہے۔ اقبال کا رگہ فکر و عمل میں تلاطم خیز تبدیلیوں کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ انقلاب جب انگڑائیاں لیتا ہے تو عالم افلاک زیر زمیں اور یہ کرۂ زمیں بالائے آسمان نظر آتا ہے۔ احتجاج کے موثرات معدوم یا بے اثر نظر آتے ہیں تو انقلابی روح کی بے داری کا اعلانیہ لازم ہو جاتا ہے جس میں تمام جبروتی طاقتوں کی طاقت کے نشے کے خاتمے کے لیے صف بستہ ہونا پڑتا ہے۔ بقول پروفیسر عبدالحق:

> ''اقبال کی انقلابی فکر احتجاج کی راہ سے گزر کر بغاوت کی شورش تک جا پہنچی ہے جہاں ہر شے کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کا جاوداں پیغام ملتا ہے۔ یہ بھی نظر میں رہے کہ علامہ کا انقلابی نعرہ صرف ان کے عہد کے جبر و ظلم کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ ہر دور کی جبروتی طاقت کے خلاف اعلان جنگ ہے۔''

پروفیسر شارب ردولوی نے شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں برسوں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال کے شعری ابعاد اور تعین قدر کا مسئلہ'' ہے۔ اقبال کی شاعری کی معنویت اور مقصدیت کی وجہ سے اس کے تعین قدر کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ اس بڑے شاعر کے ساتھ

Guess you like
23
of 428

56.6KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ایک بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ اسے شاعرِ ملت اور شاعرِ اسلام بنا کر اس کی ایک حد معین کر دی گئی۔ اسی وجہ سے انھیں غیر مسلم حلقوں میں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑے شاعر کو محدود نظریے کا شاعر بنا دیا گیا اور ان کا وہ تمام کلام جو انسان دوستی، اعلیٰ افکار، عظیم اقدار، حریت اور عالم گیر رونمائی کے لیے تھا، نظر انداز ہو گیا۔ المختصر اقبال کا تعین قدر کرتے وقت اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوئی ایک وصف نمایاں ہوتا ہے تو دوسرے بہت سے محاسن تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے اقبال فہمی کے لیے جتنی ادبی آگہی کی ضرورت ہے، اتنا ہی علمی لیاقت اور خود آگہی کی ضرورت ہے۔

پروفیسر یوسف تقی شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی کے سابق صدر ہیں۔ ان کے مقالے کا موضوع ''اقبال کی اردو شاعری میں تمثال کاری'' ہے۔ انھوں نے اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے قبل شعری تمثال کاری پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''تمثال کا لغوی مفہوم اردو کے مختلف لغات میں کچھ یوں ہے: خیالی تصویر یا پیکر، مورت، چلا، عکس، شبیہ، سایہ، مثل، مثال، صورت وغیرہ۔ یعنی الفاظ سے متشکل ایک ایسی تصویر جو حسیات کو ابھارے یا جس سے بیان میں جامعیت آئے اور قاری کے ذہن کو شاعر کے بیان کی تہہ میں موجود موضوع کی طرف لے جانے پر قادر ہو اور پھر شاعر تمثال میں جو مرکزی خیال بیان کرنا چاہتا ہے۔''

اقبال کے پہلے اردو مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کی ابتدائی نظموں میں اقبال فطرت سے قریب نظر آتے ہیں اور یہاں بعض نظموں میں انگریزی شعرا ورڈزورتھ اور شیلے کی تقلید بھی ملتی ہے۔ ''ایک آرزو''، ''صبح کا ستارہ''، ''گل رنگین''، ''حسن و عشق'' اور ''حقیقت حسن'' میں کائنات کے حسن و جمال سے شیفتگی کا اظہار کیا گیا ہے جو بڑی حد تک ورڈزورتھ کی تقلید ہے۔ ایسے موقعوں پر اقبال کی نظمیں تمثال کاری کا بہترین نمونہ ثابت ہوئی ہیں، جس کے لیے انہوں نے بیانیہ پیرایۂ اظہار کو زیادہ اپنایا۔

پروفیسر علی احمد فاطمی الہ آباد یونیورسٹی میں صدر، شعبۂ اردو ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''اقبال کی آفاقیت پر چند باتیں'' ہیں۔ بحیثیت شاعر اقبال کی عظمت سے انکار ان کا بدترین دشمن بھی نہیں کر سکتا تاہم بعض جگہوں پر اقبال کی آفاقیت سے لوگوں کو دشمنی ضرور

Guess you like
24
of 428

65.2KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

پیدا ہوئی ہے اور اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔ چوں کہ اقبال کی حیثیت صرف شاعر کی نہیں تھی بلکہ وہ مفکر، فلسفی، مصلح اور ہادی بھی تھے، اقبال کی آفاقیت (Universality) اس بات سے ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ حیاتِ انسانی کا کوئی اہم پہلو اقبال کی شاعری سے خارج نہیں ہے بلکہ ان کی پوری شعری کائنات کا مرکز و محور انسان ہے اور یہ انسان' انسان پہلے ہے مسلمان بعد میں۔ اقبال اپنے افکار کو کسی خاص قوم تک محدود نہیں کرتے بلکہ ان کا خطاب پوری دنیا کے انسانوں سے ہے۔ درج بالا نکات اقبال کی آفاقیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم سرگودھا یونیورسٹی (پاکستان) کے شعبۂ اردو سے بحیثیت مدرس وابستہ ہیں۔ موصوف کا شمار عصرِ حاضر کے چند نام ور ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے گراں قدر مقالے ''فیض کی اقبال فہمی'' میں اردو کے ایک عظیم شاعر کے ذریعہ دوسرے عظیم تر شاعر کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ فیض کی شعری توجہ کا مرکز سب سے پہلے اقبال بنے۔ فیض کی نظم ''اقبال'' ان کے زمانۂ طالب علمی (کالج) کی ہے جب فیض کے اندر شاعری کے جراثیم نئے نئے پروان چڑھنے شروع ہوئے تھے۔ نظم کے مصرعوں سے فیض کی اقبال کے تئیں حد درجہ عقیدت و احترام کا کھل کر اظہار ہوتا ہے۔ بعدہٗ فیض نے اقبال کی رحلت پر بھی ایک زبردست نظم لکھی جس میں اقبال کو ایک خوش نوا فقیر سے تشبیہ دی گئی ہے جو اپنی غزل سنا کر رخصت ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کے گیت، اس کی غزلیں سب کے دلوں میں مقیم ہیں۔ اقبال سے فیض کی عقیدت کا اظہار منظوم خراجِ عقیدت اور بعض مضامین کے علاوہ کلامِ اقبال کے ترجمے کی صورت میں بھی ہوا ہے۔

پروفیسر توقیر احمد خان دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مدرس ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''علی سردار جعفری پر اقبال کے اثرات'' ہے۔ علی سردار جعفری اہلِ علم اور اہلِ نظر تھے۔ اقبال فہمی کے لیے جس بالغ نظری کا ہونا لازمی ہے، علی سردار جعفری اس کے حامل تھے۔ جو پہاڑ میں ٹکر مارے گا وہ اپنا ہی سر پھوڑے گا کے مصداق اکثر مارکسی نقادوں نے اقبال سے متعصبانہ رویہ برقرار رکھا اگرچہ اس سے اقبال کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ علی سردار جعفری نے اقبال پر بے لاگ اور بے دریغ اظہارِ خیال کیا۔ ''قدر گوہر شاہ داند یا بہ داند جوہری'' اور علی سردار

Guess you like
25
of 428

60.2KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

جعفری جیسے جوہری نے اقبال کی فکر میں چھپے جوہر کی شناخت کرلی تھی۔ان کی کتاب ''اقبال شناسی'' تین ابواب پر مشتمل ہے۔اوّل ''شاعرِ مشرق''، دوم ''اقبال اور فرنگی'' اور سوم ''اقبال کا تصورِ وقت''۔ان تینوں ادق اور مشکل موضوعات پر ''اقبال شناسی'' کی اشاعت تک کسی نے بھی خامہ فرسائی نہیں کی تھی۔ بعد میں اگرچہ ان موضوعات پر مختلف نقادوں نے قلم اٹھایا لیکن جتنی گہرائی و گیرائی علی سردار جعفری کی تحریر میں موجود ہے، دوسری جگہ کم ہی ملے گی۔

ڈاکٹر زین رامش دنوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ (جھارکھنڈ) کے شعبۂ اردو سے میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ان کے مقالہ کا عنوان ''بحیثیت محبِ وطن اقبال کا انفراد و اختصاص'' ہے، جس میں انھوں نے اقبال کی شاعری میں نظریۂ حب الوطنی کی انفرادیت اور خصوصیت کو پیش کیا ہے۔اپنی ابتدائی شاعری میں اقبال ایک زبردست محبِ وطن کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔''ہمالہ''، ''صدائے درد''، ''تصویرِ درد''، ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت''، ''ترانۂ ہندی''، ''نیا شوالہ'' جیسی نظمیں مادرِ وطن کو بہترین خراجِ عقیدت و الفت ہے۔''تصویرِ درد'' کا شمار اگر اقبال کی پرشکوہ نظموں میں کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔فاضل مقالہ نگار نے اخیر میں اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اقبال کی حب الوطنی میں ایک بڑا ہاتھ ان کے والدین کی تربیت کا بھی تھا۔

ڈاکٹر محمد نعمان خان شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ان کے مقالہ کا عنوان ''علامہ اقبال کے افکار پر جرمن اثرات'' ہے۔یوں تو سفرِ یورپ کے دوران اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اقبال پہلے برطانیہ پہنچے اور اس کے بعد پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی کی میونخ یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر اقبال کے فلسفے میں آخرالذکر ملک کے مفکروں کا اثر غالب ملتا ہے۔جرمنی میں قیام کے دوران وہاں کے نام ور فلسفیوں گوئٹے، نیٹشے اور برگسن کے افکار اقبال پر بطورِ خاص مرتب ہوئے۔اس لیے یہ ایک فطری بات ہے کہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات میں بعض جرمن فلسفوں کی تعبیرات و اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔خصوصی طور پر نیٹشے کے ساتھ اقبال کہیں متفق ہوتے ہیں اور کہیں دونوں کے افکار میں تصادم ہوتا نظر آتا ہے۔

Guess you like
26
of 428

116KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد شعبۂ اردو، ستیہ وتی کالج، دہلی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ موصوف کے مقالہ ''اقبال اور کالی داس کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی'' میں اردو اور سنسکرت کے ان دو عظیم شعرا کی شاعری میں مطالعۂ قدرت کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اقبال اور کالی داس کی شاعری میں سب سے قبل ہمالہ کے مشترکہ موضوع سے بحث کی ہے۔ اقبال نے جہاں اپنی نظم ''ہمالہ'' میں اس پہاڑ کو خدا کی تجلی اور ملک ہندوستان کا فصیل یا محافظ قرار دیا ہے وہیں ''شکنتلا'' میں کالی داس کے نزدیک ہمالہ ایک پربت کے علاوہ دیوتا کی حیثیت بھی رکھتا ہے بلکہ اسے دھرتی میں موجود سورگ لوک بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقبال کی نظم ''ابر کوہسار'' اور کالی داس کی ''میگھ دوتم'' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ موسم بہار کی قصیدہ خوانی بھی اقبال و کالی داس کے یہاں مشترکہ موضوع ہے۔

محمد افتخار شفیع ساہیوال گورنمنٹ کالج، پاکستان کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''علامہ اقبال اور مسلم فلسطین کی گم شدہ میراث'' ہے۔ اس مقالے کا مرکزی خیال فلسطین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے اور معصوم فلسطینیوں پر مظالم کے تئیں اقبال کی دردمندی، ان کی شاعری میں اس کا اظہار نیز اقبال کا دورۂ فلسطین ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے اقبال اور فلسطین کے اصل موضوع پر آنے سے قبل مسئلہ فلسطین پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔ اس تفصیل میں فلسطین کے جغرافیائی و تاریخی حالات نیز اس خطے کی مذہبی اہمیت بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے مغربی استعماری طاقتوں کے ذریعہ فلسطینی سرزمین پر ناجائز قبضے کے بعد اسرائیل کے قیام اور یہودیوں کی بازآبادکاری کا بھی خلاصہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، ضلع آرہ (بہار) کے شعبۂ اردو میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''اقبال اور تصوف'' ہے۔ اردو اور فارسی کے عظیم شاعروں میں اقبال بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری پر بھی بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے اور آئندہ بھی کی جائے گی۔ ان کی شاعری کے مختلف شیڈس میں سے ایک تصوف بھی ہے۔ ہر چند ان کی شاعری میں ایسی باتیں بعض جگہوں میں ملتی ہیں کہ اقبال اپنے عہد کے صوفی اور خانقاہی نظام سے خاصے

27
of 428

116KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ہے زار تھے لیکن اس کے برعکس ان کے خطوط اور دوسری نثری تحریروں کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ وہ تعلیمات تصوف کے حامی بھی تھے اور منکر بھی۔ اس لیے فاضل مقالہ نگار نے اقبال کو تصوف کے سلسلہ میں کنفیوزڈ یعنی پس وپیش میں مبتلا قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد منصور عالم مولانا آزاد کالج، کلکتہ کے سابق صدر، شعبۂ فارسی اور سابق ممبر، مغربی بنگال پبلک سروس کمیشن ہیں۔ ان کے مضمون کا عنوان ''اقبال اور ٹیپو سلطان'' ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے سلطان ٹیپو شہید کو اپنے عہد کا ایک روشن خیال و بلند پایہ ناظم اور دور اندیش وسیکولر انسان قرار دیا ہے جس نے اپنی غیر معمولی ذہانت، اور بے مثال شجاعت کی بدولت طاقت ور انگریزی فوج سے لوہا لیا اور اپنے مادر وطن کو انگریزوں کے منحوس قدموں سے پاک رکھنے میں کوئی بھی کسر نہیں رکھ چھوڑی۔ یہی وجہ ہے کہ آبروئے ہند سلطان ٹیپو کو شیر میسور کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے مرد کامل اور ٹیپو سلطان میں بہت سی قدریں مشترک ہیں یہی وجہ ہے کہ ٹیپو سلطان شہید نے ڈاکٹر محمد اقبال کو کافی متاثر کیا تھا۔ المختصر سلطان ٹیپو شہید جسے ہندوستانیوں نے فراموش کر دیا تھا اقبال نے اسے ایک بار پھر اپنے اشعار کے ذریعہ زندہ جاوید کر دیا۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کھوپولی ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر) میں واقع کے ایم سی کالج کے شعبۂ ہندی کی صدر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالے کا موضوع ''اقبال کی شاعری میں دیش بھگتی'' ہے۔ اردو کا ایک عام قاری بھی یہ بات جانتا ہے کہ اقبال کی شاعری کثیر الابعاد ہے اور حب الوطنی اس کا ایک اہم بُعد ہے۔ دراصل حب الوطنی اس دور میں ایک فطری چیز تھی جب اقبال کی ولادت ہوئی اور وہ سن شعور کو پہنچے۔ ایسے میں وطن کو غلامی کے طوق سے آزاد کرانے کے جذبے کے تحت حب الوطنی اور اصلاح قوم کی فکر اقبال کو بھی دامن گیر ہوئی۔ اقبال کے یہاں بھی وطن سے محبت کے یہ ترانے جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ حب الوطنی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دیش بھگتی کے موضوع پر ایسے گیت، نظم اور شعر لکھے جو لافانی ہو گئے ہیں۔

شاہ نواز قریشی روزنامہ ''صحافت'' لکھنؤ سے بحیثیت میگزین ایڈیٹر وابستہ ہیں۔ 'ان کے مقالے کا عنوان' علامہ اقبال اور ہمارے ادبی رویے'' ہے۔ جہاں تک اقبال کی

28
of 428

65.7KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

شاعری کا تعلق ہے، اس کے حوالے سے ہمارے ادبی رویے بڑے ستم ظریفانہ ہیں۔ ایک حلقے نے انہیں صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھ لیا۔ انہیں اسلامی شاعر مفکر کا درجہ دے دیا گیا حالاں کہ انہوں نے رام چندر اور گرونانک جیسی مذہبی ہستیوں پر باقاعدہ نظمیں کہیں اور گوتم بدھ کا بھی ذکر کیا۔ دوسری جانب ترقی پسندوں نے انہیں تقریباً اشتراکی سمجھ لیا۔ بعض افراد نے اقبال کی زبان دانی پر سوال کھڑے کیے۔ مگر مقالہ نگار کہتا ہے کہ زبان داں جہاں تھے، وہیں رہ گئے اور اقبال کی اہمیت کو ایک عالم نے تسلیم کیا۔ اس طرح وہ عالمی شہرت و مقبولیت کے حامل شاعر کی حیثیت سے ادب کی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ بن گئے۔

ڈاکٹر دبیر احمد شعبۂ اردو مولانا آزاد کالج، کلکتہ میں صدر شعبہ اور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال کی شاعری میں فلسفۂ خودی کا تصور'' ہے۔ اقبال کا اس بات پر ایقان ہے کہ خودی ایک ایسی چیز ہے جس کا تصور یقیناً اللہ کے رسول نے نہ صرف پیش کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے۔ اقبال کا فلسفہ حیات خودی ہے جو ان کی شاعری اور فکر و نظر کا محور ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال اپنی شاعری میں خودی کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کرتے جسے تکبر یا غرور کا نام دیا جا سکے بلکہ خودی کا مفہوم غیرت مند کا ہے جس سے انسان اپنی دنیا آپ پیدا کر سکے۔ اقبال کی نگاہ میں خودی سچے مومن کی شان ہے۔ مسلمان اپنے گفتار اور کردار کی وجہ سے شناخت رکھتے ہیں، اس لیے غضاری، قدوسی اور جبروت ایسے عناصر ہیں جن کے مجموعہ کا نام مسلمان ہے۔

ڈاکٹر محمد شکیل اختر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں جامعہ کمیونٹی ریڈیو میں پروڈیوسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''ریڈیائی تحریروں میں فکر اقبال کی عکاسی'' ہے۔ مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبال نے پہلی جنوری 1938ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ریڈیو ٹاک پڑھا تھا۔ 21 اپریل 1938ء کو مرزا محمد سعید کی ایک ٹاک بعنوان ''اقبال'' کا نشریہ ہوا۔ اس طرح 1936ء سے 1938ء کے درمیان اقبال کی ایک ٹاک اور اقبال پر ایک ٹاک نشر ہوئیں۔ اقبال پر ریڈیو ٹاک اور مباحثے کا باضابطہ سلسلہ 1940ء میں شروع ہوا۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نے 21 اپریل 1976ء کو شمیم حنفی کا تحریر کردہ فیچر ''کارِ جہاں دراز ہے'' نشر کیا۔ الغرض اقبال پر ریڈیو ٹاک اور دیگر نشریوں کا سلسلہ جو تقریباً 8 دہائیوں

Guess you like

29
of 428

62.1KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

قبل شروع ہوا تھا، آج بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام گورنمنٹ کالج، ملتان (پاکستان) کے صدر، شعبۂ اردو ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی مراسلت'' ہے۔ اردو کے بیسیوں ادبا و شعرا کے مکاتیب کی اشاعت ہو چکی ہے۔ ان میں ایک اہم نام اقبال کا بھی ہے۔ ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ''اقبال بنام شاد'' بھی ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد آصف جاہی حکومت کے وزیر اعظم تھے۔ وہ کم و بیش گیارہ سال اس عہدے پر فائز رہے۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر اور ممتاز نثر نگار بھی تھے۔ شادؔ تخلص کرتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی پہلی ملاقات مارچ 1910ء میں ہوئی۔ باہمی خطوط کا آغاز یکم اکتوبر 1913ء سے ہوتا ہے جو 1926ء تک جاری رہتا ہے۔ اس طرح یہ مجموعہ مکاتیب اولین مجموعہ ہائے مکاتیب میں نہ صرف ادبی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اقبال شناسی کی روایت میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد شعبۂ اردو، سینٹ اسٹیفنس کالج، دہلی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''جواب شکوہ' کا موضوعاتی مطالعہ'' ہے۔ ایک دانش ور مفکر کے طور پر علامہ اقبال کے دل میں اپنے اشرف ہونے کا احساس بیدار تھا۔ یہی احساس اقبال کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ کسی دوسری مخلوق کی مدد لیے بغیر خود براہِ راست خالق کائنات سے گفتگو کریں۔ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہے، اس لیے اقبال ان قربتوں کے باعث اپنے اندر یہ حوصلہ پاتے ہیں کہ اگر کسی بات کا شکوہ کرنا ہے، کسی کمی کی طرف متوجہ کرنا ہے تو اللہ کی ذات سے براہ راست ہم کلام ہونا چاہیے۔ اشاروں، علامتوں اور مختلف شعری لوازمات سے آراستہ اقبال کی نظمیں موضوع اور فن دونوں اعتبار سے اردو ادب میں اضافے کا باعث ہیں۔ ''جواب شکوہ'' میں بھی مذکورہ بالا خصوصیات کارفرما ہے۔

ڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''مغربی افکار و تصور اور اقبال'' ہے۔ اقبال کو شاعرِ مشرق کہا جاتا ہے کیوں کہ ان کی نظر مشرق اور مشرق والوں کے مسائل پر زیادہ تھی مگر ایسا قطعی نہیں تھا کہ

Guess you like
30
of 428

90.3KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

وہ مغرب کی بلند پروازی سے بے بہرہ تھے۔ وہ مغرب کی ترقی سے مرعوب نہیں تھے بلکہ چاہتے تھے کہ مثبت مغربی اقدار کو اپناتے ہوئے مغربی اقوام کی اندھا دھند تقلید نہیں کی جائے۔ بالفاظِ دیگر علامہ اقبال کچھ مغربی مفکرین سے حد درجہ متاثر تھے لیکن مغربی تمدن سے مطمئن نہ تھے۔ وہ مغرب میں سائنس اور علوم کے ترقی کے قائل ضرور تھے لیکن مغربی تہذیب کے حامی نہ تھے۔ اس معاملے میں اقبال نے بعض مغربی افکار کو رد کیا، بعض کو معمولی ترمیم کے ساتھ قبول کیا، بعض سے متفق ہوئے، بعض کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی فکر قائم کی اور بعض مغربی نظریوں کو دراصل مشرقی قرار دیا۔

ڈاکٹر محمد کاظم دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے ''فنونِ لطیفہ اور اقبال'' میں اقبال کی فکر و فن کے ایک نئے در کو وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فنونِ لطیفہ یعنی Fine Arts انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس بات کو اقبال بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اچھا ہنر وہی ہوتا ہے جس سے قوم و ملت کے قلوب استوار ہوں اور جو قوموں کا رخ انحطاط سے عروج کی طرف موڑ دے۔ انسان کے دلوں میں مثبت حرکت پیدا کرے نہ کہ صرف تفریح فراہم کرے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے اقبال کی باقاعدہ ایک نظم ''فنونِ لطیفہ'' موجود ہے جس میں انھوں نے فنونِ لطیفہ کو صرف تفریح و تسلی کے لیے استعمال کرنے کو غلط مانا ہے۔ وہ فن سے انسانی خودی اور اس کی شخصیت کی تعمیر کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مظاہر و مناظر میں مقید رہنے کے بجائے فنونِ لطیفہ کو دلوں تک پہنچنے کا راستہ بنانا چاہیے۔ شاعری، موسیقی، رقص و سرود، مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ فن فنونِ لطیفہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں موسیقی کا درجہ غالباً فنونِ لطیفہ میں سب سے افضل ہے۔

ڈاکٹر عطیہ رئیس دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ کتاب میں شامل ان کے مقالے کا عنوان ''بانگ درا'' کی نظمیں: ایک تاثر'' ہے۔ ''بانگِ درا'' اقبال کا اولین اردو مجموعۂ کلام ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ستمبر 1924ء میں ہوئی تھی۔ اس مجموعے میں نظمیں، غزلیں، رباعیاں اور ظریفانہ کلام شامل ہیں جنھیں زمانی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ جو 1900ء سے 1905ء تک کے کلام پر مشتمل ہے، اقبال کے ابتدائی کلام سے

Guess you like

31
of 428

90.3KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں 49 نظمیں اور محض 13 غزلیں ہیں۔ حصہ دوم جو 1905ء سے 1908ء تک کی شاعری پر محیط ہے، اس میں 24 نظمیں اور 7 غزلیں ہیں۔ تیسرے حصے میں 1908ء کے بعد کا کلام شامل ہے۔ اس حصے میں کل 70 نظمیں اور 8 غزلیں شامل ہیں۔ آخر میں کچھ ظریفانہ کلام ہے۔ الغرض ڈاکٹر عطیہ رئیس نے اقبال کے اس اولین اور اہم مجموعۂ کلام کی نظموں کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر احمد امتیاز اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال کی متصوفانہ فکر پر ایک نظر'' ہے۔ تصوف ایک وسیع موضوع ہے جو روحانی اور قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۂ نفس کا درس دیتا ہے۔ یہ تصوف ہی ہے جس نے عشقِ الٰہی کے جذبے کو عام کیا اور قربِ الٰہی کے سینکڑوں طریقے سکھائے۔ حالاں کہ فارسی کے مقابلے اردو میں ایسے معدودے چند ہی شعرا ہیں جو عملاً صوفی بھی تھے ورنہ بیش تر شعرا نے تصوف اور اس کے مضمرات کو محض شعری روایت کے طور پر ہی اپنے یہاں جگہ دی۔ اقبال نے بھی اپنی شاعری میں تصوف کے موضوعات کو بحث کا موضوع بنایا ہے اور اس کی اصطلاحات سے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ انہیں تصوف کے موضوعات سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔

ڈاکٹر عمر غزالی بنگلی محسن کالج ضلع بنگلی (مغربی بنگال) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''تفہیمِ اقبال: ایک مطالعہ'' ہے۔ کلامِ اقبال کے باضابطہ شارحین میں رشید الزماں، نشتر جالندھری اور عبدالرشید فاضل جعفری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں اور کلامِ اقبال کے دو بڑے اہم شارح یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر ہیں۔ یوسف سلیم چشتی نے اقبال کی بہت ساری شرحیں لکھی ہیں لیکن ان کی شناخت صرف ایک شارح کی ہے جب کہ غلام رسول مہر صرف ایک شارح ہی نہیں بلکہ ادیب و ناقد اور محقق بھی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے چند دیگر نقادوں کی نگارشات میں بھی اسی طرز کی شرحوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ کلامِ اقبال کے ان شارحین میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، کلیم الدین احمد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عبدالمغنی، سید عابد علی عابد، مولانا صلاح الدین احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تفہیمِ اقبال کا یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے اور آگے بھی قائم رہے گا۔

32
of 428

46.6KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ڈاکٹر سرفراز جاوید ریسرچ اسسٹنٹ، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی ہیں۔ ان کے مقالے کا موضوع ''اقبال اور تعمیر کن فکاں'' ہے۔ کلام اقبال میں کہیں افکار کا امڈتا سیلاب ملتا ہے تو کہیں جذبات و احساسات کے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس کے فکر و پیغام کی پنہائی بھی وسعت طلب ہے۔ اس کو گرفت میں لانا سعی مشکل ہے۔ اقبال کے بعض مرکزی خیال ان کے اشعار میں نقطۂ پرکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے اشعار بکھرے ہوئے خیال پاروں کی طرح قاری میں اضطرابی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ کہ اس مفہوم کو فکر اقبال کا سرنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

علی احمد اوریسی شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''اقبال کی شخصیت عطیہ فیضی کے خط کی روشنی میں ہے۔'' علامہ اقبال نے 1910ء میں حیدر آباد کے سفر کے بعد عطیہ فیضی کو جو خط انگریزی میں لکھا تھا، اس کی روشنی میں اقبال خود کے متعلق رقم طراز ہیں کہ وہ ایک سیدھی سادی، دیانت دارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی فکر اور گفتار میں فرق نہیں ہے۔ شہرت، عزت اور ستائش حاصل کرنے کے لیے اگر انھیں کسی کی منافقت کرنی پڑے تو اس سے بہتر گم نامی اور کس مپرسی کی حالت میں مرنا زیادہ پسند کریں گے۔ عوام کی تعریف حاصل کرنے کے لیے ان کی رسوم و روایات کے سامنے سر جھکانے سے وہ بالکل قاصر ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ قوت شعری کے اعتبار سے وہ بائرن، گوئٹے، شیلی سے کم تر ہو سکتے ہیں لیکن اس اعتبار سے ان کی ہم سری بھی کرتے ہیں کہ ان قلم کاروں کے معاصرین کی طرح اقبال کے معاصرین بھی ان کی عزت نہیں کرتے۔ الغرض اقبال کے اس خط سے ان جذبات و احساسات کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے۔

مولانا ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی (علیگ) کا تعلق کولکاتا سے ہے۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی گورننگ باڈی کے رکن ہیں اور عرصۂ دراز سے اخباروں میں دینی کالم تحریر کرتے آئے ہیں۔ شہر کی ملی، علمی و سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال، بنگال اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی'' ہے جس میں موصوف نے مغربی بنگال اور کولکاتا میں اقبال کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے متعلق مدلل پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے کبھی بنگال کا سفر نہیں کیا مگر ان کی شاعری ساکنان بنگالہ کے دلوں پر حکمرانی

Guess you like
33
of 428

71.5KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

کرتی ہے، جس کا بین ثبوت مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام سہ روزہ ''جشن اقبال'' تقریبات کا انعقاد ہے۔

ڈاکٹر افسانہ حیات دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پوسٹ ڈاکٹرل فیلو ہیں۔ ان کے مقالے کا عنوان ''اقبال کا تصورِ حیات'' ہے۔ کسی بھی فن کا تعلق حیاتِ انسانی سے راست اور عمیق ہوتا ہے اور یہ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی اور فن دونوں ہامقصد تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ وہ شاعری پر طبع آزمائی محض وقت گزاری کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ شاعری ان کے نزدیک ایک ایسا حیات بخش عمل ہے جس کی نمود خونِ جگر کا متقاضی ہے۔ ان کے تصورِ حیات کے دو اہم دائرے ہیں خودی اور عشق۔ خودی کی تربیت تین مراحل سے ہو کر گزرتی ہے۔ اول اطاعت، دوم ضبطِ نفس، سوم نیابت الٰہی۔ اقبال خودی کو زندگی کی ابتدا اور عشق کو انتہا تصور کرتے ہیں۔

ظفر اقبال یو این آئی اردو سروس سے وابستہ ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''اقبال کی سیاسی بصیرت'' ہے جس میں مقالہ نگار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال شاعر کے ساتھ فلسفی، مفکر، دانش ور اور سیاست داں بھی تھے نیز انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اپنی شاعری کے ذریعہ انھوں نے غلام قوموں کو نوآبادیت کے خلاف بیدار کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ابتدا اقبال کا سیاسی تصور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے مادرِ وطن کی آزادی اور یہاں کے باشندوں کی مصائب کا بیاں تھا مگر سفرِ یورپ سے واپسی کے بعد ان کا نظریۂ سیاست عالم گیر ہو جاتا ہے اور وہ انسانیت کی سربلندی اور معراج کے لیے متفکر ہو جاتے ہیں۔

ابوالبشر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ کتاب میں شامل ان کے مقالے کا عنوان ''اقبال بحیثیت طنز نگار'' ہے۔ اقبال کی شاعری کا بھی ایک بڑا حصہ طنزیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے مستقل طنزیہ اشعار نہیں کہے لیکن حالات اور مسائل کے پیشِ نظر ان کے کلام میں طنزیہ رنگ خود بخود غالب آ جاتا تھا۔ علامہ اقبال نے معاشرے کی غفلت اور لاپرواہی پر ایک ماہر طبیب کی طرح طنز کے نشتر چلائے ہیں حالاں کہ ان کی تمام شاعری کی طرح ان کا طنزیہ کلام بھی تعمیری مقصد کا حامل ہے۔ طنز نگاری

34
of 428

71.5KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

سے ان کا مقصد کسی کی تنقید، تذلیل، دل آزاری یا ذاتی بغض وعناد نہیں ہے بلکہ ان برائیوں کی نشان دہی ہے جو قوم کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

نوشاد منظر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، دہلی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ ان کے مقالہ ''اقبال کا تصورِ ابلیس'' میں ابلیس یعنی شیطان کے متعلق نظریات وتصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال نے پیغمبروں، صحابیوں، ولیوں، مسلم بادشاہوں اور دیگر مذاہب کے بزرگوں جیسے شری رام چندر، گوتم بدھ اور گرونانک وغیرہ کے علاوہ نپولین، مارکس، لینن اور مسولینی جیسی تاریخ ساز ہستیوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مگر ان سب کے ساتھ ابلیس کے کردار کو بھی بکثرت پیش کیا ہے۔ ابلیس یا شیطان عالمی ادب میں شاعروں ونثر نگاروں کا پسندیدہ کردار رہا ہے۔ اقبال کی پانچ نظموں ''ابلیس کا فرمان، اپنے سیاسی فرزندوں سے''، ''ابلیس کی عرض داشت''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''، ''مکالمہ جبریل وابلیس''، ''تقدیر'' (ابلیس و یزداں) میں ابلیس مرکزی کردار ہے۔ ان کے علاوہ اقبال کے متعدد اشعار ہیں جن میں 'ابلیس' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان نظموں کے گرد ہی پورا مقالہ گردش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سنگھا مترا باسو نیشنل مشن فار مینوسکرپٹ، نئی دہلی میں ریسرچ اور پبلی کیشن کوآرڈی نیٹر ہیں۔ ان کا مقالہ انگریزی میں ہے جسے کولکاتا سے تعلق رکھنے والے جواں سال نقاد شاہد اقبال نے سلیس اور رواں اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس ترجمہ شدہ مقالہ کا عنوان ''اقبال اور ٹیگور: ایک مشترکہ ثقافتی ورثہ'' ہے جس میں برصغیر کے ان دو عظیم اور ہم عصر شعرا کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ان کی حب الوطنی، تصورِ فطرت اور فلسفیانہ افکار میں مشترکہ قدروں کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے نیز یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں شعرا کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے احترام وعقیدت کے جذبات واضح طور پر موجود تھے۔

اخیر میں امید کرتا ہوں کہ اپنے گراں قدر مشمولات کی بنیاد پر زیرِ نظر کتاب اقبال فہمی کے معیار پر کھرا اترے گی اور اقبال کے شائقین اور محبانِ اردو اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

❖❖❖

Guess you like
35
of 428

69.1KB/s 6:26 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

پروفیسر عبدالحق (نئی دہلی)

اقبال اور آرزوئے انقلاب

ہم اقبال کی شاعری کو ہندی نغمہ کہیں یا حجازی لے سے تعبیر کریں مگر اس کے آہنگ میں انقلابی روح کا اضطراب کچھ اور کہتا ہے۔ وہ فکر وعمل کی کارگہی میں تلاطم خیز تبدیلی کے داعی ہیں۔ خود کو بدلنے اور گرد وپیش کو بدل دینے کا جذبہ ہی ان کی فکر کی اساس ہے۔ خودی کا یہی منشور ومقصود ہے کہ پورے وجود کو تغیر آشنا کیا جائے۔ صبح وشام کی طرح مقدرات بھی تبدیلی کے لیے مجبور ہوں۔ یہ زندہ افراد اور اقوام کی علامت ہے۔ تغیر کی خواہش ہی فکر وعمل کو جواں رکھتی ہے۔ اقبال کے فلسفہ وفکر کا یہ اجتہادی نقطہ ہے جسے وہ مختلف مثالوں سے مربوط کرتے ہیں۔ صحفِ سماوی کے ارشادات، فطرت کے تکوینی اصولوں، تاریخ کے حوالوں اور صبح وشام کے مشاہدات سے وہ تقویت حاصل کرتے ہیں۔ کائنات کے مظاہر کا ہر لمحہ نئے وجود میں نمودار ہونے سے وہ اپنے تصورات کو ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ہر شے رنگِ تغیر سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ یہ خیال

Guess you like

36
of 428

56.3KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ہمارے روز و شب کے اظہار میں محاورہ بن گیا ہے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

دوسرا شعر بھی بیش و کم کے ساتھ اسی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے:

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی [1]

تعمیرِ نو کے لیے پرانی روایات کو فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جانا چاہیے۔ بزمِ کہنہ کو زندہ واردات میں تبدیل کرنا علامہ کو بہت عزیز ہے۔ فرد کی تعمیر یا معاشرہ کی تشکیل میں حائل عناصر سے گریز لازم ہے۔ نئے ساز و سامان فراہم کرنا ہی ترتیبِ نو کا تقاضا ہے۔ حسبِ ذیل شعر اس انقلابی خیال کی تائید کرتا ہے:

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز [2]

پرانی چیزوں سے پرہیز نئی چیزوں کی ایجاد کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اس خواہش یا عمل کی تکمیل کے لیے آرزوئے انقلاب کو گرم رکھنا پڑے گا۔ کیوں کہ افکارِ تازہ کے بغیر جہانِ نو کا وجود و نمود ممکن نہیں ہے۔ وہ کائنات جو پردۂ وجود سے اظہار کی منتظر ہے پہلے فکر کا حاصل بن جائے، تو اسے پانے کی تڑپ تخلیق کے اسباب فراہم کرے گی۔

نئے افکار کے تلاطم سے ہی خاکے خلق ہوتے ہیں اور پھر مرئی صورتوں میں متشکل ہوتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ "تکمیلی صورت کا تصور کم نگہی یا فریبِ نظر ہے۔ کیوں کہ:

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود

یا

جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

یا

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے [3]

Guess you like

37
of 428

86.9KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

فسادِ نظر کے سبب اگر ایسا دکھائی نہ دے تو لازم ہے کہ موجود کو زیر و زبر کر دے۔
ارمغانِ حجاز کی رباعی سے رجوع کیجیے:

دگرگوں عالمِ شام و سحر کر
جہانِ خشک و تر زیر و زبر کر
رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

'بالِ جبریل' کے 'تاتاری کا خواب' میں تضمین کیا ہوا فارسی شعر دوسری دلیل دیتا ہے:

''خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ''

انقلاب سب سے پہلے درونِ دل پیدا ہو۔ یا فکر و خیال میں ہلچل پیدا کرے۔ یہ پہلی صورت یا زاویہ ہوگا۔ تصورات میں تبدیلی پیدا کرنے اور خیال کو مہمیز کرنے کا عمل پہلے وجود میں انگڑائی لے۔ جان و تن سے انقلاب کی شورش کا آغاز ہو۔ اس کے لیے وجود کے آتش کدے کو روشن کرنا پڑے گا۔ علامہ نے بارہا اعلان کیا ہے کہ سینے میں جامِ آتشیں چراغاں ہے۔ اسی سے نوائے شوق کی پرورش ہوتی ہے۔ یہی اندر کی آگ شرر کو شعلہ بننے کے لیے بے تاب کرتی ہے وہ اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا اسلوب پیدا کرتی ہے۔ آگ و آتش کا استعمال علامہ اقبال نے کثرت سے کیا ہے۔ ان کی انقلابی فکر میں یہ علامت و استعارے بہت ہی معنی خیز ہیں۔ انھوں نے جس جرأت و جسارت کا اظہار کیا ہے وہ فکر و شعر کی دنیا میں ناپید ہے۔ ابھی تک یہ آواز نہیں سنی گئی تھی:

مرے گلو میں ہے ایک نغمہ جبریل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لیے [4]

یہی نوائے شوق ہے جس سے حریمِ ذات و صفات میں شور برپا ہے کعبہ و سومنات میں

Guess you like
38
of 428

86.9KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

فسوں طاری ہے۔حور وفرشتہ زیر کمند ہیں۔یہ آوازیں اوران کے یہ احساسات ہمارے یقین وثبات میں شامل ہو چکے ہیں۔اقبال نے خوابیدہ یا نیم مردہ دلوں میں خونِ گرم رواں کر کے جینے کے اسرار اسکھائے ہیں:

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

یا

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاع او گراں شد
ہجوے بودرہ گم کردہ دردشت
ز آوازِ درایم کارواں شد [5]

یا

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت

یعنی ایشیا کی راکھ میں بجھی ہوئی آگ کو شعلے کی لپک میں نے بخشی ہے۔اس قول کی روشنی میں چشم دل وا کر کے موجودہ منظر نامے کو ملاحظہ فرمائیں تو اضطراب کا ادراک ہو سکے گا۔ ان کا یہ احساس غلط نہ ہوگا:

برقہا خوابیدہ در جانِ من است
(میرا بدن بجلیوں کی خواب گاہ ہے)

بہ ظاہر تنِ خاکی اس کا مسکن ہے مگر یہ معاشرے کی تمام وسعتوں پر محیط ہے۔اقبال کا پیام اولیں یہی انقلابی روح ہے۔جو مزاحم قوتوں کو شکست دیتی ہوئی افلاک کی عظمتوں سے ہم کنار اور دامن یزداں سے دادخواہ ہوتی ہے:

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

یہ انقلاب جب انگڑائیاں لیتا ہے تو عالم افلاک زیر زمیں اور یہ کرۂ زمیں بالائے

39
of 428

43.5KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آسمان نظر آتا ہے۔ یہ انگڑائی مرد کار کی تاب کا رقوتوں کی منتظر ہوتی ہے۔ ان کے افکار کی دنیا رجز خوانی اور رزم ناے سے آباد ہے۔ اس بستی میں بساط زندگی کے ہر لمحہ کو بدل دینے کا عزم برق ورعد بن کر دلوں کو کرگزرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ یہی حوصلہ قوموں کی تقدیر کے احوال رقم کرتا ہے۔

یہ ہماری لسانی وثقافتی ثروت کا اعجاز ہے کہ اقبال کے یہ تصورات آفاقی اور عالم گیر تہذیب کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ گزشتہ صدی نے ان کے تذکرے اور تصورات پر تنقید وتحقیق کا جو ذخیرہ فراہم کیا وہ کسی مفکر، شاعر، مصلح یا کسی شعبۂ حیات کے رہ رو فرزانہ کی پیشانی پر نہ لکھا جا سکا۔ کوئی دوسرا موضوع سخن بھی سبقت حاصل نہ کر سکا۔ تہذیب مادی اور روحانی فتوحات کے ساتھ دین ودانش کی عظیم یافت کے عناصر سے مربوط ہوتی ہے ہم اقبال کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے فکر وشعر کی بے نظیر سعادتوں سے ہمیں شرف یاب کیا ہے۔ عالمی ادب میں یہ مثال نایاب ہے کہ کسی فلسفی نے اپنے امتیازی نظریہ کو سخن وری کی زبان دی ہو یا عظیم تخلیق کار نے شعری لسان میں فلسفہ بیان کیا ہو۔ گویا فکر وجذبے کا یہ حسین امتزاج اقبال کے سوا نایاب ہے۔

اقبال اور خودی جذب باہمی کا نام ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خودی کے ساتھ اقبال یاد آتے ہیں اور اقبال کا نام لیجیے تو خودی مرئی پیکر میں نمودار ہوتی ہے۔ خودی اپنے وجود کی عظمتوں کا شعوری احساس ہے جو ہر ذرۂ کائنات کو تڑپنے پھڑکنے کی توفیق بخشتا ہے، اسی سے ہنگامۂ ہستی میں اضطراب اور کون ومکاں کی بے کراں پنہائیوں میں نمود پیہم ہے۔ خودی طوفاں بدوش ہے۔ اس میں ریگِ رواں کے ساتھ سنگِ نشاں بھی ہم دوش ہے۔ یہ بے کراں قوتوں کا مصدر اور سمندر ہے جو اک بوند پانی میں بند ہے۔ یہ راہ میں حائل مزاحم قوتوں سے ہر لمحہ نبرد آزما رہتی ہے۔ زمین کے فتنہ وفسوں ہوں یا اندیشہ ہائے افلاکی، اس کے روبرو سب خاک برابر ہیں۔ یہی احساس ویقین اقبال کی انقلابی فکر کے نقطۂ آغاز کا دوسرا زاویہ ہے جو وجود کے باطن اور بیرون میں موجود تمام

Guess you like
40
of 428

84.4KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لیے نسخۂ شفا ہے۔

شدتِ احساس کو اقبال نے شعورِ خویشتن یعنی اپنی ذات کی برتائی کا اقرار کہا ہے۔ احساس کی رفعتوں کے اظہار یا روبہ عمل لانے میں تخریبی طاقتوں کے خلاف احتجاج مشروط ہے۔ یہ تیسری منزل ہے۔

احتجاج کے موثرات معدوم یا بے اثر نظر آئیں تو انقلابی روح کی بے داری کا اعلانیہ واجب ہوتا ہے۔ جس میں ہر جبروتی طاقت اور اسکندر و چنگیز کے نشۂ قوت کے خاتمے کے لیے صف بستہ ہونا پڑتا ہے۔ سارے جہاں سے اچھا کو صرف قومی ترانہ سمجھ لینا کم فہمی ہوگی۔ سب سے اونچا ہم سایہ آسماں ہزاروں ندیوں کی عظمت کے ساتھ گلستاں، کارواں کی اجتماعی قوت اور اس کی پسپائی کا احساس دردِ نہاں بن جاتا ہے۔ غیر ملکی حکومت کی غلامی کا یہ احساس سوزِ دروں کی صدائے دردناک بھی ہے۔ معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا۔

اسی سال یعنی 1904ء میں ہی تخلیق پانے والی دوسری بے حد اہم نظم 'تصویرِ درد' ہے۔ ترانے کا دردِ نہاں شدتِ احساس کے ساتھ برملا اظہار میں بدل جاتا ہے۔ آگہی میں احتجاج کی لے تیز تر ہو جاتی ہے:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!

.....

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

.....

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

مغربی اقتدار کی غلامی اور نافذ کردہ دستور زباں بندی کے خلاف احتجاج کی یہ پہلی آواز تھی، جس میں لائحہ عمل بھی مرتب کیا گیا ہے۔ راہِ عمل پر گام زن ہونے کو آئینِ فطرت کہہ کر اقبال نے ایک بہت اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ گویا آزادی کے لیے کفن بردوش ہونا اور اقتدار سے نبرد آزمائی کرنا پہلا انقلابی مطالبہ ہے۔ تحریکِ آزادی کے کسی قائد کی زبان یا خیال میں اس احتجاجی آواز کی مثال نہیں ملتی خواہ وہ نہرو ہوں یا گاندھی۔

Guess you like

41
of 428

84.4KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

تین سال بعد 1907ء میں سرزمین یورپ میں اس آواز کی تندی و تلخی میں کہیں زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اقبال کی بے مثال جرأتِ اظہار ہے کہ وہ یورپ کی تہذیب کو چیلنج کر رہے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

مغربی جبر کے خلاف ابھی تک آزادی کے کسی علم بردار کو اس جرأت کا حوصلہ نہ ہو سکا تھا۔ اس سے بڑی باغیانہ آواز سینے انگریزوں کی غلامی میں رہ کر اس بغاوت کے اعلانیہ پر توجہ دیجیے:

مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب

یا

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ

یا

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج

ان سے سخت بات پر بھی توجہ درکار ہے۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا۔ عام طور پر کسی خاص مسئلہ، فہم یا نظام میں تبدیلی کے لیے انقلاب کو آواز دی جاتی ہے۔ کرۂ ارض پر برپا ہونے والی انقلابی صورتوں کی تاریخ یہی کہتی ہے کہ ظلم و تشدد، آزادیٔ ملک و ملت، استحصال و آمریت وغیرہ کے خلاف نعرۂ انقلاب کی پرشور آوازوں کے ہم خوگر اور ان کے نتائج سے بھی باخبر ہیں۔ اقبال نے ان میں نئی جہات کی توسیع اور صورتوں میں اضافے کیے ہیں جو ان کی انفرادی فکر کے حاصل ہیں۔ ان کے انقلابی تصورات کا پہلا مرحلہ اپنے وجود کے باطن سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو ہر انقلاب کا مصدر اور مقدر طے کرتا ہے۔ باطن کے انقلاب کے بغیر بیرونی مظاہر میں تعمیر و تخریب کا امکان نہیں ہوتا۔ وجود کے اندر پیدا ہونے والا خروشِ احساس ہی تمام شورشوں یا سرگرمیوں کو

Guess you like
42
of 428

49.8KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

برق و رعد کی توانائی فراہم کرتا ہے۔ یہی ہر نقشِ کہن کو مٹانے اور کاخ و کو، کو تعمیر کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ انھوں نے مزید وسعت دے کر اسے تکوینی نظام کا تکملہ قرار دیا ہے، وہ ذی روح اور بے جان کی فطرت میں بھی اس عنصر کی موجودگی کا اقرار کرتے ہیں۔ ہر ذی روح کے باطن میں یہ صدا سنی جا سکتی ہے:

که خاک زنده ام در انقلابم

.....

ولیکن این نوائے سادہ کسیت

.....

کسے در سینہ می گوید کہ ہستم [7]

اور غیر ذی روح میں دیکھیے:

تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

اقبال اس حقیقت سے واقف تھے کہ باطن کے انقلاب کے بغیر بیرون میں تبدیلی ممکن نہیں۔ جب دل کے تلاطم میں یہ احساس بے دار ہوتا ہے تو جہانِ کہنہ کو مسمار کر کے اپنے خاک و خوں سے جہانِ تازہ کی تخلیق کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جہانِ مستعار میں جینے کا مزہ نہیں ہے بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنا ہی حیاتِ انسانی کا مقصد ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن مکاں ہے زندگی [8]

اقبال بے حس یا مردہ و افسردہ دلوں سے مخاطب نہیں ہوتے وہ مردِ ناداں کو اپنے کلام کے قریب آنے کی آرزو نہیں کرتے۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والے ہی انھیں عزیز ہیں۔ وہ صرف اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ارض و سما کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کا عزم رکھتے ہیں:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے [9]

Guess you like
43
of 428

82.6KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

یہ موضوع تسلسل اور تواتر کے ساتھ کلام میں اظہار کے مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے جیسے:

اگر خواہی حیات اندر خطر زی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
گفتند جہانِ ما آیا بتو نمی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اس تحریک و تخریب کا بنیادی مقصد تخلیق کائنات اور اس کی آرائش و استواری ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہمیں مامور کیا گیا ہے۔ عظیم مقاصد کے حصول کے لیے انقلابی رہ گزر کی سنگین آزمائشوں کو لبیک کہنا ہوگا۔ بے باک شوقِ شہادت دیکھیے:

باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال نے اپنی اساسی فکر کو خودی سے تعبیر کیا ہے اور یہ بذاتِ خود باطن کے انقلاب کی علامت ہے۔ یہ ایک احساس ہے اور غیر مرئی ہے۔ مگر عمل کی رو سے خارجی پیکر میں نمودار ہوتی رہتی ہے۔ تخلیق سے اس کا وجود آشکار ہوتا ہے۔ یہی اس کی بقائے وجود کا حاصل بھی ہے:

ما زتخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اس کے مٹنے یا معدوم ہونے سے امتوں کی رسوائی مقدر بن جاتی ہے اور اگر موجود ہو تو پہاڑوں کے سینے شگاف کرتی ہوئی تیز جولاں اور زود رس ہوتی ہے۔ بیرون کی تمام بے داری وجود کے اسی شعوری احساس کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں۔ گویا خودی انقلاب آفرینی کا دوسرا نام ہے:

Guess you like
44
of 428

82.6KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آتش است بزمِ عالم بر فروز
دیگراں راہ ہم زسوزخود بسوز

(اپنے چراغ سے دنیا کو روشنی بخش دو اور اپنی آگ سے دوسروں کو بھی جلا دو)

اقبال کے سینے میں انقلاب کا شرر شعلہ بن چکا تھا۔شعری پیرایۂ بیان سے یہاں سروکار ہے۔دوسری تحریروں سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ان کا قول:

شبنم من مثلِ یم طوفاں بدوش

اقبال کو مشرق و مغرب میں عام استحصال اور استبداد کا زمانہ ملا تھا۔بنی نوع بشر کی آبرو پامال کی جا رہی تھی۔اقبال کا سوز دروں محسوس کیجیے:

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے [10]

یہ 1922ء کی بات ہے۔آشوبِ قیامت کا منظر عام ہو چکا تھا:

دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا

کو اقبال نے محسوس کیا اور اپنی فکر کے آہنگ میں شامل کر لیا۔نقطۂ نظر کی تبدیلی میں تاخیر نہ ہونے دی۔اظہار کا پیرایۂ بیان بھی بدل گیا۔

احتجاجی اسالیب میں انقلابی اور باغیانہ للکار کا خطاب محبوب آہنگ بن جاتا ہے۔یہ آوازیں صرف اقبال سے ہی منسوب کی جائیں گی۔اردو کیا ملک کی دیگر زبانوں میں بھی یہ مثالیں موجود نہیں ہیں۔ستیز، رُستاخیز، آتش نفساں خیز، از خواب گراں خیز کے ساتھ بے دار ہو، جاگو، بیا، اٹھو، تیار ہو، چلو، پھونک ڈالو، برہم کر دو، لہو گرم کرو، جلا دو، راکھ کا ڈھیر بنا دو، خونی کفن پہنو، شمشیر و سناں سے لیس ہو، مردانہ وار موت کو قبول کرو، صلۂ شہید حاصل کرو، تقدیرِ یزداں بن جاؤ، کون و مکاں میں ہلچل برپا کرو، جیسے شور انگیز خطابات کہیں اور نہیں ملتے:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر

Guess you like
45
of 428

46.0KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

.....

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

.....

تنے پیدا کن از مشت غبارے

.....

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

.....

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم

اس فکر کی ایک اور جہت قابلِ غور ہے: بے داری کی ان شور انگیز آوازوں کا منظر نامہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے براہِ راست نسبت رکھتا ہے۔ ملک کی غلامی کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کا نعرہ 1940ء سے شروع ہوتا ہے اور تواتر کے ساتھ اس میں شدت بڑھتی جاتی ہے۔ 'مثنوی پس چہ باید کرد' آخری دور کی یادگار ہے۔ اس میں ایک ذیلی عنوان ہے۔ ''اشکے چند بر اقترافِ ہندیاں'' اقبال ملک کے باشندوں کے محسوسات میں ایک طوفاں بدوش تصور بے دار کرتے ہیں کہ قوموں کے اختلاف کا انجام ہلاکت ہے:

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب [11]

اس نظم کے آخری شعر کی معنویت اور پیغام کی نوعیت فکرِ اقبال کی منتہی معلوم ہوتی ہے:

اے جواں دامانِ او محکم بگیر
در غلامی زادۂ آزاد میر

کشتنِ ستم کے لیے شوقِ شہادت کا یہ پیغام آسمانی آواز سے کم نہ تھا۔ زبورِ عجم کی دوسری

Guess you like
46
of 428

77.3KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آواز تھی۔ جس کا تعلق عالمی جنگ کی خوں آشام تاریخ سے ہے۔ اقبال نے پناہ مانگی تھی اور سوادِ اعظم کو شمشیر بکف ہونے کی دعوت دی تھی:

فریاد ز افرنگ دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں ، خوابِ گراں،
خوابِ گراں خیز از خوابِ گراں خیز [12]

انقلابی فکر کا ایک اور اہم زاویہ یہ بھی ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیے جو ان کی فکر کی بنیادوں میں شامل ہے اور بہت ہی شور انگیز ہے جس میں معاش و معشیت غربت و امارت پر اقبال کا ہدف ہے۔ دنیا میں ستم رانیوں کا اندوہ ناک سلسلہ سرمایہ داری سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تمام مظالم کی ماں اور انسانوں کے استحصال کی جڑ ہے مال و معشیت کی ناہم واری نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس عدم مساوات نے تقسیم دولت کو بنائے فساد بنا دیا ہے۔ خواجگی کے خلاف اقبال کا رویہ نفرت و احتجاج کا نہیں باغیانہ ہے۔ مزدور کی حمایت میں وہ ان حدود کو بھی پار کر جاتے ہیں جو حکیم معاش اور ان کے حامیوں سے بھی ممکن نہ ہو سکا۔ ان کی پہلی تصنیف علم الاقتصاد ہے جو 1904ء میں شائع ہوئی۔ پچیس سال کے ایک نوجوان شاعر نے زمین، کاشت کار، ساہوکار، لگان پر ایسی فکر انگیز گفتگو کی ہے جو معاشی نظام پر حکمتِ عملی کا آئین ہے۔ ساتھ ہی ان کی پرسوز دردمندی بھی حیرت خیز ہے۔ چند برس بعد کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار کا احتجاج شروع ہوتا ہے:

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

Guess you like
47
of 428

77.3KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

اقبال کی پہلی تصنیف کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے جن سے ان کی کرب ناک فکر کی ابتدا ہوتی ہے۔ مقدمہ کی عبارت ہے:

''کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والے کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند کو بلا دینے والی افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔'' 13

''پچیس سال کے نوجوان اقبال نے ایک دوسری انقلاب آفریں بات لکھ دی جو آج بھی فلاحی معاشرہ میں موضوع بحث ہے۔ وہ کہتے ہیں کاشت کی پیداوار ہو یا کارخانے کا خام یا تیار کردہ مال دونوں سے حاصل شدہ منافع میں زمین دار یا سرمایہ دار کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ صرف مزدور کا حق ہے۔ محنت کا پھل سرمایہ دار کے لیے حرام ہے۔'' 14

ابھی اقبال نہ اشتراکیت سے روشناس ہوئے تھے اور نہ کارل مارکس کی کتاب ہی پڑھی تھی۔ ان کی فکر میں غریبی اور امیری کے اسباب اور ان کا سد باب ایک بہت ہی اہم مسئلہ رہا ہے، وہ ہر دور میں متفکر رہے۔ 1915ء میں ''اسرار خودی'' شائع ہوئی اس میں ایک باب ہے کہ خودی ہاتھ پھیلانے سے مردہ ہوتی ہے۔ خودی استحصال اور مفلسی سے نفرت رکھتی ہے:

از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گریہ گر نادار تر 15

اردو نظم 'گدائی' کا یہ شعر قابل توجہ ہے:

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا 16

انقلاب روس (1917ء) نے فکر اقبال کے معاشی پہلو کو مہمیز کیا۔ نظم ''خضر راہ'' (1923ء) مزدور و سرمایہ دار کی عبرت ناک کشاکش کا آئینہ ہے۔ یہ نظم اقبال کی احتجاجی

Guess you like
48
of 428

40.3KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آواز کو شورش و سلاسل میں بدل دیتی ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں "پیامِ مشرق" کی نظمیں لکھی گئیں۔ ان میں مزدور کی بدحالی کا دردناک منظر موجود ہے:

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ دردیدۂ او فروغِ نگاہے
نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
خواجہ نانِ بندۂ مزدور برد
آبِ روئے دخترِ مزدور برد
بے بجامش بادہ ونے در سبوست
کاخ ہا تعمیر کردہ خود بکوست [17]

(وہ ریشمی قبائیں تیار کرتا ہے۔ مگر خود پھٹے کپڑے پہننے کے لیے مجبور ہے۔ آنکھیں نور سے خالی ہیں اور سینے میں آرزو نہیں ہے۔ سرمایہ دار مزدور کی روٹی ہی نہیں چھینتا اس کی بیٹی کی آبرو بھی خراب کرتا ہے وہ بھوکا بیکار رہ کر دوسروں کے لیے محلات تعمیر کرتا ہے۔ خود گلی کوچے میں زندگی بسر کرتا ہے)

سرما کی ہواؤں میں عریاں ہے بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالا

ان مشاہدات نے اقبال کو معاشی استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ جو انقلاب کی باغیانہ شورش کا سبب بنتا گیا۔ وہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ جب تک اس نظام کا خاتمہ نہیں ہوتا تب تک دانش و تہذیب و دیں سب سودائے خام ہیں:

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

نابرابری کے اس نظام کو نیست و نابود کرنے کا پیغام اقبال کی شناخت بن گئی۔ تہس نہس کرنے کی بغاوت کو لبیک کہنا انگریزوں کے اقتدار کو للکارنا تھا۔ بڑے سے

Guess you like
49
of 428

48.8KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

بڑے مصلح وسیاسی رہنما کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوسکی۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال کے سینے میں انقلاب کی آگ غضب ناک شعلہ بن چکی تھی۔انگریزی نظام کو اس طرح مخاطب کرنا آسان تھا:

تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تختِ وتاج

یا

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب انقلاب اے انقلاب [18]

اقبال کی انقلابی فکر احتجاج کی راہ سے گزر کر بغاوت کی شورش تک جا پہنچی ہے جہاں ہر شے کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کا جاوداں پیغام ملتا ہے۔یہ بھی نظر میں رہے کہ علامہ کا انقلابی نعرہ صرف ان کے عہد کے جبر وظلم کے خلاف نہ تھا۔بلکہ ہر دور کی جبروتی طاقت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''ضربِ کلیم'' کا ابتدائیہ ''اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف'' ہر عہد کا اعلانیہ ہے۔اقبال ان حدوں سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں مارکس اور لینن کی انقلابی آواز کی رسائی نہ ہوسکی۔ان کے تمام حمایتی مل کر بھی یہ نعرہ نہ دے سکے:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو [19]

یہ شعر ہر انقلابی آواز کا نعرۂ مستانہ بن گیا۔زبانِ خلق پر یہ شعر انقلابی الہام بن کر مشہور ہوا۔اقبال نے اپنے جس جہاں آشوب نغمے کو لامکاں کے لیے سنبھال کر رکھا۔اسے بڑی دردمندی کے ساتھ مظلوم انسانوں کے قافلے میں لٹا دیا۔ان کی انقلاب آفریں آواز تمام انجم شناسوں کو شکست دے کر تاروں کی گردش تیز کر گئی۔پایانِ عمر میں وہ ان

Guess you like
50
of 428

48.8KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آوازوں کے اثرات دیکھ رہے تھے۔مثنوی مسافر کے اشعار میں اقوامِ مشرق کی انقلابی انگڑائی کے نغمۂ نو بہار کی آمد کو اقبال محسوس کرنے لگے تھے:

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید [20]

ایک دوسرا زاویہ بھی پیشِ نگاہ رہے۔ان کی انقلابی فکر میں تباہ وتاراج کرنا مقصد نہیں بلکہ حد درجہ شدتِ خلوص کے ساتھ تعمیر وتشکیل کی آرزو ہے۔اس میں ہر طرح کی جارحیت یا ظلم سے نفرت دلائی گئی ہے۔اس میں تشدد اور تخریب کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ انقلابی پیغام میں ان کا رویہ اخلاص وایثار کا ہے۔معاشرتی نظام کی فلاح وبہبود اس کا ہدف ہے۔فرد کی اصلاح بھی مقصود ہے۔اقبال نے انقلاب کے لیے بڑی مخلصانہ اور عاجزانہ دعائیں مانگیں اور خاص طور پر نوجوانوں کے لیے۔اقبال کے انقلابی پیغام کے پہلے مخاطب یہی جواں سال ہیں جن سے اقبال کو ساری توقعات ہیں۔اس پیغام کے علم بردار اور کارآفریں وکارساز یہی نسل ہے جس نے ہمیشہ انقلاب کو لبیک کہا ہے اور بے خوف وخطر قبول کیا ہے۔علامہ نے انھیں کے لیے تڑپنے پھڑکنے کی توفیق طلب کی ہے۔ان کے خلوص کی انتہا دیکھیے کہ وہ آرزوئے انقلاب کی سرمستی سے سرشار ہیں۔ آرزوؤں کو روبہ عمل لانے کے سرگرم کار ہیں تاکہ جہانِ تازہ کی تعمیر اور نوعِ بشر کے لیے دارالاماں کا قیام ممکن ہوسکے۔اقبال اس انقلاب کو انجام دینے والے ان جاں باز سالاروں کے منتظر ہیں۔جو خیرِ کثیر کے مالک ہوں اور شر کی شورشوں کو ختم کرکے چشمِ آدم کے لیے فروغِ نظر کا سامان فراہم کرسکیں:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

ان کی اضطرابی آرزومندی دیکھیے کہ وہ مالک کون ومکاں سے آدابِ بندی کو خاطر میں لائے بغیر شوخی وشکایت کے لہجے میں دعا کرتے ہیں کہ اے قادرِ مطلق اگر تو

Guess you like
51
of 428

91.1KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

میری خواہشوں کی تکمیل نہ کر سکے تو کم سے کم میرے سینے میں موجود آرزوئے انقلاب کو قتل کر دے یا پھر اس زمین و آسمان کی بنیاد کو تہس نہس کر دے تو یہ کر یا وہ کر:

یا بکش در سینۂ ما آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہاد ایں زمین و آسماں
یا چنیں کن یا چناں [21]

حواشی

-1	بانگ درا	حقیقت حسن	-2	بال جبریل	(غزل)
-3	بال جبریل	(غزل)	-4	بال جبریل	(غزل)
-5	پیام مشرق	(لالۂ طور)	-6	بانگ درا	(غزل)
-7	پیام مشرق	(لالۂ طور)	-8	بانگ درا	(خضر راہ)
-9	بانگ درا	(خضر راہ)	-10	بانگ درا	(طلوع اسلام)
-11	مثنوی پس چہ باید کرد		-12	زبور عجم	
-13	علم الاقتصاد	1904ء، لاہور ص45			
-14	اقبال کا حرف شیریں، دہلی 2014ء، ص22				
-15	اسرار خودی		-16	بال جبریل	گدائی
-17	پیام مشرق	ساقی نامہ	-18	زبور عجم	
-19	بال جبریل	فرمان خدا	-20	پس چہ باید کرد	
-21	زبور عجم				

❖❖❖

Guess you like
52
of 428

49.9KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

پروفیسر شارب ردولوی (لکھنؤ)

اقبال کے شعری ابعاد اور تعینِ قدر کا مسئلہ

اقبال کی شاعری اپنی دل کشی اور اثر آفرینی کی وجہ سے کتنی ہی مقبول کیوں نہ ہو، لیکن اپنی معنویت، مقصدیت اور تاریخیت کی وجہ سے اس کے تعین قدر کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کلامِ اقبال اپنے قاری کے ذہن میں کئی سوال چھوڑ جاتا ہے۔ یہ سوال ادب اور ماورائے ادب دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبال برصغیر کا ادبی، تاریخی اور تہذیبی سرمایہ ہیں۔ وہ اردو کے پہلے کثیر الابعاد شاعر ہیں جس کی قرأت خود قاری سے وسعتِ علم ونظر کا مطالبہ کرتی ہے۔ جہاں تک ادبی وتہذیبی ابعاد کا تعلق ہے، اس کی روشنی میں کئی دوسرے شعرا کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن اقبال کی کائناتِ شعر بہت وسیع ہے۔ اس میں عصری حقیقتیں بھی ہیں اور وہ تاریخی، تہذیبی سرمایہ بھی جو صدیوں کو محیط ہے اور ایشیا و یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کے قاری کے لیے یہی مشکل ہے کہ وہ اقبال تک پہنچ کر بھی اقبال تک نہیں پہنچتا۔ یہ سوال اردو کے دوسرے

Guess you like

53
of 428

82.5KB/s 6:27 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

شاعر کو پڑھتے وقت نہیں پیدا ہوتا۔ دراصل جہاں علم کے ساتھ تفکر و تجسس شامل ہو جاتا ہے، وہاں شاعری صرف جذبات کی ترجمان نہیں رہ جاتی۔ اس لیے کہ پھر شاعر کا ذہن بعینہ چیزوں کو قبول نہیں کر لیتا بلکہ طرح طرح کے سوالات کرتا ہے۔ غالب پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں تجسس اور تفکر کی یہ آنچ محسوس ہوتی ہے جو اکثر سوال بن کر ابھرتی ہے :

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

یا فکر کی یہ جرأت :

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانہ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم
کردہ ام ایمان خود را دست مزدِ خیشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

لیکن اقبال کے یہاں یہ لپک شعلے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اقبال سوال کم ہی کرتے ہیں اور ان کے سوال براہِ راست نہیں ہوتے۔ ان کے پس پشت معنی کی ایک کائنات اور تاریخ کے وسیع حوالے ہوتے ہیں :

اگر مقصودِ کل میں ہوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مرے ہنگامہ ہائے نو بہ نو کی انتہا کیا ہے
مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

Guess you like
54
of 428

4.58KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

تمام عارف و عامی خودی سے بے گانہ
کوئی بتائے یہ مسجد ہے یا کہ مے خانہ

دراصل غالب اور اقبال کا Concern الگ الگ ہے۔ غالب کے سامنے صرف اپنی دنیا اور اپنے معاملات ہیں۔ غالب اپنی پنشن کے لیے کلکتہ (کولکاتا) جاسکتے ہیں اور اپنی ضرورت کے لیے قصائد کہہ سکتے ہیں۔ اقبال فلسفیانہ اور تاریخی مزاج کے انسان ہیں اس لیے ان کی نظر محدود نہیں ہے۔ زمانہ کی تبدیلیوں اور قوموں کے عروج و زوال پر ان کی نگاہ ہے۔ اقبال 1877ء یعنی 1857ء کی شکست کے 20 سال بعد پیدا ہوئے، جب ملک میں ایک نیا نظام رائج ہو چکا تھا لیکن ایک حساس انسان کی طرح تاریخ کا وہ ورق ان کی نگاہ میں تھا جس پر قوموں کے زوال کی کہانی درج تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قوموں کے زوال کی پہلی ضرب تو انھیں ہندوستان میں ہی لگی اور جب اس کا کرب پھیلا تو اس نے پورے ایشیا کا احاطہ کرلیا۔

پہلی جنگ عظیم (1914-1918) اور 1917ء کے اکتوبر انقلاب نے ان کے سامنے بہت سے سوال کھڑے کردیے تھے۔ یہ سوال انسانیت سے متعلق تھے۔ زندگی اور سلطنت سے متعلق تھے اور مغرب کی بڑھتی ہوئی صنعتی تہذیب سے متعلق تھے۔ اقبال صرف شاعر نہیں ہیں، وہ ایک پیش بیں (Forward Looking) مفکر ہیں جس کی نگاہ ماضی اور حال پر بھی ہے اور جو مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انھیں محدود مذہبی خانے میں رکھنے والے یہ نہیں سوچتے کہ انھوں نے تو ایشیا کی آزادی اور ایشیا کی بے داری کا خواب دیکھا تھا۔ مسلمان تو صرف ایک استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ چوں کہ ہندوستان سے اسپین تک تبدیلی کے اس سیلاب تند خو کا شکار وہی نظر آتا ہے۔ اس لیے ایک طرف تو وہ احساس کم تری کا شکار ہے، دوسری طرف نئی تہذیبی یورش اور علمی پھیلاؤ سے خوف زدہ ہے۔ علم سے دوری اور جدید علوم سے خوف اس کی پسماندگی کا سبب ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا :

55
of 428

0.47KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

"Lack of timely attention to modern education has put indian Muslims behind the Hindu in many field."

(بحوالہ "اقبال شناسی" از علی سردار جعفری ص-26)

ٹیگور ایک وسیع النظر انسان اور ایک عظیم دانش ور تھے۔ ان کی یہ بات صحیح ہے کہ اس وقت تعلیم کے میدان میں مسلمان کے پیچھے رہ جانے کی وجہ سے ہر میدان میں وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا۔ مسلمان اتنا پچھڑے ذہن کا تھا کہ ایک عرصے تک وہ انگریزی تعلیم کو اپنے مذہب کے ساتھ دشمنی سمجھتا رہا۔ مشہور مورخ اقتدار حسین صدیقی نے لکھا ہے کہ :

"1827ء میں، ریزیڈنٹ کے حکم سے دہلی کالج میں انگریزی کا شعبہ کھولا گیا۔ اس شعبے میں مسلم طلبہ داخلہ نہیں لیتے تھے۔ ان کی نگاہ میں انگریزی تعلیم کا مقصد عیسائی بنانا تھا۔ اس وقت مسلمان فکری اور تہذیبی طور پر اپنے کو کس قدر غیر محفوظ سمجھتے تھے اس کا اندازہ ماسٹر رام چندر کی خودنوشت سے ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں "شہر کے فضلا بھی جدید نظریات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ یونانی نظریات کے حامی تھے اور صدیوں سے انھیں نظریات پر ان کا ایمان تھا۔"

(بحوالہ "تحقیقی عمل" شارب ردولوی ص-256)

اس منظرنامے میں اگر اقبال مسلمان کی بات کرتے ہیں تو اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ ہم دردی کا مستحق ہے۔ اقبال ہوں یا ٹیگور، دونوں اس عہد کے دانش ور، انسان دوست مفکر اور شاعر تھے۔

اقبال کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اقبال کو شاعر ملت اور شاعر اسلام بنا کر ایک محدود احاطے میں قید کر دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے اس Image کو ان کی پوری شاعری اور شخصیت پر Super Impose کرنے کی شعوری کوشش کی گئی اور یہ کام ان لوگوں نے کیا جنھیں اپنے محدود تاریخی، تہذیبی اور سیاسی مقاصد کے لیے انھیں

Guess you like

56
of 428

3.08KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

استعمال کرنا تھا۔ اسی وجہ سے غیر مسلم حلقے عام طور پر انھیں مذہبی شاعر اور فرقہ پرست قرار دے کر رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا آج بھی انھیں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑا شاعر محدود نظریے کا شاعر رہ گیا اور ان کا وہ تمام کلام جو انسانیت، انسان دوستی، اعلیٰ فکر، عظیم اقدار، آزادی اور ساری دنیا کی رہ نمائی کے لیے تھا، وہ نظر انداز ہو گیا۔ انھوں نے تو ہمیشہ آدمی کا ذکر کیا اور ان میں کافر و مومن کا فرق نہیں کیا۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ کہتے ہیں :

حرف بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

یعنی زبان پر کوئی برا لفظ لانا غلطی (خطا) ہے۔ کافر و مومن دونوں ہی خدا کے بندے ہیں۔ آدمیت (انسان دوستی) احترامِ آدمی کا نام ہے۔ عشق کا بندہ خدا سے طور و طریق سیکھتا ہے اور کافر و مومن دونوں پر برابر شفقت سے پیش آتا ہے۔

اس لیے عام معنوں میں اقبال کو مذہبی شاعر قرار دینا درست نہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا ہے کہ :

''اقبال کا مذہب عام لوگوں کے مذہب یا مذہبی ہونے سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم دونوں کو روحانی مذہب کی ضرورت کا شدید احساس ہے۔''

(''اقبال شناسی'' علی سردار جعفری ص۔49)

جس روحانی مذہب کی طرف ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اشارہ کیا، اقبال کے یہاں وہ مذہب عشق اور انسانیت ہے۔ اقبال مولانا روم کے بڑے عقیدت مند ہیں اور مولانا روم کا مذہب

Guess you like
57
of 428

76.7KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

بھی وہی مذہب عشق ہے۔ اس لیے وہ اپنے "رمز آشنائے روم" ہونے پر فخر کرتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نہ بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو کہ ہندوستان میں میرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں نظر آئے جو برہمن زادہ ہونے
کے باوجود روم و تبریز کے فکر و فلسفہ کا رمز آشنا ہو۔)

یہ ان کے وسیع انسانی تصور کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اقبال کے فلسفہ کی بنیاد انسانیت، محبت اور یک جہتی ہے۔ یہی دونوں چیزیں ہیں جو اقبال کے یہاں مقصد کی تکمیل تک لے جاتی ہیں لیکن بہکا بھی سکتی ہیں۔ اس لیے کہ اس عشق کا بوجھ اٹھانے کے لیے ظرف کی ضرورت ہے۔ اقبال کے یہاں یہ ایک لفظ نہیں بلکہ زندگی کی بنیاد ہے اور اسی سے کائنات میں حرکت اور رنگینی ہے :

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے پر اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ تو شرع دیں بت کدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اور اس کی ادا بھی غضب ہے :

گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد
عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

Guess you like
58
of 428

51.1KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اور اسی عشق سے خودی کی راہیں کھلتی ہیں۔ اقبال عشق کو جوہرِ زندگی اور خودی کو جوہرِ عشق قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی نگاہ میں زندگی اور عشق دونوں کا جوہر خودی ہے۔

جوہرِ زندگی ہے عشق، جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیِ نیام میں

اقبال کو اپنے عہد سے یہ شکایت رہی ہے کہ اس کا انسان اپنے اندر خودی نہ پیدا کر سکا اور یہ "تیغِ تیز" پردۂ نیام ہی میں پوشیدہ رہی۔ جب کہ اس تیغِ تیز یعنی خودی و عشق سے وہ فاتحِ عالم بن سکتا تھا۔ انھوں نے یہ شکایت اپنے زمانے کے انسان سے بھی کی ہے جو عقل کا تابع ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے کرب کا اندازہ پہلے مصرعے کی تشبیہ سے کیا جا سکتا ہے :

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اقبال عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ جہاں عقل صرف کاروبارِ زیست بن جائے اور جو انسان جوہرِ زندگی چھین لے وہاں وہ اس پر نہیں اس کے کاروبارانہ انداز پر روک لگانا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں "نفع و ضرر" نگاہ میں رکھ کر جو کام کیا جائے وہ توہینِ عشق ہے۔ انھوں نے عام طور پر عقل کے مقابلے میں عشق کو سربلند رکھا ہے۔ عشق کے بغیر زندگی ان کے لیے زندگی نہیں۔ "پیامِ مشرق" میں انھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ :

داند آں کوں نیک بخت و محرم است
زیرکی ابلیس و عشق از آدم است

Guess you like
59
of 428

51.1KB/s 6:28 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

(جو نیک بخت اور جاننے والا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ عقل مندی شیطان سے ہے اور عشق آدم سے ہے۔)

یہاں پر اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اقبال کا عہد رومانی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اقبال لاکھ حقیقت پسند (Pragmatic) ہونے کے باوجود عشق ہو یا خودی کے معاملات وہ کبھی کبھی رومانی ہوجاتے ہیں۔ ان کے تصورِ عشق اور تصورِ خودی میں ان کی رومانیت کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن اس سے ٹھہر کر گزرنے کی ضرورت ہے۔

اقبال نے خودی کو عشق کا جوہر قرار دیا یعنی بغیر عشق خودی کا وجود نہیں۔ اقبال کے یہاں خودی کا فلسفہ صرف فرد کے اپنے پہچاننے کی بات نہیں، یہ تکمیل انسانیت کا اشاریہ ہے۔ خودی کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اور خالق کونین میں کوئی ہم سری ہے کہ :

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یا

دروشت جنوں من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

خودی انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے جو اسے پروردگار کی طرف سے عطا ہوئی ہے بشرطیکہ وہ اسے اپنے اندر پیدا کر سکے اور اس منزل تک پہنچ سکے کہ ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے''

وہ کہتے ہیں :

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

میں عرض کر چکا ہوں کہ خودی کا تعلق صرف فرد سے نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع اصطلاح ہے جو سماج اور سوسائٹی کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اقبال کسی ایک شخص میں خودی کا جوہر پیدا

Guess you like
60
of 428

2.29KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

کرنے کی تلقین نہیں کرتے وہ پوری امت کو اس میں شریک کرتے ہیں۔ اگر ملت خودی سے بے بہرہ ہے تو بالیدگی فکر ممکن نہیں :

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

اس طرح علم اور عشق دونوں کو اقبال نے خودی کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے "ساقی نامہ" میں خودی کی خود اس طرح تعریف کی ہے :

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بے داریِ کائنات
خودی جلوۂ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اس طرح انسانیت کی تعمیر کی بنیادی اینٹ اقبال خودی کو قرار دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ من و تو سے پیدا تو ہے لیکن من و تو سے پاک ہے۔ اس طرح اقبال خودی کو "من و تو" سے پاک قرار دے کر خود سری اور خودی کے درمیان ایک خطِ فاصل بنا دیتے ہیں یعنی خودی پوری انسانیت یا امت کی سرفرازی کا سبب ہے۔ اقبال کے

Guess you like
61
of 428

51.5KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

فلسفہ خودی پر روشنی ڈالتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا ہے :

''اقبال کے فلسفہ میں سارا نظام اور تسلسل حیات خودی کے استحکام پر منحصر ہے۔ وہ ہیگل ہستی کو آثار اور اسرار خودی کہتا ہے جس سے عالم پیدار آشکارہ ہوتا ہے۔ اثبات وفی دو جدلیاتی قوتیں جن کی تکرار اور کش مکش سے خودی ترقی کرتی ہے اور اپنی قوت سے آگاہ ہوتی ہے۔ قوت تخلیق اور قوت عمل خودی کے مظاہر ہیں۔''

(''اقبال شناسی'' علی سردار جعفری ص۔38)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فلسفہ اقبال میں عشق اور خودی کو بنیادی حیثیت ہے۔ یوں بھی وہ خودی کو مرد خود آگاہ کا جلال و جمال کہتے ہیں اور اسے کتاب اور باقی ہر چیز کو اس کتاب کی تفسیر قرار دیتے ہیں :

خودی ہے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

اقبال عظمت آدم کے شاعر ہیں اور ان کی خودی کا فلسفہ، اس کی عظمت کی نشانی۔ اس لیے وہ اسے ''مرد خود آگاہ'' کا جلال و جمال قرار دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ایک عظمت ان کا کلیم اللہ ہونا تھا۔ لیکن اقبال 'مرد خود آگاہ' کو اللہ کا ہم کلام بنا دیتے ہیں جو پروردگار سے مکالمہ کرتا ہے۔ طور پر موسیٰ کی کیا کیفیت تھی اس کا علم تو نہیں لیکن اقبال کا انسان نئی دنیا کا انسان ہے، جو اللہ سے سوال بھی کرتا ہے اور اس کو جواب بھی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال خدا اور بندے کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں جو نچلی بھی ہے اور نیچیں ہے، جو ہم کلامی کا رشتہ ہے اور وہ اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب انسان کی خودی بے دار ہو۔ اپنی حد تک انھوں نے یہ رشتہ قائم کیا۔ ''پیام مشرق'' میں محاورہ مابین خدا اور انسان میں انسان کو جس طرح پروردگار سے ہم کلام دکھایا ہے، وہ خودی کی معراج ہے۔ اس کے مشہور اور تقریباً زبان زد اشعار ہیں جس میں خدا انسان سے مخاطب ہے :

62
of 428

51.5KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

جہاں را ز یک آب وگل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک فولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را

(دنیا کو میں نے آب وگل سے بنایا، تو نے (اس میں) ایران و تاتار وحبش بنا دیے۔
میں نے زمین سے فولاد پیدا کیا تو نے تیر، تلوار اور بندوق بنائی۔ تبر (کلہاڑی) بنائی اور
چہچہاتی چڑیوں کو قید کرنے کے لیے قفس بنائے۔)

اور انسان جواب دیتا ہے :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدیم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گل زار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(تو نے رات بنائی میں نے چراغ بنائے، تو نے مٹی بنائی میں نے اس کے پیالے بنائے،
تو نے جنگل اور پہاڑ بنائے میں نے گل زار اور باغ بنائے، میں وہ ہوں جو پتھر سے
آئینہ بناتا ہے اور میں وہ ہوں جو زہر سے شربت بنالیتا ہے۔)

اقبال انسان اور خدا کے درمیان اپنے تصورِ خودی اور مردِ خود آگاہ کے ذریعہ ایک رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی بنیاد تو انھوں نے بانگِ درا کے حصہ سوم میں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' سے ڈال دی تھی لیکن وہاں 'خود آگاہی' اس منزل تک نہیں پہنچی تھی جس

Guess you like
63
of 428

41.5KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

منزل پر "پیامِ مشرق" (1923ء) میں نظر آتی ہے۔ خودی اور خود آگہی کے اس رشتے میں عبودیت بھی ہے، محبت بھی ہے اور احترام بھی اور جب محبت ہے تو شکوہ یا سوال عبودیت کے رشتے سے باہر نہیں ہے۔

اقبال کے فلسفہ میں کئی پیچ و خم ہیں۔ اسی لیے اقبال کے تعین قدر میں بہت سی دشواریاں سامنے آتی ہیں۔ شروع میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ اقبال کثیر ابعاد (Multi-Dimensional) شاعر ہیں۔ اس لیے مطالعہ اقبال میں ایسے بہت سے سوال اٹھتے ہیں جو توجہ طلب ہیں۔ اقبال کے یہاں مردِ مومن یا فوق البشر کا تصور ہو، زمان و مکان یا طاقت کا تصور ہو یا خودی اور عشق کا، یہ اقبال کے ایسے اہم پہلو ہیں کہ ان کی تفہیم کے بغیر مکمل اقبال کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے تعین قدر میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اقبال کا کوئی ایک پہلو نمایاں ہو پاتا ہے تو دوسرے بہت سے نکات و محاسن رہ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے فلسفہ کے خشک مباحث جمالیات کے سانچے میں ڈھال دیے ہیں۔ اسی لیے ان کی کوئی غزل، نظم، رباعی یا قطعہ نہیں ہوگا جو فکری، فنی اور جمالیاتی اعتبار سے خوب صورت، دل کش اور پر اثر نہ ہو۔ یہ اقبال کا ایک بہت بڑا Contribution ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کا دامن فلسفیانہ نکات، زندگی کے مسائل، حیات و کائنات اور زمان و مکان کے دشوار مباحث سے بھر دیا ہے۔ اسی لیے اقبال کو سمجھنے کے لیے جتنی ادب و آگہی کی ضرورت ہے، اتنی ہی علم اور خود آگہی کی ضرورت ہے۔

❖❖❖

Guess you like
64
of 428

39.7KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

پروفیسر یوسف تقی (کولکاتا)

اقبال کی اردو شاعری میں تمثال کاری

اردو کے شعری ادب نے اپنے ارتقائی سفر سے لے کر بیسویں صدی کی نصف تک دو ایسے شاعر پیدا کیے جن کی عظمت و شہرت مشرق سے مغرب کی علمی و ادبی محفلوں تک جا پہنچی، ان میں ایک جو اپنی ''بادہ خواری'' کے باعث ''ولی'' بنتے بنتے رہ گئے، پھر بھی اپنی وفات کے بعد بزرگانِ دین کے پہلو میں جگہ پائی۔ میری مراد مرزا اسد اللہ خاں غالب سے ہے۔ دوسرے علامہ اقبال ہیں جو زندگی بھر قوم و ملت کے روشن و تاب ناک مستقبل کا خواب دیکھتے رہے اور اسے شرمندۂ تعبیر کرنے میں کاشاں رہے۔ ان دونوں شعرا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔

میری اس گفتگو کا موضوع ''اقبال کی اردو شاعری میں تمثال کاری'' ہے۔ اس پہلے کہ اقبال کی شاعری کا جائزہ تمثال کاری کے حوالے سے لیا جائے، ضروری ہے کہ شعری تمثال پر ایک نظر ڈالی جائے۔

Guess you like

65
of 428

4.69KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

تمثال کا لغوی مفہوم اردو کے مختلف لغات میں کچھ یوں ہے: خیالی تصویر یا پیکر، مورت، پتلا، عکس، شبیہ، سایہ، مثل، مثال، صورت وغیرہ۔ دراصل یہ انگریزی زبان کا لفظ امیج (Image) کی صورت ہوگی یعنی الفاظ سے متشکل ایک ایسی تصویر جو حسیات کو ابھارے یا جس سے بیان میں جامعیت آئے اور قاری کے ذہن کو شاعر کے بیان کی تہہ میں موجود موضوع کی طرف لے جانے پر قادر ہو اور پھر شاعر تمثال میں جو مرکزی خیال بیان کرنا چاہتا ہے۔ مماثلت کے سہارے اس کے لیے متبادل اشیا لے کر آتا ہے اور لفظی تصویر تخلیق کرتا ہے۔ یہ مماثلت، تشبیہ، استعارے، تلمیح، علامت سے دی جاتی ہے۔ گویا یہ تمثال کے لازمی عناصر ہیں مگر یہ سب تمثال سے جداگانہ اپنی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ذرائع ہیں جنہیں تمثال کے اقسام بھی کہہ سکتے ہیں، وہ یہ ہیں۔ بصری، سمعی، مشامی، ذائقاتی لمسی، عضویاتی اور عصبی۔ غرض تمثال کاری ان ہی ذرائع کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔

تمثال کاری کے عمل کو ہر زبان کی شاعری میں تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ شعرا اپنے محسوسات، مشاہدات، تجربات اور خیالات کو بہتر ترسیل کے لیے تمثالوں کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ اردو زبان کی شاعری میں تمثال کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ خصوصاً اقبال اور اقبال کے بعد کے شعرا مثلاً احمد ندیم قاسمی، ن م۔ راشد، ناصر کاظمی وغیرہ کے یہاں۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کا یہ قطعہ دیکھیے:

کس کی دستک ہے ٹھہرنا تو ابھی آتی ہوں
آپ واللہ مسرت سے مری جاتی ہوں
لیکن اس وقت وہ چوپال سے آجاتے ہیں
جائیے آپ ہی کے سر کی قسم کھاتی ہوں

اس قطعہ میں جو الفاظ اور اشیا آئے ہیں اور ان کے اجتماع سے جو تصویر کشی ہوئی ہے، وہ قاری کے حواس پر کئی کیفیات طاری کرتی ہے اور ایک بصری اور سمعی تمثال کا روپ

Guess you like
66
of 428

82.0KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

دھار لیتی ہے۔ گاؤں کے ایک بند گھر کا منظر تخیل میں ابھرتا ہے۔ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ اندر سے ایک نسوانی آواز ٹھہرنے کو کہتی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی لیکن اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے شوہر کے گھر آنے کا وقت ہو گیا ہے، وہ اُس سے لوٹ جانے کی منت کرتی ہے۔ اس طرح یہ قطعہ خوشی اور خوف کی آمیزش کے ساتھ بے بسی کی روداد بھی ہے۔

ناصر کاظمی کا درج ذیل شعر بھی سمعی اور بصری تمثال کی اچھی اور کامیاب مثال ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اس شعر میں بظاہر جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ عام فہم اور عامیانہ ہیں اور جو اشیا ہیں، وہ ایسی ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی سے بے حد قریب ہیں جیسے گھر کی دیواریں، بال کھول کر سونا وغیرہ۔ یہ وہ اشیا اور عمل روزانہ ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود جب یہ شعر سامنے آتا ہے تو ہماری بصارت اور ہمارا تخیل ایک نئے تجربے سے گزرتا ہے اور ہمارے بصری اور سمعی حواس متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ظاہری تصویر ہمیں داخل کی الم ناک دنیا کی سیر کراتی ہے۔

اب آیئے علامہ اقبال کی تمثال کاری کا جائزہ لیا جائے۔ علامہ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کا کلام محاکات نگاری اور تمثال کاری کی بے شمار مثالوں سے مزین ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات، مظاہرِ فطرت کا بیان، اسلام کا شاندار ماضی، اقوامِ عالم کی سیاسی تاریخ، مشرق و مغرب کے مفکّرین کے فلسفے، روئے زمین پر اسلام کی مضبوطی اور ملتِ اسلامیہ کی تعمیرِ نو ہیں۔ ان کے موضوعات کی ہمہ جہتی، ان کی شاعرانہ تصور کاری، محاکات نگاری اور تمثال کاری سے بھی عیاں ہے۔ زندگی کے بارے میں اقبال کا مخصوص فلسفہ اور پیغام ان کی تمام تر شاعری پر غالب ہے۔ ان کے شعری محاسن بھی اس پیغام رسانی

Guess you like

67
of 428

82.0KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

کو عمدگی سے سرانجام دینے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ ''بانگ درا'' جوان کا پہلا مجموعہ ہے جس کی ابتدائی نظموں میں وہ فطرت سے قریب نظر آتے ہیں اور جو دراصل انگریزی شعرا ورڈزورتھ اور شیلے کی تقلید پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''گل رنگین''، ''ایک آرزو''، ''صبح کا ستارہ''، ''حقیقتِ حسن'' اور ''حسن و عشق'' میں ورڈزورتھ کی تقلید میں کائنات کے حسن سے شیفتگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ دراصل اقبال مظاہرِ فطرت کی تصویر کشی سے اپنے پیغامات کو قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اقبال کی نظمیں فن کارانہ لفظی تصویریں، محاکات کی عمدہ مثالیں اور تمثال کاری کا بہترین نمونہ ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً نظم ''ایک آرزو'' کے یہ اشعار:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگا کے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

یا پھر نظم ''گل رنگین'' کے یہ اشعار:

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے
میں چمن سے دور ہوں، تو بھی چمن سے دور ہے

Guess you like

68
of 428

33.2KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

''بانگ درا'' کے بعد کے مجموعوں میں اقبال کا ایک مربوط و مضبوط نقطہ نظر ان کے ہاں خاص معنی کی حامل علامتوں کی تخلیق کرتا ہے۔ ان علامتوں کی مدد سے ان نظموں میں اعلیٰ پایہ کی تمثال کاری ملتی ہے۔ بقول وحید اختر:

''وہ شعر کی زبان کو سادہ بیانیہ زبان نہیں سمجھتے بلکہ استعارات و علامات کی زبان سمجھتے ہیں۔ شعری علایم ایک تہذیب کی دین ہوتے ہیں اور استعارات کی تخلیق میں فن کار کا انفرادی تجربہ بھی استعداد کے مطابق کارفرما رہتا ہے۔ یا الفاظ دیگر علایم و استعارات کی تشکیل اجتماعی لاشعور اور انفرادی شعور مل کر کرتے ہیں۔''

(اقبال کا فن، ص: 226)

اقبال نے مروجہ الفاظ و تراکیب اور استعارات و علامات کو اپنے مخصوص نظریاتی معنی سے ہم آہنگ کر کے ان میں ایک انفرادیت پیدا کی۔ ان کے کلام میں مذہبی اصطلاحات، تلمیحات اور علامتیں تمثال کی تخلیق کی محرک بنتی ہیں تو ایک ایسی نوعیت کی تمثال کاری وجود میں آتی ہے جو ان ہی کی ذات سے منسوب ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں:

''اقبال حسن فطرت کے دلدادہ و شیدائی ہیں۔ مگر وہ حسن فطرت کو پہلے اخلاقی اور روحانی حقائق کے ادراک کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعد میں تسخیر فطرت کا۔ اقبال کی بہترین تصویریں خیالی ہیں۔ وہ جب مفرد اشیا کی مصوری کرتے ہیں تو خارجی جزئیات سے زیادہ ان اشیا کے پوشیدہ اسرار حکمت و بصیرت کا بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ مفرد اشیا کے مقابلے میں ان کی مرکب تصویریں مرقع کشی کا عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔''

(مقالات اقبال، ص 31)

اقبال نے اپنے نظریات کے ابلاغ کے لیے اپنی مخصوص علامتوں سے تمثالوں کی تخلیق کی ہے۔ بانگ درا کے پہلے حصے کی نظموں کی تصویر کاری اگلے حصوں اور بعد

Guess you like
69
of 428

58.0KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

کے مجموعوں میں پیچیدہ علامتی طرز بیان کی بدولت تمثال کاری کی طرف سفر کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تمثالیں اسلامی تاریخ اور مذہبی اساطیر کی نقشہ کشی کرتی ہیں۔ عالم اسلام کی تصویر کشی سے وہ اپنے نظریات کے ابلاغ کا کام لیتے ہیں۔ تاریخی واقعات و تلمیحات کو وہ اپنے نئے انداز میں اس طرح تصویروں میں زندہ کرتے ہیں کہ ان کا عمل قاری پر بھرپور انداز میں اثر پذیر ہوتا ہے۔ ضرب کلیم، آتش نمرود، اولادِ ابراہیم، جلوۂ طور، ید بیضا، خضر اور عصائے موسیٰ ان کے وہ مذہبی اشارے ہیں جن کی مدد سے انہوں نے مذہبی تاریخ کی حامل تمثالوں کی تخلیق کی ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''ذوق و شوق'' کے چند مسلسل اشعار دیکھیے:

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ تخیل ڈھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

یا پھر یہ شعر:

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، نمود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ان اشعار کو پڑھتے ہوئے قاری ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جو اس کے

Guess you like

70
of 428

101KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

تخیل کی غیر مرئی دنیا ہے، جہاں اس کا وجود اپنے اردگرد اور تمام علائق جو اسے گھیرے ہوئے تھے، سے آزاد ہے۔ وہ اپنے تصور کے ذریعہ حسی تمثال سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے اور جو اشیا جیسے دشت کی صبح، چشمہ آفتاب، سحاب شب کا پیدا کردہ سرخی مائل نیلا آسمان، کوہ اصنم، گرد سے پاک ہوا سے دھلی ہوئی کھجور کے درختوں کے پتے، بجھی ہوئی آگ، خیموں کی ٹوٹی رسیاں ..... یہ سب اسے طہارت سے مملو سفر کا تصور پیش کرتے ہیں۔

مذہبی تمثالوں کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم و افکار بھی اقبال کی تمثالوں کا موضوع بنتے ہیں۔ وہ مغربیت سے زیادہ مشرقیت پر زور دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اظہار تمثالوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ درحقیقت وہ اہل مشرق کو ان کا شاندار ماضی، علمی فتوحات اور اجداد کے حسین کارناموں کو یاد دلا کر ان کے دل میں تڑپ اور اضطراب جگانا چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور اوضاع و اطوار کو بھی اپنی تمثالوں میں جگہ دیتے ہیں جس کی عمدہ مثالیں گنگا، ہمالہ اور رام کا وجود ہیں۔ مثلاً ''ہمالہ'' کا یہ بند دیکھیں:

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

اقبال نے کائنات کی ہر شے چاہے وہ مجرد اشیا ہوں یا مجسم مظاہر جیسے دریا ہو یا اس کی موج، سورج ہو یا ستارہ چمن ہو یا لالہ اور شبنم، شاہین، صحرا کے الفاظ اور اشیا، انہوں نے تمثالوں کے ذرائع کے طور استعمال کیے ہیں اور ان کو نظموں کے موضوع کی مطابقت اپنے فن کے حوالے سے اپنی تمثالوں میں جگہ دی ہے۔ مزید ایک دو مثالیں

Guess you like
71
of 428

0.04KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ملاحظہ فرمایئے:

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفلِ صغیر تنہا کی
("فراق" ص13)

شعلۂ خورشید گویا حاصلِ اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
(نمود صبح)

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی

.....

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

.....

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

میرا خیال ہے، اقبال اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ جو پیغام وہ قوم وملت کو دینا چاہتے ہیں۔ اگر سیدھے سادے انداز میں دیا جاتا تو شاید اتنا موثر نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت، وہ نظریہ براہِ راست قبول کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے پیغام اور نظریات پر تمثال کی شکری تہہ جما کر پیش کیا اور جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے بیانیہ پیرایۂ اظہار کو زیادہ اپنایا۔ چوں کہ ان کا یہ عمل شعوری تھا، اس لیے تمثال کاری کے بہترین نمونے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

❖❖❖

Guess you like

72
of 428

4.84KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

پروفیسر علی احمد فاطمی (الہ آباد)

اقبال کی آفاقیت پر چند باتیں

اردو ادب کے اقبال واحد شاعر ہیں جن پر بے پناہ لکھا گیا۔ ان کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کرتے ہوئے ہزاروں کتابیں تصنیف پا چکی ہیں کہ اب اس میں اضافہ کرنا مشکل ہی نظر آتا ہے تاہم چراغ سے چراغ جلتے ہیں۔ میں جس نقطۂ نظر سے اس عظیم و آفاقی شاعر کو دیکھتا ہوں اس کا کھلا اور سچا اظہار میرے لیے مشکل نظر آتا ہے پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ اس عالی مرتبت شاعر کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہوں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ظاہر کر دوں۔

اپریل 1938ء میں جب اقبال کا انتقال ہوا تو دوسرے عظیم شاعر ٹیگور نے اقبال کے بارے میں یہ تاثرات دیے:

''ڈاکٹر اقبال اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی چھوڑ گئے ہیں جس کا گھاؤ مندمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا کی نگاہ میں اتنا کم ہے کہ ہم کسی حالت میں

73
of 428

67.0KB/s 6:29 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے جس کے کلام نے عالم گیر مقبولیت حاصل کر لی ہو۔"

لفظ 'عالم گیر مقبولیت' ملاحظہ کیجیے۔ ٹیگور کا یہ اعتراف محض وقتی تاثر نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھا۔ اقبال کے بڑے شاعر ہونے میں تو ان کے بدترین دشمن کو بھی اختلاف نہیں بلکہ اقبال کی آفاقیت نے ہی لوگوں کو دشمن بنایا ہے اس لیے ان کی آفاقیت پر اکثر و بیش تر باتیں ضرور اٹھی ہیں۔ سوالات بھی قائم ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ یہ سوالات بھی در پردہ ان کی آفاقیت کو تسلیم کرتے ہیں، پھر بھی ان پر باتیں کرنا کل بھی ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے۔ ایسے سوالات سے جوجھنا، بڑے شاعر سے ہم کلام ہونا شاعر کے لیے کم قاری اور ناقد کے لیے زیادہ سود مند ہوا کرتا ہے۔ اگر اقبال صرف شاعر ہیں تو جگر کا یہ شعر پڑھیے :

بہار اپنی جگہ پر سدا بہار رہے
یہ چاہتا ہے تو پھر تجزیۂ بہار نہ کر

لیکن ہم جانتے ہیں کہ اقبال صرف شاعر نہیں ہیں۔ وہ مفکر اور فلسفی ہیں، مصلح اور ہادی بھی۔ اس لیے اقبال جیسے بڑے فلسفی شاعر کا جوں کا توں لیا جانا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لیے بقول ظ انصاری Chitical اور Anabytical Approach چاہیے لیکن کبھی کبھی بڑا شاعر کچھ زیادہ بڑا امتحان لے لیتا ہے اور اس پر عجیب و غریب انداز سے فیصلے اور فتوے ہو جایا کرتے ہیں جن میں اکثر غلط فہمیاں بھی کام کرتی رہتی ہیں اور یہ غلط فہمی بقول پروفیسر سراج الدین :

"یہ غلط فہمی نہ صرف اس طبقے میں ہے جو اقبال کو مذہبی اور فرقہ واری شاعر سمجھ کر الگ رکھ دیتے ہیں بلکہ ان لوگوں میں بھی ہے جو مذہبی جوش میں اقبال کو صرف شاعر اسلام گردان کر ان کے عالمی مرتبہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔"

میں اپنی گفتگو کا آغاز غلط فہمی کے پہلے حصہ سے کرنا چاہتا ہوں۔
یہ نصف صدی پہلے کی بات ہے یعنی آزادی کے آس پاس۔ ماہر اقبالیات پروفیسر

Guess you like

74
of 428

67.0KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

آل احمد سرور نے شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں اقبال یادگاری خطبہ کا اہتمام کیا۔ خطبہ پیش کرنے والے تھے اردو کے ترقی پسند ادیب و ناقد ممتاز حسین۔ خطبہ کا عنوان تھا۔ ''کیا اقبال آفاقی شاعر ہیں؟'' جو بعد میں ان کی کتاب ''نقد حیات'' میں بھی بطور مضمون شامل ہوا۔ عنوان سوالیہ انداز کا تھا جس میں تشکیک کا پہلو بھی اُبھرتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ تشکیک اقبال کی آفاقیت پر کم بلکہ ان کی آفاقیت کو طرح طرح سے تفہیم کر دینے اور اپنے اپنے طور پر معنی پہنا کر اسے محدود کرنے کو لے کر تھی جس پر اچھی خاصی بحث کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ عظیم شاعر کی حیثیت اس لحیم شحیم ہاتھی کی طرح ہو جاتی ہے جسے کچھ نابینا جسم کے جز کو پکڑ کر کل سمجھ بیٹھے ہیں۔ اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے جس کو لے کر خود اقبال بھی پریشان تھے اور کبھی کبھی پشیمان بھی، اس حد تک کہ شاعری کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ بھی کہتے رہے :

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی

یہ اعترافِ عجز بھی ہو سکتا ہے اور حیات و کائنات کے پیچ در پیچ مسائل جس میں اقبال ہمہ وقت غرق رہتے، پریشان بھی رہتے اور اپنے فکری عمل ہی نہیں اس کی ابتدا اور انتہا کی تلاش میں بھی سرگرداں رہتے :

خردمندوں سے کیوں پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
میں خود اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

یہ کنفیوژن ہر بڑے شاعر کے یہاں پایا جاتا ہے اور طرح طرح کے سوالات بھی اُٹھتے ہیں جو فطری ہیں۔ ممتاز حسین نے جو سوال اُٹھایا ہے اس کی ابتدا تو وہ مارکسی مفکر ہونے کے ناتے نظامِ معیشت ہی نہیں نظامِ جدل سے کرتے ہیں وہ بھی اس لیے کہ اقبال

Guess you like

75
of 428

60.3KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

بہت سے معنوں میں برگساں کے ہم خیال ہیں۔ برگساں کی طرح وہ بھی تلاش حقیقت کے لیے مشق ہی کو رہبر مانتے ہیں حالاں کہ عقل کو بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انسان مادے کی تخلیق نہیں کرتا وہ صرف مادہ کی شکلیں بدل سکتا ہے۔ اس لیے اس کی ذات میں صفاتِ کبریا کو دیکھنا خود اسلامی رو سے بحث طلب ہے۔ اقبال نے اسلامی فکر اور جذبہ کے حوالہ سے انسان کو ایک مکمل تخلیق کار اور نمو پذیر شے مانا تو ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کو بھی لعنت قرار دیتے ہیں۔ لیکن ممتاز حسین کی یہ شکایت اپنی جگہ پر ہے کہ :

> ''اقبال نے کارل مارکس کو صاحب کتاب جانا اور لینن کو حضور بارگاہ میں مغرب کے سرمایہ دارانہ چیرہ دستوں کے خلاف کھڑا کر دیا لیکن اشتراکی نظام سے انہوں نے بھر پور ہم دردی کا اظہار نہ کیا۔''

یہ مطالعہ اس لیے کہ ممتاز حسین پختہ اشتراکی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ:

> ''ہر وہ مفکر جو سچے دل سے پوری انسانیت کے لیے سوچتا ہے اور خیر و فلاح کو طبقاتی مفاد سے بالاتر کر دینا چاہتا ہے وہ لامحالہ اشتراکی نظام ہی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔''

اس خیال میں صداقت ہو سکتا ہے لیکن اس پر بحث ہو سکتی ہے۔ اسی لیے وہ اقبال کے آفاقی ہونے پر سوالیہ نشان بھی لگا دیتے ہیں۔ لیکن یہ نشان اقبال کو تو چھوتا نہیں کرتا بلکہ آفاقیت کے خود ساختہ تصور پر نشان ضرور لگا دیتا ہے۔

حیات اور کائنات کو دیکھنے اور سمجھنے کے مختلف زاویے ہوا کرتے ہیں۔ مخالف نظریہ کا سوال اُٹھنا فطری اور لازمی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس سوال میں عالم گیریت کا فہمی جذبہ و خیال ہے یا نہیں۔ اس خیال کو ابہام و اشکال کا درجہ اس وقت اور مل جاتا ہے جب ایک فرقہ کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر اصرار اور تکرار کرتا ہے کہ اقبال محض ایک اسلامی شاعر ہیں اور ان کے خطاب صرف مسلمانوں سے ہے اور چوں کہ اسلام اشتراکیت پر یقین نہیں رکھتا اور اس نے سرمایہ داری ختم کرنے کی تلقین نہیں کی ہے اس لیے یہ سب

76
of 428

44.2KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

چیزیں اقبال کے لیے جزوی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کی شاعری کی اساس اسلامیات پر ہے جس میں اور بھی کئی فکری دھارے آ کر ملتے ہیں تاہم اگر اس کی تکمیل کائنات اسلامی فکر و فلسفہ ہی ہے تو یہ کوئی ایسی بری بات نہیں۔ تلسی داس کی ہندوازم اور ملٹن کی عیسائیت پر ہے جس مذہب کی عمر ہزاروں برس کی ہو، جس کی اپنی زبردست تاریخ ہو، جس نے برائیوں سے قوموں سے لڑی ہو جس کا اپنا ایک شان دار ماضی ہو، جس کے فکر و فلسفہ کی بنیاد انسانی اور عوامی ہو، اس کی بنیادوں پر کھڑا شاعر اگر پوری دنیا کو دیکھ رہا ہو اور بنی نوع انسان کے مختلف نظریات و عقائد جو فطری ہوا کرتے ہیں ایک وحدت، روشنی اور ترقی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو اور جس کی فکر میں اسلام کے علاوہ ہندو، عیسائی مفکروں کا خیال جذب اور پیوست ہوا سے آپ محدود و مشروط شاعر کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ دیکھنے والے کا اپنا تو ہو سکتا ہے، شاعر کا نہیں۔ ملٹن کے بارے میں جب ممتاز حسین یہ کہتے ہیں :

> ''ملٹن نے ان چیزوں کو مذہبی نظریہ سے پیش کرنے کے باوجود ایک گونہ آفاقیت حاصل کر لی ہے تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے انسان اور قدرت کی جنگ میں انسان ہی کو فتح مند دکھایا ہے اور خیر و فلاح کے ایک عام نظریہ کی طرف انسان کو راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی بات ٹالسٹائے اور ٹیگور میں بھی پائی جاتی ہے۔ باوجود اس امر کہ ایک ویدانت اور دوسرا روحانی عیسائیت کا قایل ہے انہوں نے انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں سے خیر و نیکی کے جذبے کو ڈھونڈ نکالا ہے اور شمع انسانیت کی لو کو اپنے خونِ جگر سے زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی منزل بھی وہی ہے جو ان برگزیدہ ہستیوں کی تھی لیکن چوں کہ ان کے کلام میں خیر و افلاح کی ایک تخصیصی شکل ہے جسے ماضی کی ایک مخصوص منظم شکل سے مربوط کر دیا گیا ہے اس لیے ان کے تصورات کی آفاقیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔''

Guess you like

77
of 428

53.7KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ممتاز حسین کسی بھی تصور سے دیکھنے دکھانے میں حرج تو محسوس نہیں کرتے لیکن ان کا خیال ہے کہ راستوں کے متعین کر دینے سے عمومیت ختم ہو جاتی ہے اور بڑی شاعری کو ہر حال میں تمام تر امتیازات، تعریف و بندش سے بالاتر ہونا چاہیے اور وہ صرف عشق و عقل کی کشاکش میں مبتلا نہ ہو بلکہ زندگی کے اصل حقائق سے دست و گریباں ہو۔ وہ یہ بھی سوال اٹھاتے ہیں:

"اگر اقبال مسولینی کو فاشزم سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں اور نطشے کے دماغ کی تعریف کر سکتے تھے تو ان کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ اپنے مرد مومن کو کم از کم ایک بار مذہب کے تصورات سے آزاد کر کے دیکھتے۔ کیا خودی خود اپنے حدود سے آگاہ ہو کر آزادی کا تصور نہیں پیدا کر سکتی۔"

ان خیالات سے اختلافات کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن یہ خیالات دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔ ایک حقیر طالب علم کی حیثیت سے میں ان اکابرین کا جواب تو نہیں دے سکتا اس لیے محض دو ایک پہلوؤں کی طرف کچھ اشارے کر کے اپنی بات ختم کر دوں گا۔

ویسے تو زندگی کا کوئی ہم پہلو اقبال کی شاعری سے خارج از امکان نہیں ہے لیکن اس پوری کائنات کا مرکز و محور انسان ہے اس لیے انسان ہی اقبال کی شاعری کا مرکز و محور ہے اور یہ انسان انسان پہلے ہے، مسلمان بعد میں۔ یہ سچ ہے کہ اقبال کے انسان کو تلاش کرتے ہوئے آپ اسلامی روحانیات سے الگ نہیں ہو سکتے اس لیے کہ اقبال کے اکثر فکری حقائق اسی نظام فکر پر قائم ہیں تاہم وہ مادیت کے خلاف ہوتے ہوئے بھی انسان کی محنت، سماجی حقیقت، اس کی حرکت و حرارت پر پورا یقین بھی رکھتے ہیں۔ وہ انسان اور خدا کے رشتے کی قربت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان خدا کی بنائی ہوئی مخلوق ضرور ہے لیکن اتنا ہی سرکش اور نکتہ چیں بھی:

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں

Guess you like

78
of 428

50.9KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

اور پھر یہ انکار.....

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اور یہیں سے اقبال کے نظریۂ عظمت انسانی کے دائرے پھیلنے شروع ہوجاتے ہیں اور جلد ہی وہ ایک ایسی ہی انسانی شاہ راہ پر آ کر کھڑے ہوجاتے جہاں انسان کی عقل وخرد اور محنت ومشقت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ان کی تابانی، روشنی اس کو اپنے خالق کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے جہاں خدا خود انسان سے کبھی سرشار، کبھی بے زار دکھائی دینے لگتا ہے۔ کہہ اٹھتا ہے :

جہاں را ز یک آب وگل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک فولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

پھر انسان بڑے تمکنت سے جواب دیتا ہے :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گل زار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی فضیلت یہ ہے کہ وہ صرف تخلیق نہیں کرتا بلکہ اس کی تخلیقی قوت میں ایک باغیانہ سرکشی ہے۔ انسان کی یہی ادا اقبال کو پسند ہے کہ اس ضمن میں وہ انسان کے اس

Guess you like

79
of 428

50.9KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

عمل کو پسند کرتے ہیں جس کی پاداش میں وہ جنت سے نکالا گیا اور پھر اس نے اس زمین کو جنت بنا دیا۔ اقبال نہ صرف اس ادا کو پسند کرتے ہیں بلکہ مسلسل انسان کو للکارتے ہیں کہ یہ آفاق انسان کی ذات میں گم ہے۔ اس کو شاعرانہ انداز میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں :

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

وہ تخلیق کائنات کا سبب انسان کو ہی مانتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اس کائنات کا وجود کوئی اتفاقی نہیں اور نہ ہی اس لامحدود کائنات میں انسان کی حیثیت ایک ذرہ کے برابر ہے بلکہ وہ انسان ہی کو سب سے بڑھ کر مانتے جانتے ہیں :

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

اس دنیا میں انسانی کارناموں کی اتنی جہتیں اور پرتیں ہیں کہ ان پر تفصیل میں جانا ایک چھوٹے سے مقالے میں ممکن نہیں۔ یہاں میں ان کی آفاقیت پر چند باتیں اور کروں گا جس کا مرکز و محور انسان ہے اور اس کی آزادی ہے۔

اقبال کی فکر میں مذہبی افکار و آثار ضرور کارفرما ہیں لیکن انسان کی تعظیم و تکریم، آزادی اور خود مختاری اور اس کی خلاقانہ پرواز میں وہ کسی رکاوٹ کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھے خواہ وہ رکاوٹ مذہبی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جذبہ اقبال کے یہاں ابتدا سے ہی تھا جب وہ پورے طور پر مسلمان بھی نہ ہوئے تھے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھیے :

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

Guess you like
80
of 428

81.0KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کا ترستی ہے زباں میری

یا ان کا یہ بہت مشہور شعر :

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اس طرح کے بہت سے اشعار ان کی جرأتِ فکر اور آزادیِ خیال کے حوالے سے سامنے آتے ہیں اور ان کی فطری آزادی، انسانی عظمت، حریت و حمیت کا پتہ دیتے ہیں جس سے مذہب کا دور دور کا واسطہ نہیں۔ اب ذرا ان کی زندگی کے آخری دور کی ایک تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو یکم جنوری 1937ء میں لاہور ریڈیو سے نشر ہوئی تھی :

"دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر و ناز بجا حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پنہائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان کتابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر، حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا..... دراصل انسانیت کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کریں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔"

انسانی عظمت و آفاقیت کا اس سے بڑا دردمندانہ اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان کی بلند و بالا تصویر وہ آئینۂ اسلام میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ مذہب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک مضمون

81
of 428

35.4KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

میں انھوں نے اس نوع کا نظریہ بھی پیش کیا :

''جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے، اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تجزیاتی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر خالص انسانی خمیر کی تخلیق کرے۔''

اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسیحیت کی ہی تعلیم سے دین انفرادی اور پرائیوٹ ہوگیا تھا۔ کچھ معاملوں میں وہ ہوتا بھی ہے لیکن اقبال اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ صاف کہتے ہیں دین قومی ہے نہ ذاتی بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام امتیازات کے عالم بشریت کو متحد کرنا، منظم و مزین کرنا۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس میں عالم انسانی کی زندگی، اس کے جذبات و افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے اور یہی تصور ان کے تصور وطن اور تصور آزادی سے بھی منسلک ہوجاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے اسلامی ممالک کی آزادی کی زیادہ فکر کی اور یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے لیکن جلد ہی ان کی آفاقی نظر اور عالم گیر نظریہ بنی نوع انسان تک پہنچا دیتا ہے پھر ان کی نظر میں مکمل کائنات سما جاتی ہے۔

دنیا کے بڑے بڑے ادیبوں و شاعروں نے تہذیب و ثقافت اور روایت پر ایمان و ایقان ظاہر کیا ہے۔ روایت سے متعلق ایلیٹ کے مضمون نے یورپ میں دھوم مچادی۔ اقبال بھی ان امور پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اشتراکیت کو بھی پسند کرتے ہیں اور ''ضرب کلیم'' میں اشتراکیت کے عنوان سے نظم بھی کہتے ہیں۔ کارل مارکس کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ اشتراکیت، غریب اور زیردست اقوام اور عوام کا زبردست کوئی احتجاج ہے۔ وہ اس پر تنقید بھی کرتے ہیں کہ صرف روٹی ہی انسان کی واحد ضرورت نہیں۔ روٹی کے علاوہ ذہنی نفسیات اور روحانی اطمینان و سکون بھی انسان کے لیے درکار ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شکم سیری کے بعد ارفع و اعلیٰ مقصد کی تسکین بھی

Guess you like

82
of 428

80.1KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے اس خیال سے اشتراکی مفکرین کو اختلاف تھا اور رہے گا۔ ممتاز حسین کے اختلاف کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔

اقبال کی ان باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ اختلاف تو اشتراکیت کے بعض پہلوؤں سے بھی کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اختلاف ایسی کوئی بری شے نہیں۔ یہ زندگی، فکر اور تخیل کی علامت ہے۔ بقول سردار جعفری :

اختلافات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک رائے ہے دشنام نہیں ہے اے دوست

ہر بڑے شاعر کے یہاں تضادات ہوتے ہیں اور توہمات بھی۔ پیچ و خم بھی، کیف و کم بھی۔ ہر بڑی فکری شاعری کا یہ فطری عمل ہوا کرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، انسان کی بے قراری اور شرانگیزی، شاعر کی تخلیق کاری اور وہ بھی مفکر شاعر کی شاعری، قوموں کی بے حسی اور انسانی خاموشی کے تئیں اضطراری اور اجتہادی کیفیت اختیار کر لیتی ہے اور خود شاعر اپنے اندر کے بے دار طوفان اور انسانوں کے خوابیدہ امکان کے بھنور میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ پھر اقبال جیسا شاعر جو اجتماعیت، یکسیریت اور حرکت و حرارت میں یقین رکھتا ہو، وہ خواب اور حقیقت، آرزو و جستجو کی ملی جلی فضا میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنی حقیقت سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے :

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

.....

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

ان اشعار میں پوشیدہ جذبہ و معنی کو آپ عاجزانہ اعتراف کہہ سکتے ہیں یا شاعرانہ پروازِ تخیل یا یہ کہ اقبال شاعر پہلے تھے، مفکر بعد میں۔ ان تمام نزاکتوں و پیچیدگیوں

Guess you like

83
of 428

39.2KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

کے باوجود اقبال کی عظمت و آفاقیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اگر اس کی سالمیت پر کسی قسم کا شبہ ہے تو پھر کسی بھی فکر و فلسفہ کو محدود و مشروط نگاہوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال حقیقت میں عالم گیر شاعر ہیں۔ ان کا وطن صرف ہندوستان نہیں بلکہ پوری کائنات ہے۔ ان کا مخاطب صرف مسلمان نہیں بلکہ بنی نوع انسان ہے۔ وطنیت، مذہبیت ان کے نزدیک انسان کو بے دار کرنے، منظم و مہذب کرنے کا ایک نعرہ ہے۔ ایک طریقۂ کار جو آگے بڑھ کر فلسفہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال اپنی تعلیم اور اپنے افکار کے لیے کسی خاص قوم تک اپنے آپ کو محدود نہیں کرتے، ان کا خطاب پورے انسانوں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے علاوہ رام، نانک اور دوسرے سرداران قوم سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں نیطشے، گوئٹے، برگساں، ہیگل، مارکس، حافظ، سعدی، رومی، غالب وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں اور سبھی کو اپنے فکر و خیال اور شعر و سخن میں جذب کرتے ہیں اور سبھی کردار و واقعات کا طرح طرح سے ذکر بھی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں پنڈت، مولوی، کسان اور عام انسان سبھی نظر آتے ہیں اور اگر مسلمان بھی نظر آتا ہے یا مسلمان زیادہ نظر آتا ہے تو میں اسے ہرگز غلط بات نہیں سمجھتا۔ اس بات پر اعتراض کرنے والوں کو یہ بات جاننی چاہیے کہ اپنے مذہب یا علاقہ، زبان یا کلچر سے محبت کرنا اور اس تناظر میں شاعری کرنا بری بات تو ہے ہی نہیں۔ فطری اور عمدہ بات ہے۔ بشرطیکہ فن کار کا وژن اور فکر بلند ہو۔ مقامیت و مذہبیت کبھی آفاقیت کی مخالف نہیں ہوتی بلکہ اس کی معاون ہوتی ہے۔ آپ جہاں کے ہیں، اگر وہیں کے نہیں ہیں تو پھر آپ کہیں کے نہیں ہیں، دنیا کی بڑی تخلیقات مقامی ثقافت میں ہی رچ بس کر پرواز بھرتی ہیں اس لیے کہ ان کی قدریں عالمی ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو اپنے محلہ، شہر اور وطن سے پیار نہیں، اگر آپ کو اپنی اولاد، عزیز اور پڑوسی سے پیار نہیں تو پھر آپ دنیا کے انسانوں سے پیار کس طرح کریں گے۔ ایسے میں آپ کی آفاقیت ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھی جاتی رہے گی۔ پریم چند، ٹیگور بھی آفاقی فن کار ہیں لیکن

Guess you like

84
of 428

17.0KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

وہ اس سے بھی پہلے ہندی اور بنگلہ سماج کے ادیب و شاعر ہیں۔ آفاقیت ہوا میں چھلانگ نہیں لگاتی بلکہ مقامیت کے بنیادی حوالوں اور قدروں میں شرابور ہو کر اپنے بال و پر وا کرتی ہے اور پرواز بھرتی ہے۔ اس کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے بھی نظر چاہیے۔

علی سردار جعفری نے اقبال شناسی لکھتے وقت ابتدا ہی ان جملوں سے کی تھی جس پر میں اپنے مضمون کو ختم کر رہا ہوں :

"اقبال مسلم بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں ایشیائی بے داری بھی شامل ہے۔ اقبال ہندوستان کی بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں پوری تحریک آزادی شامل ہے اور اقبال عالم انسانیت کی بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں اشتراکیت کی فتح اور کارل مارکس اور لینن کے افکار کی عظمت شامل ہے۔ اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں کرتی بلکہ میرے نزدیک اس کی توثیق اور توسیع کرتی ہے کیوں کہ ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بے داری عالم انسانیت کی بے داری کا ایک حصہ ہے۔ اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔"

(دیباچہ)

❖❖❖

Guess you like

85
of 428

88.5KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ڈاکٹر خالد ندیم (سرگودھا، پاکستان)

فیضؔ کی اقبالؔ فہمی

فیض کے آغازِ شعور میں علامہ اقبال کی شہرت کا دائرہ ہندوستان کی سرحدوں کو عبور کر کے مشرق و مغرب تک پھیل چکا تھا؛ ایسے میں فیض کا اقبال سے متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔[1] یہ وہ دور تھا، جب اختر شیرانی و حفیظ جالندھری کی نغمگی، حسرت موہانی کا تغزل اور جوش کی انقلابی لے نوجوان نسل کو کسی نہ کسی طور متاثر کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ میراجی اور راشد کی سرگوشیاں بھی محسوس کی جا رہی تھیں۔ فیض ان سب آوازوں کو بغور سن رہے تھے، لیکن ان کی پہلی شعری توجہ کا مرکز اقبال بنے؛ چنان چہ اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران (1931ء میں) گورنمنٹ کالج، لاہور میں منعقدہ ایک مشاعرے میں 'اقبال' کے عنوان پر انعامی مقابلے کے لیے فیض نے بھی ایک نظم لکھ کر اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ نظم بعد ازاں گورنمنٹ کالج کے ادبی مجلے راوی میں 'اقبال' کے عنوان سے شائع ہوئی:

Guess you like

86
of 428

2.93KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ ویراں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خودفراموشی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریاں تک آسماں پرواز کرتے تھے
یہ خاکی زندہ تر ، پائندہ تر ، تابندہ تر نکلے

نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے

Guess you like

87
of 428

56.0KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

ہر ایک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک ذرّے کو ہم دوشِ ثریا کر دیا تو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

پروفیسر علی احمد فاطمی کے خیال میں اس [نظم] سے اقبال کی عظمت پر روشنی پڑتی ہی ہے، خود فیض کے شعور فکر و فن کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔[2] نظم کا تانا بانا، ردیف و قافیہ، تراکیب اقبال اور فیض کے فکری رشتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس نظم کو محض ابتدائی اثر پذیری کہہ کر فراموش کیا جا سکتا تھا، اس لیے بھی کہ یہ نظم بعد میں ان کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہ ہو سکی؛ لیکن فیض اپنے بعض بیانات اور تحریروں میں تسلسل کے ساتھ اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔

اقبال کی زندگی میں ان پر تین قسم کے اعتراضات کیے گئے۔ اوّل اوّل اہل زبان نے ان کے زبان و بیان پر گرفت کی اور بعد میں ان کے افکار پر تنقید کی جانے لگی، لیکن جب کسی صورت بات نہ بنی تو اقبال کی شخصیت کو بھی ہدفِ تنقید بنایا جانے لگا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل سے بھی ایک سال قبل ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنے معروف مقالے 'ادب اور زندگی' میں اقبال کو فاشسٹ قرار دیتے ہوئے ان کے بعض خیالات پر سخت تنقید کی[3] اور 1943ء میں 'اردو ادب کے جدید رجحانات' میں ترقی پسند تحریک کے فروغ میں اقبال کی رحلت کو اہم واقعہ قرار دیا۔[4] پھر تو ہر ترقی پسند نقاد اقبال پر اعتراض کو اپنا فرض اوّلین سمجھنے لگا۔ ان حالات میں فیض سب سے الگ اور منفرد ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت کی داد دینا پڑتی ہے، کیوں کہ دیگر ترقی پسند ناقدین کے برعکس،

Guess you like
88
of 428

50.7KB/s 6:30 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

وہ ایک ہی فکری جست سے اوائل جوانی ہی میں اعتراف اقبال کی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ ''روزگار فقیر'' کے پیش لفظ میں انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ علامہ اقبال ہمارے دور کے سب سے اہم اور سب سے عظیم المرتبت شخصیت تھے[۴]؛ بلکہ انھوں نے اقبال کی وفات پر ایک نظم کے ذریعے انھیں خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ یہ جذباتی یا فرمائشی قسم کی نظم نہیں تھی، بلکہ فیض نے اسے اپنے اولین مجموعہ کلام ''نقش فریادی'' میں شامل کرنا بھی ضروری خیال کیا۔ فیض لکھتے ہیں:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران سے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں، جو اس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اُس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اُس کی لَے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلۂ جوالا تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز

Guess you like
89
of 428

2.40KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمع بزمِ صبح کی آمد سے بے خبر

حیرت ہے، ریاض قدیر کو ان نظموں میں اقبال کی شخصیت سے فیض کی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں ملا اور وہ فیض کی ان نظموں کو اقبال کی قومی اور شعری خدمات کے لیے رسمی خراجِ تحسین سمجھتے ہیں[6]۔ علی احمد فاطمی کے خیال میں، یہ نظمیں ہرگز رسمی نہیں اور اقبال سے متعلق فیض کی نظموں اور مضامین میں سچے جذبہ فکر کا مخلصانہ اور دانش ورانہ احساس و اظہار ملتا ہے۔[7] دوسری طرف، پروفیسر عبدالحق نے اقبال کی شخصیت، فکر اور پیغام کے برملا اعتراف اور مخصوص ذہنی رویے کے باوصف بے پایاں عقیدت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے فیض کی وسعتِ نظر اور قلب و ذہن کی طہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔[8]

ہمارے ہاں یہ اندازِ نظر قدیم سے ہے کہ کسی فن کار کی عظمت کو دوسرے کی مذمت سے مشروط سمجھا گیا ہے۔ اس رویے نے محمد حسین آزاد کے ہاں آ کر عملی صورت اختیار کر لی اور پھر شبلی نعمانی نے اس روایت کو یوں کمال تک پہنچا دیا کہ انیس کے مقابلے میں دبیر چاروں شانے چت ہو گئے۔ دیگر ترقی پسند ناقدین کی طرح مجنوں گورکھ پوری بھی ترقی پسندوں کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ اقبال کو مسترد کرنا ضروری خیال کرنے لگے تھے؛ چنان چہ ان کی شاعری میں عقاب، شاہین، شہباز اور چیتے کی علامات کو دیکھ کر وہ یہ سمجھے کہ اقبال انسان میں بھی، بالخصوص 'مردِ مومن' میں ان ہی پھاڑ کھانے والے جانوروں کی خصلت دیکھنا چاہتے ہیں،[9] حالاں کہ فیض کے خیال میں، یہ خارجی وارداتیں نہیں ہیں، بلکہ وہ خالصتاً ایسے نشانات ہیں، جن کی مدد سے اقبال داخلی احساسات کی وضاحت کرتا ہے، ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ اقبال کو عقاب اور شاہین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے خیال میں اس نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ عقاب کیسا نظر آتا ہے۔ اسے جگنو، عقاب، چاند اور سورج میں کوئی دلچسپی نہیں، وہ شاعر کے لیے خارجی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ بعض مضامین کی تشریح کے لیے نمونہ جات ہیں۔[10] گویا شاہین یا عقاب کا تعلق 'مردِ مومن'

Guess you like
90
of 428

29.2KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

کی بعض خصوصیات کی تشریح و تفسیر سے ہے۔ مردِ مومن اور انسانِ کامل کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی کا اظہار اقبال کے لاتعداد اشعار میں ملتا ہے، تاہم یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے ہاں شخصیت کو پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ اس سلسلے میں اقبال اپنے انگریزی خطبے میں لکھتے ہیں:

> *"The idea of personality gives us a standard of value --- that which fortifies personality is good, that which weakens it is bad. Art, religion and ethics must be judged from the standpoint of personality."* [11]

چوں کہ شخصیت کے فروغ و توانائی کا انحصار معاشرتی روابط پر ہوتا ہے، چنان چہ ایک مقام پر پہنچ کر، بقول فیض: اقبال کا انسانِ کامل نیٹشے کے فوق البشر سے مختلف ہو جاتا ہے؛ اس لیے کہ اقبال کے حتمی فیصلے ہر قسم کے قومی تعصبات، استعماری مقبوضات، نسلی امتیازات، معاشرتی استحصال اور ذاتی اغراض کے سراسر خلاف ہیں۔ [12]

ہر بڑا شاعر ماضی کے شعری سرمایے سے اثرات قبول کرتا ہے اور مستقبل کے منظر نامے پر نقش مرتسم بھی کرتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ عظیم شعرا کے اعتراف سے شاعر کی عظمت میں کمی واقع نہیں ہوا کرتی۔ اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ میر کی عظمت ہر دور کے شعرا نے تسلیم کیا ہے، حتیٰ کہ غالب جیسے عظیم شاعر کے ہاں بھی میر کا اعتراف موجود ہے۔ پھر اقبال کے ہاں غالب کے رنگ و آہنگ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اب، بقول پروفیسر عبدالحق، اقبال کے ادبی اقدار کو صدقِ دل سے قبول کیے بغیر چارہ نہیں: خواہ وہ کسی گروہ یا کسی قبیل کے شاعر ہوں۔ ان کے خیال میں فیض کی عظمت بھی یہی ہے کہ انھوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا اور اسے اچھی طرح برتا اور اپنے فن کی بالیدگی کو نئے جہات سے روشناس کر کے اسے تابندگی بخشی۔ [13]

Guess you like

91
of 428

94.8KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

فیض کے شعری لب و لہجے اور بیانات میں اتنا پسندی کبھی راہ نہ پا سکتی؛ چنان چہ اُس دور میں بھی، جب ترقی پسند ناقدین اقبال کی شخصیت اور افکار پر جا و بے جا اعتراضات کر رہے تھے، فیض ان سے الگ تھلگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک محفل میں جب احمد ندیم قاسمی نے اقبال کو رجعت پسند قرار دے کر شدید تنقید کا نشانہ بنایا تو فیض نے قاسمی صاحب کے نقطۂ نظر کو مسترد کر دیا۔[14] ایک دوسرے موقع پر، فیض کی موجودگی میں کچھ حضرات ایک محفل میں اقبال پر طعن و تشنیع کر رہے تھے، بلکہ تجویزیں پاس کر رہے تھے، فیض کو اتنا ناگوار گزرا کہ اٹھ کر چلے آئے۔[15] پروفیسر عبدالحق کے خیال میں یہ صرف اقبال کی توہین یا تحقیر نہ تھی، بلکہ اقبال کے اس لازوال فن کی اہانت تھی، جو قوموں کی تقدیر بدل سکتا ہے۔[16]

فیض نے نظریہ ادب کی حد تک اقبال کو ترقی پسند قرار دیا، کیوں کہ اقبال نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا کام خوب صورت نظمیں اور گیت لکھنا ہی نہیں ہے، بلکہ زندگی کے عوامل اور مشاہدات کو موضوع بنانا بھی ہے[17]؛ لیکن ساتھ ہی اقبال کی شاعری کو ان کے نظریۂ ادب، موضوعِ سخن اور شاعری پر سیاسی و سماجی اثرات کے پس منظر میں ترقی پسند یا رجعت پسند قرار دینے کی تجویز بھی پیش کر دی۔ آلِ احمد سرور نے اس مطالبے کو نامناسب قرار دیتے ہوئے اقبال کی ساری فکر کو پیشِ نظر رکھنے پر زور دیا ہے۔[18]

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے خیال میں کہ فیض، اقبال کے اس تجزیے سے پوری طرح متفق تھے کہ کوئی دین اور نظریہ صرف اسی وقت پامال ہوتا ہے، جب اس کی عہد بہ عہد توسیع سے منہ موڑ لیا جائے،[19] چنان چہ ہم دیکھتے ہیں کہ فیض نے ترقی پسندی کو کسی جامد نظریے کے طور پر قبول نہیں کیا، بلکہ انھوں نے زمانی و مکانی اعتبار سے معروضی نقطۂ نظر اپنایا اور کئی مواقع پر پارٹی لائن کو نظر انداز کیا۔

فیض کا شمار اردو کے عظیم شعرا میں تو ہوتا ہی ہے، لیکن ان کی عزت و شہرت میں ان کی دانش وری بھی نمایاں ہے اور چوں کہ وہ شعر و سخن کی دنیا میں حکمت و دانائی اور فکر و فلسفے کی اہمیت کے قائل ہیں، اس لیے وہ کولرج کا یہ بیان دہراتے ہیں:

Guess you like
92
of 428

94.8KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

"No man was ever yet a great poet without being at the same time a great philosopher." [20]

اس سلسلے میں وہ رومی، سعدی، حافظ، خسرو اور غالب جیسے عظیم مسلمان شعرا کے ساتھ اقبال کا نام بھی لیتے ہیں؛ تاہم اس امتیاز کے ساتھ کہ:

''عہد وسطیٰ کے پیش روؤں کے برعکس محض یہ نہیں کہ انھوں نے فلسفے کے مختلف مدرسہ ہائے فکر کا، جس میں قدیم و جدید دونوں شامل ہیں، بنظر غائر مطالعہ کیا تھا، بلکہ وہ ایک سے زیادہ زبانوں میں ایسا نثری سرمایہ بھی رکھتے ہیں، جس میں منطقی اختصار کے ساتھ ساتھ انھوں نے حقیقی دنیا کے مسائل کا اپنا حل پیش کیا ہے۔'' [21]

فیض اردو ادب کے کلاسک کا احترام کرتے ہیں، لیکن سرمایہ دارانہ استبداد اور بڑھتی ہوئی طبقاتی خلیج کے باعث تغیر پذیر عالمی و سماجی منظر نامے میں ترقی پسند نظریات کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے مرض کی صحیح تشخیص کی تھی اور ان کا تجویز کردہ علاج بھی صحیح تھا، لیکن اس اعتراف سے بھی انھیں عار نہیں کہ ان [ترقی پسندوں] میں غالب، اقبال یا نذیر احمد کے پائے کا کوئی ادیب نہیں تھا، جو اس نئے گھروندے کا گھر بنا سکتا۔ [22]

اقبال سے فیض کی عقیدت کا اظہار منظوم خراج عقیدت اور بعض مضامین کے علاوہ کلام اقبال کے ترجمے کی صورت میں بھی ہوا ہے۔ 1977ء میں اقبال صدی کے موقع پر اقبال اکادمی پاکستان کی دعوت پر فیض ''پیام مشرق'' کے منظوم اردو ترجمے کے لیے تیار ہو گئے۔ آغا ناصر اور احمد فراز کو ناگوار گزرا، لیکن فیض ترجمے کو تخلیقی سرگرمیوں سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ فیض کا خیال تھا کہ پیام مشرق میں ہمارے مطلب کی شاعری ہے، لہٰذا اس کا اردو ترجمہ ضرور ہونا چاہیے۔ [23]

کہنے کو تو فیض نے اپنے دوستوں کو خاموش کرا دیا، لیکن جب ترجمہ ہوا تو 'ہمارے مطلب کی شاعری' اس میں شامل نہیں تھی۔ 'کارل مارکس'، 'تالستائے'، 'ہیگل'، 'نیٹشے'،

Guess you like
93
of 428

49.2KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

'محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسنس کومٹ و مرد مزدور'، 'جلال و گوئٹے'، 'موسیولینن و قیصر ولیم'، 'قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور' کے علاوہ حکما اور شعرا پر مختلف نظموں پر مشتمل پیام مشرق کا حصہ 'نقش فرنگ' فیض نے نظر انداز کر دیا تھا۔

انتخاب پیام مشرق کی اشاعت (1977ء) کے ایک برس بعد جب فیض نے اپنا شعری مجموعہ ''شام شہر یاراں'' مرتب کیا تو اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس کے سرعنوان کے لیے اسی کتاب سے ایک شعر منتخب کیا:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است [24]

درج بالا گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی عظمت کا اعتراف فیض کی جوانی سے ان کی فکری پختگی تک، بلکہ فن کارانہ عروج کے دور تک پھیلا ہوا ہے۔

برعظیم میں فکری بحران سے نکلنے کی پہلی کوشش کا احساس 1857ء کے بعد ہوتا ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی اور مسلم دنیا کی زوال پذیری کے دور میں مسلمان دو شدید رویوں کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف مصلحت پسند سیاسی رہنما تھے تو دوسری جانب قدامت پسند علما۔ ان کے برعکس نئی دانش کے پس منظر میں اقبال کا نقطۂ نظر دونوں انتہاؤں کے برعکس اعتدال پسندی سے عبارت رہا۔ اقبال کے اس رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے فیض لکھتے ہیں:

''یہ دونوں آوازیں نئے دانش ور طبقے کے لیے کوئی اپیل نہ رکھتی تھیں۔ شاعر اقبال اُن کی ناآسودگی کے سوتوں سے کماحقہٗ واقف تھے اور مفکر اقبال اُن کے اس فکری اور روحانی کرب کی ماہیت کو خود سمجھتے تھے، جو جدیدیت اور روایت کے دیوان کی کلائیوں کو گرفت میں لے کر مختلف سمتوں میں کشاکش سے پیدا کر رہے تھے۔ وہ دونوں سے ذہنی و جذباتی اُنس رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ہندی مسلمانوں، مسلمانانِ عالم اور ..... خدا، انسان

Guess you like
94
of 428

49.7KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اور فطرت کی نگہوں سے متعلق عصری مسائل کے جوابات تلاش کر لیے۔"[25]

فیض کے خیال میں، اقبال فرد میں جرات، حق شناسی، ایمان کی پختگی اور مخالف ماحول سے نبرد آزما ہونے کا عزم ابھرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، چنان چہ وہ اقبال کے شاعرانہ کمالات کے ساتھ ساتھ ان کے اس خیال سے بہت متاثر ہوئے کہ انسان اپنے اندر بے پناہ قوتیں رکھتا ہے اور تمام عظمتیں اسی کے لیے ہیں۔[26] آل احمد سرور نے عظمت آدم کے فلسفے کی وجہ سے اقبال کو ہیومنسٹ قرار دیا[27] تو فیض نے اقبال کے ارتقائی سفر کی مزید اگلی منزلوں کی نشان دہی کی ہے:

"ابتدائی کلام میں، جوانی کے ایام کے کلام میں، اقبال کی توجہ اپنی ذات پر ہے؛ وہ اپنے بارے میں لکھتا ہے، اپنے عشق کے بارے میں، اپنے غم کے بارے میں، اپنی تنہائی کے بارے میں، اپنی مایوسیوں کے بارے میں۔ پھر بانگ درا کے دوسرے نصف حصے میں وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر مسلمان قوم اور مسلم دنیا کے بارے میں لکھتا ہے۔ مسلم دنیا سے آگے بڑھ کر وہ نوع انسان اور نوع انسان سے آگے چل کر وہ کائنات کی بات کرتا ہے۔"[28]

فیض کی مندرجہ بالا رائے کے بعد ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا یہ کہنا ..... 'اقبال کا عشق ہندو پاک کی ملت مسلمہ کا درد لیے ہوئے ہے؛ فیض نے اپنے درد کو ملت مسلمہ تک محدود نہ رکھا، بلکہ اسے پورے عالم انسانیت کا درد بنا کر پیش کیا اور یہ ایک طرح سے طرح اقبال میں، جو خود اقبال کے لیے طرح نو تھی، اضافہ ہے[29]' ..... درست نتیجہ فکر نہیں، کیوں کہ فیض کے خیال میں تو آفاقی طریقے سے سوچنے کا ڈھب اور اس کو سوچنے کی ترغیب ہمارے ہاں اقبال نے پیدا کی ہے[30] اور پھر ذہنی و جذباتی سفر کے آخری مقام پر انسان اور کائنات، خالق اور مخلوق، ورا اور ماورا کے حقائق ہی اقبال کے ہاں موضوع شعر ٹھہرتے ہیں۔[31]

سرور نے مذہب کو اقبال کے فکر کا مرکز قرار دیا ہے؛[32] لیکن یہ امر پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اقبال کے یہاں مذہب محض عقائد و عبادات کا نام نہیں، بلکہ حرکت و عمل سے

95 of 428

47.2KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

عبارت ہے، چنان چہ انھوں نے آخرت یا جزا و سزا کی نسبت کارزارِ حیات میں جہدِ مسلسل پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کی وجہ، بقول فیض، یہ ہے کہ اقبال شاعر ہے جدوجہد کا، فطرت کی حریفانہ قوتوں کے خلاف انسان کی جنگ کا؛ ان قوتوں کے خلاف جنگ کا، جو روحِ انسانی کی دشمن ہیں۔[33]

فیض نے ایک اور مقام پر مذہب سے متعلق اقبال کے رویے پر روشنی ڈالی ہے:

''ایسے روایتی صوفی سے، جو موجودہ دنیا کو واہمہ اور انسان کے دنیوی عمل کو کارِ لاحاصل سمجھ کر اُسے رد کر دیتا ہے، اقبال کنارہ کش ہو جاتے ہیں؛ مگر وہ متشرع فقیہوں اور ان کی جامد و ساکن مصلحت کو بھی پوری قوت سے رد کر دیتے ہیں۔''[34]

.....

کسی فن کار کی عظمت کا انحصار روایت کی پاس داری سے زیادہ عصری مطالبات کے پیشِ نظر روایات کی از سرِ نو تشکیل پر ہوتا ہے۔ بہت سے دیگر مفکروں کی طرح اقبال کے ذہنی سفر کے دوران بھی خیالات میں تفاوت کا در آنا خارج از امکان نہیں؛ لیکن فیض، بظاہر دکھائی دینے والے تضادات کو اقبال کے ارتقا کی منزلیں قرار دیتے ہوئے[35] خیالات کے منطقی ربط، فطری ارتقا اور ایک نظامِ فکر کو ان کی شاعری کا اہم ترین پہلو گردانتے ہیں[36]؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اقبال کے عہد بہ عہد نظریات میں اختلاف تو پاتے ہیں، تناقض نہیں۔[37]

یہ درست ہے کہ اقبال کے ابتدائی اسلوب پر داغ کی سلاست اور غالب کا شکوہ محسوس کیا جا سکتا ہے، لیکن آگے چل کر اقبال جذبات و احساس کی جگہ خیالات و تصورات کو شاعری کی سطح سے رُوشناس کرانے والے تھے۔ اس ضمن میں فیض نے فکر و خیال کے اعتبار سے اقبال کے بدلتے ہوئے شعری لب و لہجے، لغت، علامتوں، استعارات اور اصنافِ سخن کی نشان دہی کی ہے۔[38]

''اس سلسلے میں فیض نے اسلوبِ اقبال کی دو خصوصیات کو اہم قرار دیا ہے:

96
of 428

57.0KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

1- ایک تو یہ کہ اقبال نے تازہ خیالات و افکار کو شامل کر کے اردو شعری روایت کے فرسودہ اور بے جان استعارات و تشبیہات میں جان ڈال دی۔

2- بے رنگ اور دقیق خیالات کو اس بے ساختگی سے ادا کیا کہ مضمون اپنی وقعت اور اجنبیت کے باوجود غالب کے شعر سے زیادہ رنگین معلوم ہونے لگتا ہے۔ [39]

اقبال کے اسلوب پر فیض کے تبصرے کے بعد اسلوب فیض سے متعلق پروفیسر عبدالحق کی یہ رائے نہایت وقیع محسوس ہوتی ہے، جس کے مطابق: اقبال کی طرح فیض نے قدیم شعری تلازموں، رمز و کنایات، تلمیحات و اشارات میں ایک نیا مفہوم اور نئی فکر، نئے اسالیب و اظہار کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس کی وجہ سے پرانی اصطلاحوں یا الفاظ میں عہد جدید کے نئے مفاہیم نے ہماری شاعری کے افق کو بلند تر کیا ہے۔ [41]

اقبال کی ہاں جذبے کو بتدریج غیر مرصع اسلوب میں بیان کیے جانے کا رجحان ملتا ہے۔ اس غیر مرصع اسلوب کے باوجود اقبال نے اپنے کلام کو کیسے وقعت دی؟ فیض اس سوال کے جواب میں تین وجوہ بیان کرتے ہیں:

1- ایک چیز، جو کلی طور پر اردو شاعری کو اقبال کا عطیہ ہے، وہ اسم معرفہ کا استعمال ہے: مثلاً کوفہ، حجاز، عراق، فرات، اصفہان، سمرقند، قرطبہ وغیرہ۔

2- ایسے الفاظ کا استعمال، جو سادہ تو ہیں، لیکن نامانوس۔ جو نہ مشکل ہیں، نہ متروک! صاف شفاف الفاظ، لیکن جو پہلے استعمال نہیں کیے گئے۔

3- نامانوس بحر، مثال کے طور پر مسجد قرطبہ کی بحر۔ اقبال کے ہاں کم از کم چھ ایسی بحریں ملتی ہیں، جو اس سے قبل اردو شاعری میں مستعمل نہیں تھیں۔ [41]

ان حربوں کے علاوہ اقبال اپنی لفظیات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ خود ان کے صوتی اثرات شعر میں نغمگی پیدا کر دیتے ہیں اور بقول فیض:

"کان اس نغمگی کو بار بار سننے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور زبان انھیں بے ساختہ دہراتی ہے۔" [42]

97
of 428

96.9KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اگرچہ فیض نے اقبال کی فکر کو اُن کے خطبات اور غنائیت کو اُن کی شاعری میں تلاش کیا ہے[43]؛ لیکن علی احمد فاطمی کے خیال میں، اقبال کے یہاں خطابت زیادہ ہے تو فیض کے یہاں غنائیت، جو فیض کی ایک مخصوص شناخت قائم کرتی ہے[44]؛ حالاں کہ فیض خود کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک شاعری میں semsbuity، زبان پر عبور اور غنائیت کا تعلق ہے، ہم ان کی خاک پا بھی نہیں۔[45] ایک انٹرویو میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تُفنگی، موسیقی اور شعریت کے اعتبار سے بالِ جبریل اقبال کا شاہ کار ہے۔[46]

اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے فیض نے درست نتیجہ اخذ کیا ہے کہ صرف یہی اسٹائل اس حتمی موضوع سے مطابقت رکھتا ہے، جو اقبال نے اپنے طویل شعری سفر میں اپنایا۔[47] بہ اعتبارِ مضامین، اقبال کے غنائی دور میں فیض کو تین اجزا کی نشان دہی کی ہے:

1- عنفوانِ شباب کے عاشقانہ جذبات،
2- مناظرِ فطرت،
3- حب وطن اور قومیت کا احساس۔[48]

.....

فیض اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ:

"اکثر اقبال شناسوں نے اقبال کے فلسفیانہ عقائد اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر زورِ قلم صرف کیا ہے، لیکن کلامِ اقبال کے آئینے میں ان کی ذات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔[49]

ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی نظر سے دنیا کو بہت سے لوگوں نے دیکھا، اقبال کی نظر سے اقبال کا مطالعہ کسی نے نہیں کیا،[50] حالاں کہ فلسفیانہ موضوعات کی طرح اپنی ذات بھی ان کی شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے اور ان کے کلام کا کوئی دور اس موضوع سے عاری نہیں۔[51] فیض کے خیال میں، کلامِ اقبال میں سب سے پُرخلوص اور دل گداز جزو وہی ہے، جس کا تعلق اقبال کی ذات سے ہے، کیوں کہ یہ حصہ فلسفہ و خطابت کی نسبت جذبہ و احساس کی شدت سے مملو ہے اور اس کلام پر اقبال کی حکیمانہ بزرگی کے بجائے

98
of 428

96.9KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ان کی شاعرانہ عظمت کا انحصار زیادہ ہے۔[52]

اقبال شناسی کے ابتدائی برسوں میں ان کے شعری محاسن اور سحر کی طرف ناقدین کی عدم توجہ کی ذمہ داری فیض نے شاعر پر عائد کی ہے، کیوں کہ اقبال کے کلام میں کئی بار قارئین کو اُن کی شاعری کو نظر انداز کرنے اور ان کے پیغام پر توجہ دینے کی تلقین کی گئی ہے۔[53]

یہ حقیقت ہے کہ وہ خود کو محض شاعر کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ فیض کہتے ہیں:

''اقبال نہیں چاہتے تھے کہ انھیں بڑے بڑے فنکاروں میں شامل کیا جائے، جن کی ہمارے یہاں بہتات ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس انداز کی صحت اور عدم صحت سے قطع نظر، اقبال کے پائے کا شاعر کسی نام سے بھی پکارا جائے، عظیم ہوگا۔''[54]

اقبال کی شاعرانہ عظمت بجا سہی، لیکن وہ خود شاعری کی نسبت اپنے تصورات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ اقبال نے اپنے دور کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پس منظر میں عالمی منظر نامے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں فیض، اقبال کو عالمی کلاسک کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں:

''تمام شاعران اثبات، مثلاً دانتے، ملٹن اور گوئٹے کی طرح اقبال بھی محض ہنر و فکر کے حامل نہیں ہیں، انھی کی طرح وہ بھی گرد و پیش کی معاشرتی دنیا کے معاملات میں بڑے انہماک سے شامل تھے۔''[55]

اگرچہ یہ کوششیں اردو کے دیگر شعرا کے ہاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں، لیکن عموماً ان کی شاعری میں تدبر و فکر کے بجائے تتبع یا غم و غصے کی کیفیت ملتی ہے[56]، یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات مؤثر جذبے کے فقدان کے باعث واعظانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں، جب کہ بقول فیض:

اقبال اُن معدودے چند شعرا میں سے ہیں، جو محض جذباتی خلوص کے بل پر ایک فلسفیانہ پیغام کو شاعری کی سطح تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔''[57]

99
of 428

50.6KB/s 6:31 49%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

دوسری جانب وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ:

''اگرچہ اقبال فلسفی، مفکر، قومی راہ بر اور مبلغ بھی تھے، لیکن جس نے ان کے پیغام کو اصل قوت اور دلوں میں گھر کر جانے کی صلاحیت بخشی، وہ ان کی شاعری ہی تھی۔''[58]

اس ضمن میں اقبال اور فیض کا موازنہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ:

''فلسفہ کو شاعری (اقبال) اور نعرہ کو شاعری (فیض) کس طرح بنایا جا سکتا ہے، یہ درس، یہ شعور دونوں کی شاعری سے ملتا ہے۔ ان کے خیال میں ایسا اس لیے ہے کہ دونوں آرزو، خواب، حقیقت اور حکمت کے شاعر ہیں اور دونوں ہی بہتر اور صحت مند معاشرے اور زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ ایک نے فلسفہ کو شاعری بنا دیا تو دوسرے نے شاعری کو فلسفہ۔''[59]

اقبال کے فلسفے میں ان کے تصورِ خودی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، چنان چہ اقبال کا تصورِ مردِ مومن ہو یا تصورِ وطن، تصورِ نسواں ہو یا تصورِ تعلیم، تصورِ معیشت یا تصورِ سیاست؛ تمام افکار ان کے اسی تصور کے گرد گھومتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے سفر کرتے ہوئے یہ تصورات تصورِ خودی تک پہنچتے پہنچتے بظاہر متضاد مقامات سے گزرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین ان کے ہاں تضاد، اختلاف یا تناقض کی نشان دہی کرتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہر عظیم فن کار کے پیغام کی کئی جہتیں، کئی پہلو اور کئی گوشے ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی بصیرت اور ظرف کے مطابق اس سے مستفیض ہوتا ہے؛ فیض کی رائے میں، اقبال کے کلام کے بارے میں بھی یہی ہے کہ قریب قریب ہر مکتبِ فکر ان کو سند کے طور پر استعمال کرتا ہے[60] اور ہر مکتبِ فکر اپنے عقائد اور نظریات کی تصدیق اور دوسرے مکتب کی تکذیب یا تنقیص کے لیے ان کا کوئی نہ کوئی مصرع یا شعر ڈھونڈ نکالتا ہے۔ ان ہی حالات میں فیض نے اقبال کو عہدِ حاضر کا سب سے مظلوم شاعر قرار دیا ہے،[61] تاہم ان کے خیال میں، کسی بڑے شاعر کے بارے میں مختلف و متضاد آرا سے اس کی عظمت میں فرق نہیں آتا، بلکہ اس کی تصدیق ہوتی ہے،[62] اسی لیے انھوں نے اقبال کو ایک ندی یا

100
of 428

50.8KB/s 6:31 48%
Allama Iqbal : Ha...

نہر سے تشبیہ نہیں دی، جو ایک ہی سمت کو بہے چلی جاتی ہیں، بلکہ انھوں نے اقبال کو ایک سمندر قرار دیا ہے، جو چاروں اور محیط ہوتا ہے،[63] چنان چہ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کو کسی تحریک کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک قدم پرانے وطن پرستوں میں ہے اور دوسرا قدم موجودہ ترقی پسندوں میں۔[64]

اس سلسلے میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ اقبال کے خیالات مسلسل ارتقا پذیر رہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے افکار و تصورات کے مطابق اسلوب اختیار کیا۔ فیض نے اقبال کے افکار اور اسالیب کے مابین ربط تلاش کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اقبال فن برائے فن کا شدید مخالف تھا، اس لیے ہم اس کے فن یا اسالیب یا تکنیک یا دوسرے شعری محاسن نفس مضمون سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ اس امر کے باوصف کہ اس کا اسالیب بتدریج بدلتا رہا، اس نے مختلف اسالیب اختیار کیے۔ یہ سارے اسالیب ان مضامین کے مطابق وضع کیے گئے، جو اقبال بیان کرنا چاہتا تھا، اس لیے اقبال کے اسالیب کا ارتقا اس کے فکر کے ارتقا کے متوازی ہے اور ان میں سے ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر کے مطالعہ کرنا نہ صرف ایک سطحی بات ہوگی، گمراہ کن بھی ہوگی۔''[65]

چنان چہ فیض نے اس موضوع پر تحقیقی کام کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ علامہ کی فکر نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، ان میں اور علامہ کے اظہار فکر میں کیا رشتہ اور قرب ہے اور یہ کہ ان میں کیا تبدیلیاں آئیں۔[66]

ہمارے ہاں بالعموم شعر و ادب کو تفریح، غنائیہ یا زیادہ سے زیادہ مذہبی ضروریات کے لیے استعمال کیا گیا اور شاعری کا اصلاحی کردار حالی کے بعد ہی متعین ہو سکا، جب کہ فیض کا خیال ہے کہ شعر میں فکر، شعر میں حکمت اور شعر میں عظمتیں، جن کو ہم شاعروں سے نہیں، فلاسفروں سے متعلق کرتے ہیں، وہ محض اقبال کی وجہ سے ہمارے ہاں پیدا ہوئیں۔[67] وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اقبال کے افکار کی وجہ سے ہی ہماری ذہنی زندگی میں وہ تیقن و تلاطم پیدا ہوا، جو اُن سے پہلے یا ان کے بعد کسی واحد مصنف، کسی واحد ادیب یا

101
of 428

46.3KB/s 6:31 48%

کسی واحد مفکر نے ہمارے اذہان میں پیدا نہیں کیا۔[68]

مندرجہ بالا گفتگو سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی شخصیت اور فن سے متعلق فیض کے خیالات میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ملتا اور یہ کہ اقبال سے اپنے فکری اختلاف کے اظہار کے لیے بھی انھوں نے نہایت شستہ انداز اختیار کیا۔ جہاں تک اقبال کی شخصیت کا تعلق ہے، فیض ساری زندگی انھیں خراجِ عقیدت اور خراجِ تحسین پیش کرتے رہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے وہ ہر قسم کے تعصبات سے دُور رہے اور یوں دیگر ترقی پسند ناقدین کے مقابلے میں ان کے ہاں ہمیشہ ایک اعتدال اور توازن قائم رہا۔

حواشی اور حوالے

1- فیض احمد فیض، الحمرا، الطاف حسن قریشی، مطبوعہ اردو ڈائجسٹ، اپریل 1964ء
2- علی احمد فاطمی، فیض اور اقبال، مطبوعہ ایوان اردو، اگست 2011ء، ص 6
3- ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ادب اور انقلاب، ص 79-87
4- ایضاً، ص 274
5- فیض احمد فیض، پیش لفظ، مشمولہ روزگار فقیر [اوّل]، ص 14
6- ریاض قدیر لکھتے ہیں کہ انھوں [فیض] نے اقبال پر جو دو نظمیں کہی ہیں، ان میں اقبال کی شخصیت کے ساتھ شاعر کی کسی جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں نظمیں اقبال کی قومی اور شعری خدمات کو رسمی خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ ("اقبال اور فیض: قربتیں اور فاصلے" از ڈاکٹر ریاض قدیر، مطبوعہ اقبالیات لاہور، جولائی 2009ء، ص 78)

مذکورہ مضمون کے حاشیے میں مصنف رقم طراز ہیں کہ "پہلی نظم، جو فروری 1933ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور میں اقبال کی آمد کے موقع پر پڑھی گئی، فیض کے زمانہ طالب علمی کی کاوش ہے۔ اس نظم کی فنی سطح اس قدر پست ہے کہ خود فیض نے اپنے کسی مجموعہ کلام میں اس نظم کو شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری نظم اقبال کی وفات پر لکھی گئی اور فیض کے اولیں مجموعہ کلام نقش فریادی میں 'اقبال' کے نام سے شامل ہے۔" (ایضاً، ص 92)

توجہ طلب بات ہے کہ پہلی نظم تو فنی سطح پست ہونے کی وجہ سے کسی مجموعہ کلام میں شامل ہو سکی، چنان چہ اس پر 'رسمی خراجِ تحسین' کی پھبتی کا جواز انھوں نے فراہم کر دیا، لیکن جس نظم کو فیض نے اپنے اولیں مجموعہ کلام میں شامل کیا اور پھر اس مجموعے کی آئندہ اشاعتوں میں کبھی اس کو نکالنے کی ضرورت محسوس نہ کی، اس کے 'رسمی خراجِ تحسین' ہونے سے متعلق فاضل مضمون نگار نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

Guess you like

Careem is MENA's #1 car booking app for a safe,

Careem
GET 50% OFF ON YOUR FIRST RIDE!
Use promo: RIDE50

37.5KB/s 6:31 48%

-7 علی احمد فاطمی، 'فیض اور اقبال' مطبوعہ ایوان اردو، اگست 2011ء، ص 7

-8 پروفیسر عبدالحق، فکرِ اقبال کی سرگزشت، ص 77

-9 مجنوں گورکھپوری، اقبال (اجمالی تبصرہ)، ص 58

-10 فیض احمد فیض، کلامِ اقبال کا فنی پہلو، مشمولہ اقبال، ص 43۔ اصل عبارت:

They are purely symbols, symbols to illustrate some inner subjective theme which Iqbal wants to illustrate through the se symbols. They are no longer things in themselves. He is not interested in the Eagle or Shaheen as such, I don't think he has ever described what the Eagle looks like. He is not interested in the fire-fly as such, nor in the eagle, or the moon or the sun, they are no longer for him external objects but merely symbols to illustrate certain themes. (اقبال، ص 8-9)

-11 *The Secret of the Self*، نکلسن، آ راے (مترجم)، ص xxii۔ اقبال کی یہ تحریر کتاب کے Introduction میں شامل ہے۔ اصل عبارت میں that---value کے درمیان it settles the problem of good and evil. کے الفاظ موجود ہیں۔

-12 فیض احمد فیض، 'محمد اقبال' (مترجم: سجاد باقر رضوی)، مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر 2)، ص 126۔ اصل عبارت:

Iqbal's Perfect Man (Mard-e-Kamil) disengages himself from Nietsche's superman, for Iqbal's categorical imperatives rule out all forms of nationalist chauvinism, social exploitation and personal aggrandisement. (اقبال، ص 32)

-13 پروفیسر عبدالحق، فکرِ اقبال کی سرگزشت، ص 76

-14 ادارہ 'اقبال اور ترقی پسند' مطبوعہ مکتبہ لاہور، ص 18

-15 پروفیسر عبدالحق، فکرِ اقبال کی سرگزشت، ص 76۔ پروفیسر صاحب نے راقم کے ایک استفسار پر اپنے برقی تار میں 22 جنوری 2012ء کو یہ اطلاع دی:

Qurratull Ain Hyder narrated this incedence on the dais of Ghalib Academy few years back. In this account she has narrated the entire episode of Faiz walking out on a gathering, who refused Iqbal's ideology.

-16 پروفیسر عبدالحق، فکرِ اقبال کی سرگزشت، ص 76

-17 ادارہ 'اقبال اور ترقی پسند' مطبوعہ کتاب لاہور، ص 18

-18 آل احمد سرور (مضمون: اقبال، فیض اور ہم)، مجموعہ تنقیدات، ص 370

Guess you like

Careem is MENA's #1 car booking app for a safe,

58.4KB/s 6:31 48%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search

-19 ڈاکٹر محمد علی صدیقی (مضمون: اقبال اور فیض: حسن و بصیرت کے داعی)، فیض احمد فیض، ص 58

-20 فیض کے انگریزی مضمون Muhammas Iqba کی ابتدائی سطور یوں ہیں:

"No man was ever yet a great poet", wrote that very discerning critic Coleridge, "without being at the same time a great philosopher". (اقبال، ص 15)

البتہ کولرج کی شہرہ آفاق کتاب Biographia Literaria کے پندرہویں باب میں a great philosopher کے بجائے a profound philosopher ہے۔

-21 فیض احمد فیض، محمد اقبال [مترجم: سجاد باقر رضوی]، مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر 2)، ص 123

اصل انگریزی عبارت:

Unlike some of his medieval predecessor he was not only equipped with intensive education in various philosophical school, both ancient and contemporary, but also commanded sufficient prose in more than one language to articulate his own answers to the problems of Reality with logic and precision. (اقبال، ص 16-15)

-22 فیض احمد فیض، میزان، ص 103

-23 آثار ناصر، ہم جیتے جی مصروف رہے، بحوالہ ڈاکٹر سید محمد تقی عابدی فیض فہمی، ص 765

-24 علامہ اقبال، پیام مشرق، ص 94

-25 فیض احمد فیض، محمد اقبال [مترجم: سجاد باقر رضوی]، مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر)، ص 124

-26 فیض احمد فیض، انٹرویو: الطاف حسن قریشی، مطبوعہ اردو ڈائجسٹ، اپریل 1964ء

-27 آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، ص 371

-28 فیض احمد فیض، کلام اقبال کا فنی پہلو، مشمولہ اقبال، ص 42 اصل عبارت:

Iqbal begins himself in his very early works, in the work that he wrote in his youth. He talks about himself, about his love, about his grief, about his loneliness, about his disappointments. Then from himself, he progresses to the Muslim community, to the Muslim world, in the later half of Bang-e-Dara. From the Muslim world he goes further to mankind and from mankind to universe. (اقبال، ص 7)

-29 ڈاکٹر محمد علی صدیقی، فیض احمد فیض، ص 59

-30 فیض احمد فیض، ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات، مشمولہ اقبال، ص 32

-31 فیض احمد فیض، اقبال، فن اور حصار فکر، مشمولہ اقبال، ص 21

-32 آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، ص 371

Guess you like

104
of 428

60.7KB/s 6:31 48%
Allama Iqbal : Ha...

-33 فیض احمد فیض: 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 46 اصل عبارت:
He is the poet of struggle, of evolution, of man's fight against the hostile forces of nature, the forces hostile to the spirit of man. (اقبال، ص 13)
-34 فیض احمد فیض: 'محمد اقبال' [مترجمہ سجاد باقر رضوی] مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر 2)، ص 126 اصل عبارت:
Having already parted company with the traditional mystic who dismisses the physical word as an illusion and human physical endeavor as mere variety, Iqbal discards equally emphatically the dogmatic theologian and his static orthodoxy. (اقبال، ص 22)
-35 فیض احمد فیض: 'اقبال، فن اور حصار فکر' مشمولہ اقبال، ص 22
-36 فیض احمد فیض، انٹرویو: الطاف حسن قریشی، اردو ڈائجسٹ، اپریل 1964ء
-37 فیض احمد فیض، میزان، ص 256
-38 فیض احمد فیض: 'فکر اقبال کی ارتقائی منزلیں' مشمولہ اقبال، ص 55
-39 فیض احمد فیض، میزان، ص 73
-40 پروفیسر عبدالحق، فکر اقبال کی سرگزشت، ص 80
-41 فیض احمد فیض: 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 44-46
-42 فیض احمد فیض، انٹرویو: الطاف حسن قریشی، اردو ڈائجسٹ، اپریل 1964ء
-43 آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، ص 361
-44 علی احمد فاطمی: 'فیض اور اقبال' مطبوعہ ایوان اردو، اگست 2011ء، ص 8
-45 ایوب مرزا، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ص 376
-46 فیض احمد فیض، انٹرویو: الطاف حسن قریشی، اردو ڈائجسٹ، اپریل 1964ء
-47 فیض احمد فیض: 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 44-46
-48 فیض احمد فیض: 'فکر اقبال کی ارتقائی منزلیں' مشمولہ اقبال، ص 56
-49 فیض احمد فیض: 'پیش لفظ' مشمولہ روزگار فقیر
-50 فیض احمد فیض، میزان، ص 255
-51 ایضاً، ص 255
-52 ایضاً، ص 255
-53 فیض احمد فیض: 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 39 اصل عبارت:
—because there are a number of injunctions in Iqbal's work imploring his readers to ignore his poetry and to concentrate on his message. (اقبال، ص 5)

Guess you like
105
of 428

0.01KB/s 6:32 48%
Allama Iqbal : Ha...

54- فیض احمد فیض، 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 39-40 اصل عبارت:

Iqbal didn't want to get mixed up with decadent songsters with which our community abounds. Anyway I am not going to quarrel with this approach ——. I merely wanted to say that whatever the rights or the wrongs of this approach, there is no doubt that a poet of Iqbal's caliber would be great by whatever name you call him. (4 اقبال، ص)

55- فیض احمد فیض، 'محمد اقبال' [مترجمہ سجاد باقر رضوی] مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر 2)، ص 123 اصل عبارت:

Like all great "poets of affirmation": Dante, Milton, Goethe, Iqbal was no abstract thinker. Like them he was closely involved with the affairs of the social world around him. (16 اقبال، ص)

56- فیض احمد فیض، میزان، ص 74

57- ایضاً، ص 134

58- فیض احمد فیض، 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 40 اصل عبارت:

Even though Iqbal was a philosopher, a thinker, an evangelist and even a preacher, what gave real force and persuasiveness to his message was his poetry. (4 اقبال، ص)

59- علی احمد فاطمی، 'فیض اور اقبال' مطبوعہ ایوان اردو، اگست 2011ء، ص 6

60- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات' مشمولہ اقبال، ص 33

61- فیض احمد فیض، مذاکرہ روزنامہ جنگ، 9 نومبر 1984ء

62- ایضاً

63- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات' مشمولہ اقبال، ص 37

64- فیض احمد فیض، میزان، ص 148

65- فیض احمد فیض، 'کلام اقبال کا فنی پہلو' مشمولہ اقبال، ص 40 اصل عبارت:

Iqbal himself was deadly opposed to art for art's sake and, therefore, we cannot study his art or his style or his technique or his other poetic qualities in isolation from his theme because even though there is steady progression in his style, even though he wrote in different styles, yet all these styles were fassioned according to the theme which he was trying to put across. Therefore, the evolution of his style is parallel to the evolution of his thought and it would be superficial and misleading to study are in isolation from the other.

Guess you like
106
of 428

42.7KB/s 6:32 48%
Allama Iqbal : Ha...

66- فیض احمد فیض، 'فکر اقبال کی ارتقائی منزلیں' مشمولہ اقبال، ص 55
67- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات' مشمولہ اقبال، ص 33
68- ایضاً، ص 31

کتابیات:

ادب اور انقلاب — ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری — حیدرآباد دکن: ادارہ اشاعت اردو — 1943ء
اقبال — فیض احمد فیض — مرتبہ: سیما مجید — لاہور: مکتبہ عالیہ — 1989ء (دوم)
اقبال (احیائی تبصرہ) — مجنوں گورکھ پوری — گورکھ پور: ایوان اشاعت — س ن
انتخاب پیام مشرق — فیض احمد فیض (مترجم) — لاہور: اقبال اکادمی پاکستان — 1977ء
روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — حیدرآباد دکن: ادارہ اشاعت اردو — ستمبر 1947ء
روزگار فقیر — فقیر سید وحید الدین — کراچی: لائن آرٹ پریس — 1966ء (ششم)
شعرِ اقبال کی سرگزشت — پروفیسر عبدالحق — دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی — 1989ء
فیض احمد فیض — ڈاکٹر محمد علی صدیقی — لاہور: پیس پبلی کیشنز — 2011ء
فیض فہمی — سید تقی عابدی — لاہور: Multimedia Affairs — 2011ء
کلیات اقبال فارسی — علامہ اقبال — لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز — س ن
متاعِ لوح و قلم — فیض احمد فیض — کراچی: دانیال — 2011ء (ہفتم)
مجموعہ تنقیدات — آل احمد سرور — لاہور: الوقار — 1996ء
میزان — فیض احمد فیض — کراچی: اردو اکیڈمی سندھ — 1987ء (سوم)
ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ایوب مرزا — راولپنڈی: شیریں گل — 1976ء
The Secret of the Self — علامہ اقبال — لنگسن — لندن: میک ملن — 1920ء

اخبارات و رسائل:

اردو ڈائجسٹ — ماہ نامہ — لاہور — مدیر: الطاف حسن قریشی — اپریل 1964ء
اقبالیات — سہ ماہی — لاہور — جولائی 2009ء
ایوان اردو — ماہ نامہ — دہلی — مدیر: انیس اعظمی — اگست 2011ء
جنگ — روزنامہ — کراچی — 9 نومبر 1984ء
کتاب — ماہ نامہ — لاہور — (محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے مجلہ کتاب کے چند ناقص الطرفین صفحات کے عکوس دستیاب ہوئے، جن سے ماہ و سال کا اندازہ نہیں ہوتا)
نقوش — (اقبال نمبر 2) — لاہور — مدیر: محمد طفیل — شمارہ 123 — دسمبر 1977ء

ویب سائٹ

http://www.online-literature.com/coleridge/biographia-literaria/15/
(بتاریخ: 27 جنوری 2012ء، بوقت: ڈیڑھ بجے دوپہر)

Guess you like
107
of 428

0.29KB/s 6:32 48%
Allama Iqbal : Ha...

54- فیض احمد فیض، 'کلامِ اقبال کا فنی پہلو'، مشمولہ اقبال، ص 39-40 اصل عبارت:

Iqbal didn't want to get mixed up with decadent songsters with which our community abounds. Anyway I am not going to quarrel with this approach —. I merely wanted to say that whatever the rights or the wrongs of this approach, there is no doubt that a poet of Iqbal's caliber would be great by whatever name you call him. (اقبال، ص 4)

55- فیض احمد فیض، 'محمد اقبال' [مترجمہ سجاد باقر رضوی]، مطبوعہ نقوش (اقبال نمبر 2)، ص 123 اصل عبارت:

Like all great "poets of affirmation", Dante, Milton, Goethe, Iqbal was no abstract thinker. Like them he was closely involved with the affairs of the social world around him. (اقبال، ص 16)

56- فیض احمد فیض، میزان، ص 74

57- ایضاً، ص 134

58- فیض احمد فیض، 'کلامِ اقبال کا فنی پہلو'، مشمولہ اقبال، ص 40 اصل عبارت:

Even though Iqbal was a philosopher, a thinker, an evangelist and even a preacher, what gave real force and persuasiveness to his message was his poetry. (اقبال، ص 4)

59- علی احمد فاطمی، 'فیض اور اقبال'، مطبوعہ ایوانِ اردو، اگست 2011ء، ص 6

60- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات'، مشمولہ اقبال، ص 33

61- فیض احمد فیض، مذاکرہ روزنامہ جنگ: 9 نومبر 1984ء

62- ایضاً

63- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات'، مشمولہ اقبال، ص 37

64- فیض احمد فیض، میزان، ص 148

65- فیض احمد فیض، کلامِ اقبال کا فنی پہلو'، مشمولہ اقبال، ص 40 اصل عبارت:

Iqbal himself was deadly opposed to art for art's sake and, therefore, we cannot study his art or his style or his technique or his other poetic qualities in isolation from his theme because even though there is steady progression in his style, even though he wrote in different styles, yet all these styles were fassioned according to the theme which he was trying to put across. Therefore, the evolution of his style is parallel to the evolution of his thought and it would be superficial and misleading to study are in isolation from the other.

Guess you like
106

0.01KB/s 6:32 48%

66- فیض احمد فیض، 'فکر اقبال کی ارتقائی منزلیں' مشمولہ اقبال، ص 55
67- فیض احمد فیض، 'ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات' مشمولہ اقبال، ص 33
68- ایضاً، ص 31

کتابیات:

ادب اور انقلاب — ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری — حیدرآباد دکن: ادارہ اشاعت اردو — 1943ء
اقبال — فیض احمد فیض — مرتبہ: سیما مجید — لاہور: مکتبہ عالیہ — 1989ء (دوم)
اقبال (اجمالی تبصرہ) — مجنوں گورکھ پوری — گورکھ پور: ایوان اشاعت — س ن
انقلاب پیام مشرق — فیض احمد فیض (مترجم) — لاہور: اقبال اکادمی پاکستان — 1977ء
روایت اور بغاوت — سید اقتشام حسین — حیدرآباد دکن: ادارہ اشاعت اردو — ستمبر 1947ء
روزگار فقیر — فقیر سید وحید الدین — کراچی: لائن آرٹ پریس — 1966ء (ششم)
فکر اقبال کی سرگزشت — پروفیسر عبدالحق — دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی — 1989ء
فیض احمد فیض — ڈاکٹر محمد علی صدیقی — لاہور: پیس پبلی کیشنز — 2011ء
فیض فہمی — سید تقی عابدی — لاہور: Multimedia Affairs — 2011ء
کلیات اقبال فارسی — علامہ اقبال — لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز — س ن
متاع لوح و قلم — فیض احمد فیض — کراچی: دانیال — 2011ء (ہفتم)
مجموعہ تنقیدات — آل احمد سرور — لاہور: الوقار — 1996ء
میزان — فیض احمد فیض — کراچی: اردو اکیڈمی سندھ — 1987ء (سوم)
ہم کہ ٹھہرے اجنبی — ایوب مرزا — راولپنڈی: شیریں گل — 1976ء
The Secret of the Self — علامہ اقبال — نکلسن — لندن: میک ملن — 1920ء

اخبارات و رسائل:

اردو ڈائجسٹ — ماہ نامہ — لاہور — مدیر: الطاف حسن قریشی — اپریل 1964ء
اقبالیات — سہ ماہی — لاہور — جولائی 2009ء
ایوان اردو — ماہ نامہ — دہلی — مدیر: انیس اعظمی — اگست 2011ء
جنگ — روزنامہ — کراچی — 9 نومبر 1984ء
کتاب — ماہ نامہ — لاہور — (محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے مجلّہ کتاب کے چند ناقص الطرفین صفحات کے علاوہ دستیاب ہوئے، جن سے ماہ و سال کا اندازہ نہیں ہوتا)
نقوش — (اقبال نمبر 2) — لاہور — مدیر: محمد طفیل — شمارہ 123 — دسمبر 1977ء

ویب سائٹ

http://www.online-literature.com/coleridge/biographia-literaria/15/
(بتاریخ: 27 جنوری 2012ء، بوقت: ڈیڑھ بجے دوپہر)

Guess you like

Careem is MENA's #1 car booking app for a safe

Careem
GET 50% OFF ON YOUR FIRST RIDE!
Use promo: RIDE50

53.2KB/s 6:32 48%

پروفیسر توقیر احمد خان (نئی دہلی)

علی سردار جعفری پر اقبال کے اثرات

علی سردار جعفری ایک صاحب نظر نقاد، بصیرت افروز دانش ور اور وسیع المطالعہ محقق تھے۔ قدرت نے انھیں کشادہ ذہن اور فہم و ذکا سے نوازا تھا۔ ان کی تحریریں سریع الفہم، واضح اور اثر انگیز ہوتی تھیں۔ نظریاتی اعتبار سے انھوں نے مارکسی نقطۂ نظر کو اختیار کیا اور عمر بھر اسی کا کاربند رہے۔ کارل مارکس کی فکر و نظر کے تحت جب ترقی پسند تحریک کے نام سے ایک ادبی مہم کا آغاز ہوا تو علی سردار جعفری اس کے اہم ستون اور پیش رو علم برداروں میں شامل رہے اور ترقی پسند قافلہ سالاروں میں ان کی ایک نمایاں حیثیت رہی۔ علمی اعتبار سے بھی اگر نظر ڈالیں تو سردار جعفری ایک زیرک صاحب نظر اور صاحب انتقاد ثابت ہوئے۔ ان کی آرا نہایت پختہ تلی، صاف اور شفاف ہوتی ہیں۔ تحریروں میں کہیں بھی الجھن، ابہام یا گنجلک انداز نظر نہیں آتا۔ جو بات کہتے ہیں بالکل صاف اور واضح ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات خاص اور اہم یہ ہے کہ اگرچہ عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے فرقہ پرست

Guess you like

Careem is MENA's #1 car booking app for a safe, reliable and affordable

Careem
GET 50% OFF ON YOUR
Use promo: RIDE50

108
of 428

64.5KB/s 6:33 48%

طاقتوں کا دیا ہوا انعام قبول کر لیا تھا اور اسلام اور مسلمانوں سے مخالفت کے باوجود اقبال اور اکابرین اردو ادب کے سلسلہ میں ان کا ذہن جملہ تعصبات سے پاک معلوم ہوتا ہے اور ہر نظریۂ ادب کو معروضی انداز سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں اور یہ ان کی وسیع المشربی ہے۔ کچھ ملائیت بعض ترقی پسند علما، شعرا اور نقادوں میں بھی پائی جاتی ہے جو صرف اپنے نظریہ کو مقدم قرار دیتے ہیں لیکن دوسرے نظریات کو سنجیدگی سے سمجھنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے جن سے بعض مقامات پر خود سردار جعفری نے بھی اختلاف کیا ہے۔ ہماری نظر میں علی سردار جعفری کا سب سے اہم اور بڑا مرتبہ اسی سے قائم ہوا کہ بعض معاملات میں ان کا ذہن وسیع اور بے تعصب ہے۔ اپنے نظریہ کی وکالت اپنی جگہ لیکن دوسرے خیالات پر سوچ سمجھ کر رائے قائم کرنا ان کا اپنا شیوہ ہے۔ یہی خصوصیت ان کے ادبی مقام اور مقصد کو بلند کرنے والی ہے کہ آج ان کے انتقال کے بعد ہر مکتب فکر کے لوگ ان کی قدر و منزلت کا اقرار کرنے لگے ہیں۔

ہمیں یہ بات کہنے میں کوئی عار اس لیے نہیں ہے کہ مارکسی نقطہ نظر اختیار کرنے والوں میں سے اکثر نے اقبال کو تعصب کی نگاہ سے دیکھا اور اپنی تنقید کا ہدف بنایا۔ اگرچہ اس سے اقبال کا کچھ بھی نہیں بگڑ سکا۔ اقبال جہاں تھا وہیں قائم ہے اور ان کے افکار و نظریات کی گرفت کرنے والے اب کہیں کے بھی نہیں رہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اقبال ایک عظیم اور عبقری شخص تھے جس کے مقابلہ کے لیے کم از کم اسی قامت کے شخص کی ضرورت تھی۔ وہ عالمی اور آفاقی مفکر و دانش ور بن چکے تھے۔ اس لیے ہر شخص کے ذہن کی رسائی اقبال کے فکر و فلسفہ کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔ خود اقبال ہی کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر کم نظر اس محفل میں بیٹھیں گے تو اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے:

نظر نہ ہو تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی میں مثالِ تیغ اصیل

یہ بات علی سردار جعفری کے اہلِ علم اور اہلِ نظر ہونے کی دلیل ہے کہ انھوں نے اقبال کو سمجھا اور اقبال سے استفادہ کیا۔ کوئی بالغ نظر انسان ہی اقبال فہمی کا دعویٰ کرنے

Guess you like

109
of 428

4.29KB/s 6:33 48%

کا اہل ہوسکتا تھا اور وہ علی سردار جعفری تھے۔ معمولی فہم و ذکا والا مجلس اقبال میں بیٹھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جو پہاڑ میں ٹکر مارے گا وہ اپنا ہی سر پھوڑے گا۔

علی سردار جعفری میں اتنی سکت، قوت اور لیاقت تھی کہ وہ اقبال پر خامہ فرسائی کرسکیں۔ اس لیے انھوں نے اقبال پر بے لاگ اور بے دریغ اظہار خیال کیا۔ انھوں نے جو کچھ کہا اسے بے باکی کے ساتھ کہا۔ مثل مشہور ہے کہ ''ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔'' علی سردار جعفری ایسے جوہری تھے جنھوں نے اقبال نما ہیرے کی قدر پہچان کر لی تھی۔ علی سردار جعفری کے اکثر و بیش تر نقادوں نے کہا ہے کہ علی سردار جعفری اقبال کے مخالف تھے اور انھوں نے اقبال کے خلاف مضمون لکھا۔ اقبال کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے وغیرہ خیالات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی معروف کتاب ''ترقی پسند ادب'' کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ بعد میں علی سردار جعفری نے ''اقبال شناسی'' تحریر کی اور اقبال کے فکر و فلسفہ کی تعریف کی لیکن ''ترقی پسند ادب'' میں سے اپنے ماقبل مضمون یا خیالات کو خارج نہیں کیا۔ لیکن یہ بات ہمیں بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے ''ترقی پسند ادب'' کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے علی سردار جعفری نے کہیں بھی اقبال کے فکر و نظر کی گرفت نہیں کی اور نہ ہی دوسرے ترقی پسند نقادوں کی طرح اقبال کو برا بھلا کہا بلکہ اس کے برعکس علی سردار جعفری نے جس طرح خراج عقیدت اقبال کو پیش کی اس طرح کی تعریف ''ترقی پسند ادب'' میں شامل کسی بھی شاعر نے نہیں کی۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے مارکسی نظریہ پر بڑی سختی سے کاربند تھے اور اقبال کے افکار علیہ میں انھیں کہیں کہیں زہریلے رجحانات اور افکار بھی نظر آتے تھے لیکن ان کے زہریلے رجحانات کی انھوں نے کوئی نشان دہی نہیں کی۔ ہاں اقبال کے جو عمدہ اور بیش قیمت خیالات تھے ان کی نہ صرف نشان دہی کی بلکہ تفصیل کے ساتھ وضاحت بھی کی۔ یہ وہی ''ترقی پسند ادب'' ہے جس میں علی سردار جعفری نے اقبال سے بڑھ کر کسی بھی دوسرے ادیب یا شاعر کی بڑائی نہیں کی۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے قبل ادیبوں اور شاعروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اگر عصبیت کی عینک

Guess you like

110

of 428

59.0KB/s 6:33 48%

لگا کر انھوں نے دیکھا ہوتا تو ہرگز ان خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے :

''اس سلسلہ میں ترقی پسند نقادوں کو بہت کچھ کام کرنا ہے اور ماضی کے بھاری پتھروں کے نیچے سے ان سرچشموں کو ڈھونڈ نکالنا ہے جن سے صدیوں تک ہماری کشت ادب کی آبیاری ہوئی ہے لیکن یہ کام اس وقت تک انجام نہیں دیا جا سکتا جب تک اپنے پیش رو جمہوری ادیبوں کو اچھی طرح نہ سمجھ جائے۔ اوپر چڑھنے کے لیے ہمیشہ سب سے نیچی سیڑھی سے ابتدا کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح یہ بزرگ سرسید، حالی، شبلی اور اکبر باوجود اپنے تمام تضادات اور الجھاوں کے اردو میں جمہوری شعر و ادب اور جمہوری تنقید کے بانی ہیں جس کا براہ راست تعلق ہماری تحریک کے ترقی پسند پہلوؤں سے ہے۔''

(''ترقی پسند ادب'' ص-98)

یہ خیالات ان کے وسیع الذہن ہونے کی علامت اور دلیل ہیں۔ ان کی نگاہ ہمیشہ ادب کے مثبت اور مفید پہلوؤں پر رہی ہے۔ ماضی کے بھاری پتھروں میں ایک سب سے بھاری پتھر اقبال تھا۔ علی سردار جعفری نے اس کے نیچے بہنے والے صاف و شفاف چشموں کی دریافت کی اور ان کی سینچائی سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو بقائے دوام بخشنے کی سعی کی۔ اقبال جیسے بھاری پتھر کو جب سردار جعفری جیسے طاقت ور انسان نے پلٹ کر دیکھا تو انھیں معلوم ہوا کہ اقبال سے زیادہ عظیم، بڑا، پاکیزہ، فائدہ مند اور لافانی شاعر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اقبال کے خیالات و افکار کی تقلید کی ہے جس سے ان کے اندر زندگانی کی رمق موجود نظر آتی ہے۔ سردار جعفری کی نظریں بڑی تیز اور رمز شناس تھیں۔ انھیں پوری دنیائے اردو ادب میں اقبال سے بڑھ کر کوئی شاعر نظر نہیں آیا اور انھوں نے بلا خوف و تردد اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا :

''-1 ابھی تک اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ ہمہ گیری اور وسعت بھی ابھی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔'' (''ترقی پسند ادب'' ص-98)

Guess you like

111

of 428

18.2KB/s 6:33 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

"2- پہلی بار اقبال کی شاعری میں انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے معنوں میں آیا اور مزدور سرمایہ دار کے تضاد کا اظہار ہوا۔"

("ترقی پسند ادب" ص-106)

"3- "اقبال نے ہمیں انسان کا جو عظیم الشان تصور دیا وہ پہلے کے اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا۔"

("ترقی پسند ادب" ص-109-110)

"4- ——اقبال نے ان تصورات سے اردو شاعری کو نئی سطح پر پہنچایا اور آج یہ سب تصورات ترقی پسند شاعری کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ ہم اس سرمایہ کی قدر کرتے ہیں اور اس کے لیے اقبال کا بے انتہا احترام ہمارے دل میں ہے۔ اقبال کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ شعر جو میں نے غالب کے لیے کہا تھا، اقبال پر بھی صادق آتا ہے۔

تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں
تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں"

("ترقی پسند ادب" ص-110)

یہ علی سردار جعفری کی صاحب نظری، عقل اور ہوش مندی کا ثبوت ہی نہیں بلکہ یہ ان کے دل کی آواز بھی ہے۔ ان خیالات کے سامنے علی سردار جعفری کے وہ خیالات جن میں اقبال کی نکتہ چینی کی گئی ہے، بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بے لاگ اور بے مثال قدردانی کے سامنے اقبال پر وہ تنقیدی خیالات جن میں اقبال کی فکر پر ضرب لگتی ہو، بہت ہی چھوٹے اور کم نظر آنے لگتے ہیں، مثلاً :

"یہ شاعری تقریباً نصف صدی کے عرصے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس زمانے کی شاید ہی کوئی ایسی سیاسی اور سماجی تحریک ہو جس کا عکس اس کے آئینہ میں نظر نہ آتا ہو۔ اقبال کے نزدیک وہ شاعری مہمل اور بے معنی ہے جو کوئی پیام لے کر نہ آئی ہو۔ اقبال کا پیام بڑا تھا

Guess you like
112
of 428

40.3KB/s 6:33 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

لیکن اپنے عہد کے الجھاووں سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس لیے ان کی شاعری میں زندگی بخش رجحانات زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہو گئے جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا ہو یا پانی میں رنگ گھول دیا گیا ہو۔ ایک خوب صورت کپڑے کے تانے بانے کی طرح جس میں ریشم اور سوت کے تار ایک ساتھ بن دیے گئے ہوں، اقبال کی شاعری میں دونوں قسم کے رجحانات آپس میں گتھے ہوئے ہیں اور یہ اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت کہیں ریشم کے تار کے ساتھ سوت کا بھی کوئی تار نہ کھنچ آئے۔" ("ترقی پسند ادب" ص 99)

سطورِ بالا میں مذکور ہو چکا ہے کہ علی سردار جعفری نے شاید کبھی بھی اپنی تحریر میں اقبال کو فاشسٹ نہیں کہا۔ جس تحریک سے وہ وابستہ تھے اس کے ارکان میں سے بعض نے ضرور اقبال کو فاشسٹ کہا تھا علی سردار جعفری نے ہرگز نہیں۔ علی سردار جعفری نے تو ایسے لوگوں کی خبر بھی لی تھی۔

اقبال کی طرح علی سردار جعفری کا ذہن بھی نہایت کشادہ تھا۔ انھوں نے اقبال کو ہدف بنانے کے لیے الٹی اقبال کی حمایت اور وکالت کی ہے جس کی مثال کے طور پر لوگ علی سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" کو پیش کرتے ہیں۔ اس وقت ترقی پسندوں کے غول میں علی سردار جعفری اور آل احمد سرور دو ایسے اصحابِ نظر تھے جو اپنی فکر و دانش کو اقبال کی فکر و نظر سے منور کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کا نام لینا بھی جرم قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا ثبوت خود آل احمد سرور کے وہ اشعار ہیں جو انھوں نے اپنے اور علی سردار جعفری کے اقبال سے والہانہ عشق کے بارے میں لکھے تھے۔ یہ دونوں شعر علی سردار جعفری کی اقبال شناسی کے شروع میں نقل کیے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جعفری صاحب کو اپنے آپ کو اقبال تسلیم کرنے میں نہ صرف کوئی عار ہے بلکہ ان کے لیے یہ باعثِ تفاخر ہے :

سردار اور اقبال

ہماری فکر بھی اقبال کے شعلہ سے روشن ہے
اسی کے فیض سے روشن ہمارے خون کی لالی

Guess you like
113
of 428

55.7KB/s 6:33 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

سرورؔ اس واسطے سردارؔ سے مجھ کو محبت ہے
کہ ہم دونوں ہیں گو مجرم مگر مجرم ہیں اقبالی

(آل احمد سرور، 25 مارچ 1970ء)

اقبال نے جس طرح خداوندانِ باطل کو پاش پاش کیا اس کی مثال ادبی و سیاسی دنیا میں کم ہی ملے گی۔ سردار جعفری کو اس کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے اقبال جیسی خراجِ تحسین بلکہ خراجِ عقیدت پیش کی ہے۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری میں فکرِ اقبال کی جھلک سے لگایا جاسکتا ہے۔ اقبال شناسی میں آل احمد سرور کے اشعار نقل کرنے کے بعد انھوں نے خود اپنے اشعار نقل کیے ہیں۔ یہ تین شعر بطور خاص ملاحظہ ہوں :

ناتوانوں کو عطا کی قوتِ ضربِ کلیم
تو نے بخشے ملتِ بے پر کو بالِ جبریل
رند کیا ساقی بھی جس محفل میں پیاسا تھا وہاں
لے کے آیا دل کے پیمانے میں موجِ سلسبیل
آذرانِ عصرِ حاضر کے صنم خانوں میں آج
گونجتا ہے تیرے دم سے نغمۂ سازِ خلیل

علی سردار جعفری نے اقبال شناسی کے دیباچہ میں اقبال کی جو حمایت کی ہے، اس سے ناقدینِ اقبال پر بڑی کاری ضرب پڑتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ علی سردار جعفری اقبال کے دفاع کے لیے پوری طرح سینہ سپر ہوگئے ہیں۔ اس میں اقبال کو عالمِ انسانی کی بے داری کا شاعر، اشتراکیت کی فتح اور کارل مارکس اور لینن کی عظمت کا نغمہ خواں بتایا گیا ہے :

"اقبال مسلم بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں ایشیائی بے داری شامل ہے۔ اقبال ہندوستان کی بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں پوری تحریکِ آزادی شامل ہے اور اقبال عالمِ انسانیت کی بے داری کے شاعر تھے۔ اس میں اشتراکیت کی فتح اور کارل مارکس اور لینن کے افکار کی عظمت شامل ہے۔ اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی

Guess you like
114
of 428

47.3KB/s 6:33 48%
Allama Iqbal : Ha...

حیثیت کی تردید نہیں کرتی بلکہ میرے نزدیک اس کی توثیق اور توسیع کرتی ہے کیوں کہ ہندوستان اور ایشیا کی مسلم ہے داری عالم انسانیت کی ہے داری کا ایک حصہ ہے۔ اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چوں کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا۔ اس لیے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ خون بہار کی طرح ان کے اشعار میں رواں دواں ہے۔ وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے خواہاں تھے اور انسانی تخلیقی قوتوں کے مداح اور قصیدہ خوان تھے۔ ایسا شاعر فرقہ پرستی کے تنگ دائرے میں سانس نہیں لے سکتا۔"

("اقبال شناسی" ص-11)

اس دیباچہ میں آگے لکھتے ہیں :

"شاعر مشرق کی فکر میں بہت سے تضادات ہیں جو ان کے عہد کی دین ہیں۔ ان کا مطالعہ میری پیش نظر کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان تضادات سے اقبال کی عظمت اور اہمیت میں کمی نہیں ہوئی۔ اس قسم کے تضادات طالسطائی کے یہاں بھی ملتے ہیں جن کی طرف لینن نے اشارہ کیا ہے۔"

("اقبال شناسی" ص-12)

اقبال شناسی کے دیباچہ سے چند جملوں کا ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں جس سے علی سردار جعفری کے دل میں اقبال کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اقبال کو ان کے عہد نے پیدا کیا تھا لیکن وہ اپنے عہد سے بڑے تھے۔ وہ مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو اور ٹیگور کے ہم عصر تھے۔ یہ تینوں بھی اپنے عہد کی پیداوار تھے لیکن اپنے عہد سے بڑے تھے۔"

Guess you like
115
of 428

43.1KB/s 6:33 48%
Allama Iqbal : Ha...

''اقبال شناسی'' کے تین ابواب ہیں جن میں علی سردار جعفری نے اقبال کے تین پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اول ''شاعرِ مشرق''، دوم ''اقبال اور فرنگی'' اور سوم ''اقبال کا تصورِ وقت''۔ یہ تینوں موضوعات کے مطالعہ اقبال کے لحاظ سے نہایت ادق اور مشکل ہیں اور ''اقبال شناسی'' کی اشاعت تک Untouched تھے۔ بعد میں اگرچہ ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی لیکن میرے خیال میں جتنی معقولیت، صداقت، گیرائی اور عمیانیت علی سردار جعفری کے بیان میں موجود ہے، دوسری جگہ کم ہی ملے گی۔ کلامِ اقبال کی جیسی تشریح و تفسیر علی سردار جعفری نے کی ہے اور جو نکات و مطالب اقبال کے کلام سے برآمد کیے ہیں، شاید ابھی تک کوئی بھی ناقدِ اقبال یا شارحِ اقبال پیش نہیں کر سکا۔

''.....اقبال کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا اور انھوں نے کبھی ہندوؤں کے خلاف ایک حرف نہیں لکھا اور مسلمانوں نے نشاۃِ ثانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے الگ نہیں کیا۔ ہاں ان کی شاعری اکثر و بیشتر اسلامی استعارے میں آفاقی حقیقتیں پیش کرتی ہے۔ (ایگور نے ہندو استعارے میں آفاقی حقیقتیں پیش کی ہیں۔) میں یہاں دو تین مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

اس شعر میں ساری روایت واقعاتِ کربلا کی ہے جو اسلام کی تاریخ میں صداقت اور آزادی کے لیے سب سے بڑی قربانی ہے لیکن جو بات کہی گئی ہے وہ مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ اس کو نظر کی زبان میں یوں بیان کیا جائے گا کہ سب سے بڑی حقیقت صداقت کے لیے قربان ہونا ہے۔ یہ حقیقت کبھی نہیں بدلتی بلکہ ڈپلومیسی اور سیاست نئے نئے چولے بدلتی رہتی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اقبال نے قرآن مجید کی بعض آیتوں کے ترجموں سے آفاقی حقیقتیں پیش کی ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

116
of 428

43.1KB/s 6:34 48%
Allama Iqbal : Ha...

یہ سورۃ الفتح کی ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس خیال سے یہ خوب صورت شعر تخلیق ہوا ہے:

گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اپنی ایک نظم "مردِ مسلمان" میں اقبال نے اس شعر میں مردِ کامل کی خصوصیت بیان کی ہے:

جن سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

کیا یہ شعر لینن، گاندھی، نمرود اور مارٹن لوتھر پر صادق نہیں آتا۔ اس کا سرچشمہ بھی سورۂ الفتح کی آیت ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔"

("اقبال شناسی" ص 27-28)

علی سردار جعفری نے اقبال کی خودی کو آفاق گیر نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس کی تعریف کی ہے اور معنویت میں نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی سے بھی اختلاف نہیں کیا بلکہ اسے عالمِ انسانیت کے لیے حد درجہ مفید، کارآمد اور ناگزیر قرار دیا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں جس حسن و خوبی سے علی سردار جعفری نے اس شعر کی توضیح کی ہے، وہ اپنے آپ میں نرالی ہے:

"بہ زیرِ سنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و چیپر و یزداں گیر

(ترجمہ: ہم کبریائی کے نیچے ایسے مرد موجود ہیں جو فرشتے کو چیپر کو شکار کرتے ہیں اور خدا کو بھی شکار کرتے ہیں۔)

یہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا بڑا اہم نکتہ ہے۔

"اقبال نے ایک بڑے فن کار کی طرح اس خودی کی روح کو کائنات کے ذرے ذرے میں جاری و ساری دیکھا ہے۔ چنان چہ چاند، سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، پھول، ہوائیں، سمندر، بیابان، چڑیا، جانور، انسان سب کے سب اس جذبے سے سرشار ہیں۔

53.0KB/s 6:34 48%
Allama Iqbal : Ha...

رائی زور خودی سے پربت بن رہی ہے۔ انسان کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ خودی کم زور ہے تو کوکلہ ہے اور مضبوط ہے تو ہیرا ہے۔ قطرہ شبنم سے چڑیا اپنی پیاس بجھا سکتی ہیں لیکن ہیرے کی کنی کو کوئی نگل سکتا۔ اس غزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زور دار ہو جاتی ہے۔ اس سیلاب کا بہاؤ اور آبشاروں کی روانی آجاتی ہے اور ایک ایسا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے جس کی مثال ایک ہزار برس کی فارسی اور اردو شاعری کی روایت میں نہیں ہے۔ اس کے سامنے کوئی منزل منزل نہیں، کوئی حد حد نہیں، بے قراری، تڑپ، آگے بڑھ جانے کا بے پناہ جذبہ، جس کسی حسین چہرے پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے زیادہ خوب صورت محبوب کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔ شرر سے ستارے، ستاروں سے آفتاب بن رہے ہیں۔ فقط ذوق پرواز ہے زندگی۔ سکون و قرار موت کا دوسرا نام ہے۔''

(''اقبال شناسی'' ص 42-41)

فکرِ اقبال کے باریک نکات کو مفصل بیان کر کے علی سردار جعفری نے کمال کیا ہے لیکن وہ اس پر بھی اختصار اور ایجاز کے دعوے دار ہیں۔ یہ ان کا عجز و انکسار ہے ورنہ وہ اقبال کو اس سے کہیں زیادہ واضح طور پر سمجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ شاعرِ مشرق والے باب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں :

''میں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے پس منظر میں فلسفۂ خودی کی صرف ایک جھلک پیش کی ہے۔ یہ مکمل اقبال نہیں ہے۔ اسے کسی ایک اندازِ فکر میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود اپنے ایک شعر کے مطابق شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق ہے۔ ہندوستان کا بھی اور پاکستان کا بھی اور ساری عالمِ انسانیت کا۔''

(''اقبال شناسی'' ص 10)

❖❖❖

118
of 428

0.51KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر زین رامش (ہزاری باغ، جھارکھنڈ)

بحیثیت محبِّ وطن اقبالؔ کا انفراد و اختصاص

اردو کے سربرآوردہ ناقد پروفیسر آل احمد سرور اقبالؔ کے تعلق سے اپنی ایک بڑی ہی معنی خیز اور متاثر کن تحریر میں اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

''اقبال کی عظمت یہ ہے کہ ان کے یہاں مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی سرمائے پر نظر بھی ہے اور ماضی کے عرفان کے ساتھ حال کے آشوب کا احساس اور مستقبل کا ایک خواب بھی ہے۔ اور یہ سب ایسی جان دار اور طرح دار زبان میں بیان ہوا ہے کہ نہ صرف ذہن اس سے مسرت اور بصیرت حاصل کرتا ہے بلکہ گنجینۂ معنی کا طلسم رہ رو کر زندگی کے مختلف مرحلوں پر یاد آتا رہتا ہے اور ہمیں عشق کے بلا خیز کے قافلۂ سخت جاں کی کتنی ہی وادیوں اور منزلوں میں لے جاتا ہے''۔ (پیش لفظ: ''اقبال شاعر.....)

میں نے اقبال سے متعلق اپنی گفتگو کا آغاز آل احمد سرور کے درج بالا اقتباس سے صرف اس لیے کیا کہ اقبال کے یہاں ماضی کے عرفان اور حال کے احساسِ آشوب کے

Guess you like
119
of 428

39.1KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

ساتھ ہی ساتھ ان کی نگاہوں میں محفوظ مستقبل کا وہ خواب ہی تھا جس نے انہیں قریہ حب الوطنی کی ایسی پُر کیف اور دل کش سیر کرائی تھی جس کا اظہار آج بھی انہیں شاعرانہ عظمت و بلندی اور سرفرازی عطا کر رہا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت و توقیر کے سلسلے میں ان کے شعری و فنی اختصاص و انفراد کی چاہے جتنی بھی جہتیں تلاش کی جائیں اور ان پر چاہے جتنے زاویوں سے بھی گفتگو کر لی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک محب وطن کی حیثیت سے اقبال نے جس طرح اپنے آپ کو پیش کیا اس کی شاید بہت توانا مثال بہت آسانی سے تلاش نہ کی جا سکے۔

حیرت ہوتی ہے جب ناقدین ادب اور حلقۂ دانش وران ادب خصوصاً نظموں کے حوالے سے اقبال کی شاعری کے غالب موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے دینی و ملی اور انقلابی و جمہوری موضوعات کا حوالہ تو خوب دیتے ہیں لیکن ان میں اقبال کی شاعری کے وہ غالب موضوعات زیر بحث نہیں آتے جو ان کی قومی و وطنی شاعری کی اساس کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ہم یقینی طور پر اس حقیقت کو نظر انداز یا فراموش نہیں کر سکتے کہ اقبال کی قومی اور وطنی شاعری نہ صرف اپنے اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے اہم، بامعنی اور باوقار ہے بلکہ وہ جب اپنے قاری تک پہنچتی ہے تو قاری کو ایک خاص کیفیت سے مکیف بھی کر دیتی ہے:

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اور شاعر "ہمالہ" سے جب "صدائے درد" کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو ایک بالکل نیا منظر نامہ سامنے آتا ہے اور شاعر سرزمین وطن کی نفاق انگیزی پہ مرثیہ خواں ہوتا ہے:

Guess you like
120
of 428

WhatsApp 6:34 PM
Message from +92 307 3551416 @ QATAR
MALOOMAT

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے

محض 19 اشعار یعنی 18 مصرعوں پر مشتمل یہ نظم ''صدائے درد'' جب ''تصویرِ درد'' میں منعکس ہوتی ہے تو اپنی نوعیت کی ایک بہت ہی منفرد، بہت ہی سحر انگیز، بہت ہی جادو صفت اور بہت ہی پُر اثر نظم کے طور پر اپنی شناخت قایم کراتی ہے۔ 167 اشعار یعنی 138 مصرعوں پر مشتمل یہ نظم ایک خاص کیفیت کے ساتھ شروع ہوتی ہے، جہاں کیفیت بھی ہے، طنطنہ بھی اور سیمابیت بھی۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے، زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اقبال پر جیسے ایک سیمابی کیفیت طاری ہے۔ کہیں وہ تیز رو نظر آتے ہیں اور کہیں سبک رو۔ لیکن قلب و نظر و ذہن کی تپش انہیں رکنے نہیں دیتی۔ وہ متنبہ کرتے ہیں:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ، سب فسانوں میں

جذبے کی شدت کچھ اور رنگ دکھاتی ہے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

Guess you like

96.2KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

''تصویرِ درد'' اقبال کی ان نظموں میں سے ایک ہے جن میں اقبال اپنے بالکل انفرادی رنگ و آہنگ کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جہاں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے درون سے کوئی کراہ ابھر رہی ہے۔ جہاں فلسفی اقبال گوشہ نشیں ہو جاتا ہے اور ایک جذباتی شاعر اپنی تمام تر دردمندیوں کے ساتھ پا بپیادہ پا بہ رکاب نظر آتا ہے۔ وہ وضاحت کرتا ہے کہ آئینِ قدرت اور اسلوبِ فطرت یہی ہے کہ راہِ عمل میں جو بھی گام زن ہے وہی محبوبِ فطرت ہے اور پھر اقبال راہِ عمل میں گام زن ہونے کا نمونہ پیش کرتے ہیں پوری بے باکی و جرأت مندی کے ساتھ:

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاری میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

نظم کے اس حصے میں اقبال اپنے آپ کو ایک نئی آب و تاب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ نظم کا لہجہ، نظم کا استعاراتی نظام، نظم کے اشارے اور کنائے اور ان سب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت نظم کو شرخاب کے پر عطا کر دیتی ہے اور پھر شاعر فتی طور پر حاصل ہونے والی دولت بے داد کی ناز فرمائی میں منہمک ہوتے ہوئے بھی وضاحت کرتا ہے:

شرابِ بے خودی سے تا فلک پرواز ہے تیری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

Guess you like
122
of 428

96.2KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

اقبال کی اس نظم سے متعلق کثرتِ مطالعہ اقبال کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت قائم کرنے والے دانش ور اور ادیب پروفیسر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں کہ:

''اس دور میں وطن کے لیے اقبال کے دل میں کتنا درد تھا، یہ دیکھنا ہو تو ''تصویرِ درد'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وطن پر فرقہ پرستی کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو محبِ وطن اقبال کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔''

اقبال کی شاعری، ان کی شاعرانہ فکر، ان کے نظریے، ان کے خیالات، ان کے فلسفے، ان کے لب و لہجے، ان کا نظریۂ شعر، ان کے صوتی آہنگ، ان کے صوتیاتی نظام، ان کی صنعت گری، ان کے عادات و خصائل، ان کے مذہبی عقائد، ان کے فلسفۂ وحدت الوجود، فلسفۂ عشق، فلسفۂ خیر و شر، فلسفۂ مردِ کامل، فلسفۂ خودی و بے خودی، فلسفۂ ضبطِ نفس اور پیکر تراشیِ فن کے آپ حامی ہوں یا مخالف اور مجدد الف ثانی، جلال الدین رومی، دانتے، برگساں اور نیتشے کے تعلق سے ان کی عقیدت و محبت کو آپ چاہے جس نظر اور نظریے سے دیکھیں لیکن اس بات پر تو اتفاقِ رائے ہونا ہی ہے کہ ''حب الوطنی'' اقبال کی زندگی کی وہ کلید تھی جسے اقبال نے سرمایۂ زندگی کے طور پر اوائل زندگی سے ہی اپنے پاس محفوظ رکھا۔

یہاں اس بات کو بھی ملحوظِ نظر رکھنا ہوگا کہ اقبال نے شعر گوئی کے ابتدائی ایام سے ہی جن دو چیزوں یا دو موضوعات پر خصوصی توجہ مرکوز کی ان میں حب الوطنی اور مناظرِ فطرت کی دل فریبیوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی جس کی زندہ و تابندہ مثال ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کی پہلی نظم ''ہمالہ'' ہے۔ میں نے موضوع گفتگو کے حوالے سے اقبال کی جن نظموں کو منتخب کیا ہے ان میں ''ہمالہ'' کے علاوہ ''صدائے درد''، ''تصویرِ درد''، ''ترانۂ ہندی''، ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' اور ''نیا شوالہ'' کو مرکزیت حاصل ہے۔ اقبال کی یہ سبھی نظمیں ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کے پہلے حصے میں موجود ہیں۔ گویا

Guess you like
123
of 428

55.5KB/s 6:34 48%
Allama Iqbal : Ha...

یہ سبھی نظمیں اقبال کی 1905ء تک کی شاعری سے متعلق ہیں۔ ''ہمالہ'' بانگ درا کی پہلی نظم ہے۔ ''صدائے درد'' سولہویں نظم ہے۔ ''تصویر درد'' بہ اعتبار ترتیب 34 نمبر پر ہے۔ ''ترانہ ہندی'' 39 پر ہے اور ''نیا شوالہ'' بانگ درا کی تینتالیسویں نظم ہے جب کہ اس حصے میں کل 49 نظمیں شامل ہیں۔ اس حصے کی آخری نظم ''التجائے مسافر'' ہے۔ یہ نظم اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ یہ سفر یورپ سے بالکل قبل لکھی گئی ہے۔ بقول نورالحسن نقوی:

> ''ستمبر 1905ء میں اقبال یورپ کے لیے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل وہ دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضر ہوئے اور تنہائی میں مزار کے سرہانے بیٹھ کر ''التجائے مسافر'' پڑھی جو اس موقع کے لیے لکھی گئی تھی۔''
>
> (''اقبال شاعر اور مفکر'' ص 15)

نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

یہاں سے معاملہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ:

اگر سیاہ دلم ، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم ، گل بہار توام

اور پھر اس نظم کے داخل سے جو روشنی پھوٹتی ہے اس کی کیفیت دیکھیے:

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

Guess you like
Careem is MENA's #1 car booking app for a safe,
Careem
GET 50% OFF ON YOUR FIRST RIDE!
Use promo: RIDE50

57.6KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

مذکورہ بالا دونوں اشعار کے حوالے سے دانش وران علم و ادب کو اب یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ اس نظم کی روح میں جو ایک خلش ، بے چینی اور اضطراب ہے وہ وطن سے ہجرت کے نتیجے میں بھی ہے۔

اقبال کی نظم ''ترانہ ہندی'' اقبال کی نظموں میں ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں اردو کی ایسی واحد نظم ہے جو اپنی تخلیق سے لے کر آج تک کتنی مرتبہ، کہاں کہاں اور کس کس انداز میں پڑھی، سنی اور شائع کی گئی اس کا شمار ممکن نہیں۔ آج بھی بین الاقوامی سطح پر اس نظم کے ذریعہ ہندوستان کی لطیف اور دل کش پیکر تراشی جس انداز میں ہوتی ہے وہ ہندوستانی ادبیات کی کسی بھی دوسری شعری تخلیق کے ذریعہ نہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

بظاہر بڑی سہل سی اس نظم میں اقبال کی فکر میں کئی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں :

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی ، دل ہو جہاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبال کی نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں جو نظامِ شعر قائم ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست کے ذریعہ جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ نظم کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ نظم کا پہلا ہی مصرع چشتیؒ کے پیغامِ حق کا مژدہ جاں فزا سناتا ہے اور قاری ایک کیفیت و تسخیر قلب سے مکیف ہو جاتا ہے :

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

125
of 428

55.9KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

جی تو چاہتا ہے کہ پوری نظم آپ کی خدمت میں پیش کروں لیکن اس بات کا احساس ہے کہ یہ احمقانہ عمل ہوگا کیوں کہ یقیناً یہ پوری نظم آپ کے ذہن میں بھی محفوظ ہوگی اور آپ کی توجہ اس جانب مرکوز بھی۔ لیکن اس نظم کا آخری بند پیش نہ کیا جائے یہ بھی ممکن نہیں، ملاحظہ فرمائیں:

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ان کیفیات کی لذتوں کے قائم رہتے ہوئے بھی اس جانب بھی توجہ دینی ہوگی کہ اقبال کی اسی قبیل کی نظموں میں ایک نظم "نیا شوالہ" بھی ہے جس میں شاعر کئی نفسیاتی گرہوں کو سلجھاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ نہ لہجے کا طنطنہ ہے نہ کیفیت اظہار، نہ فی سوز و گداز ہے نہ ترنگ۔ اس کے باوجود "نیا شوالہ" اقبال کی ان نظموں میں سے ایک ہے جسے ان کی لافانی نظموں کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے تاہم ایک اداس اداس سی کیفیت، ایک الجھا الجھا سا لہجہ، ایک پھیکا پھیکا سا ذائقۂ شعر اور بالکل بے اطمینانی کی کیفیت ہے جو پوری نظم میں از اول تا آخر قائم و دائم ہے۔ اقبال مصلحت اور مصالحت کی کیفیت کے اسیر اور اس سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ بلا مبالغہ اقبال کی یہ نظم ہندو مسلم اتحاد کی جد وجہد میں کوشاں ایک بہترین نظم کے طور پر آپ کو متعارف کراتی ہے لیکن اس کی روح مطمئن نظر نہیں آتی ہے اور نظم اختتام پذیر ہوتی ہے:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

لیکن یہاں منعکس ہونے والا اقبال کا درد بھی جذبہ حب الوطنی سے ہی سرشار نظر آتا ہے۔

126
of 428

47.9KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

اختتام کلام سے قبل ضروری ہے کہ اقبالؔ کے یہاں موجود حب الوطنی سے متعلق جذبہ صدق و صفا کی گفتگو پر ہی صرف اکتفا نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ان عوامل و محرکات پر بھی غور ہونا چاہیے جس کے توسط سے اقبالؔ کے یہاں یہ ہنرمندی اپنا جوہر دکھاتی ہے۔

اوائل عمر سے ہی اقبالؔ کو اپنے والد کی تربیت خاص حاصل تھی جس پر انہیں بہت فخر بھی تھا۔ ان کے والد شیخ نور محمد کے احوال و کوائف بتاتے ہیں کہ انہیں صوفیا کی صحبت سے رغبت خاص تھی۔ وہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے اور ان کے پیر و مرشد سلطان العارفین قاضی سلطان محمود کی ان پر توجہ خاص تھی۔ چنان چہ اقبالؔ بھی اوائل عمری میں ہی سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے تھے۔ ان کی معروف نظم ''جاوید سے'' میں یہ شعر قابلِ توجہ ہے :

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

اقبالؔ کو بچپن سے تلاوت کلام پاک سے رغبت تھی۔ بعد نمازِ فجر تلاوت میں مشغول رہنا ان کی گویا فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ والدہ کی تربیت نے اقبالؔ کے اندر ایک ایسا تدبّر، اخلاص اور دین داری عطا کی کہ تا عمر وہ اس کے اثر کے دائرے میں رہے۔ اقبالؔ والدہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں :

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

میرے خیال میں یہی وہ عوامل و محرکات تھے جس نے اقبالؔ کے قلب و ذہن کو وہ وسعت و بے داری عطا کی تھی جسے بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو ایک مخلص و مہربان اور صادق و صافی محبِ وطن کی حیثیت سے پیش کر کے وقار و تمکنت حاصل کیا۔ وہ مذاقِ عارفانہ ہی تھا جس نے اقبالؔ کو کل بھی سرخ روئی عطا کی تھی اور آج بھی وہ سرافراز ہیں۔

❖❖❖

127
of 428

31.8KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر محمد نعمان خان (نئی دہلی)

علامہ اقبال کے افکار پر جرمن اثرات

اقبال دورِ حاضر کے واحد مسلم مفکر ہیں جن کی شہرت عالم اسلام سے نکل کر مغربی دنیا تک جا پہنچی۔ ان کی زیادہ تر تالیفات اور اشعار کا ترجمہ یورپ کی بیش تر زبانوں میں ہو گیا ہے۔ یوں تو اقبال کا یورپ میں تعارف انگریز مستشرقین کا رہین منت ہے، لیکن علامہ پر برطانیہ کا نہیں بلکہ جرمنی کا اثر غالب ہے۔ علامہ کے شکوہ اور جواب شکوہ کا انگلش ترجمہ E Bannerth کے مضمون Islam in Modern Urdu Poetry میں ملتا ہے جو Anthropos, 37-40 (1942-45) میں شائع ہوا۔ جرمن زبان میں پہلا ترجمہ ''جاوید نامہ'' کا Das Buch der Ewigkeit کے نام سے 1957ء میں ہوا۔ یہ ترجمہ مشہور مستشرقہ انامیری شمیل (Annemarie Schimmel) نے کیا جس پر اس وقت کے مشہور شاعر ہرمن ہیسے (Hermann Hesse) نے تبصرہ کیا اور مشرق و مغرب کے اہل علم و دانش کے درمیان بات چیت پر زور دیا۔ وہی بات چیت جس کی ابتدا جرمنی

128
of 428

70.2KB/s 6:34 48%
https://www.rekhta.or Search
Allama Iqbal : Ha...

کے مایہ ناز شاعر گوئٹے (Johan Wolfgang von Geothe) نے کی اور اپنے مغربی مشرقی دیوان میں مشرقی رموز و تصویر کشی کے انداز میں مغربی افکار و فلسفے کو پیش کیا۔ اقبال نے جرمنی میں پڑھا اور جرمن فلسفے اور خاص طور پر شعر پسند کیا جس کی نمائندگی گوئٹے نے کی اور پیام مشرق میں اس کا جواب تحریر کیا۔ علامہ اقبال سب سے پہلے 1907ء میں ہائیڈل برگ پہنچے تھے اور وہاں نہر نیکر (Neckar) کے کنارے اپنی خوب صورت و مشہور نظم ''ایک شام'' نظم کی تھی، جس میں وہاں کی خموشی اور سکون کی تصویر کھینچتے ہوئے کہا تھا :

خاموش ہیں، کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل ! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اسی مفہوم میں گوئٹے کی مشہور نظم ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے "Uber allen Gipfeln ist Ruh" (تمام پہاڑیوں کی بلندیوں [چوٹیوں] پر خموشی و سکون طاری ہے۔) (فکر و فن [1979ء] صفحہ 64) اب آپ اسے توارد افکار کا نام دیں یا کچھ اور۔

ہیسے (م 1963ء) نے اپنی بصیرت سے اقبال کو پہچان لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اقبال کی حیثیت صرف برصغیر ہند کے ایک اسلامی مصلح ہی کی نہیں ہے بلکہ اقبال مشرقی و مغربی تمدن کے درمیان ایک واسطہ بھی ہیں۔ اقبال کی حیثیت دنیائے مشرق و مغرب، خاص طور پر اسلامی اور جرمن تمدن کے درمیان بات چیت میں ایک اہم نمائندے کی ہے۔ ہیسے کے مطابق اقبال کو تین روحانی بنیادیں ملیں اور یہی تین بنیادیں ان کے کارناموں اور تالیفات و افکار کا سرچشمہ ہیں۔ یعنی ہندوستانی برعظیم، عالم اسلام اور مغربی فکر سے وابستگی نے اقبال کو اقبال بنایا۔ (فکر و فن [1979ء] صفحہ 1)

اقبال نے ہندوستان مسلمان ہونے کے ناطے قرآن، ویدوں اور فارسی و عربی تصوف کا گہرا مطالعہ کیا۔ ساتھ ہی مغربی فلسفے اور اس کی پے چیدگیوں کا بڑی گہرائی

129
of 428

0.19KB/s 6:35 48%
https://www.rekhta.or Search

سے مطالعہ کیا۔ انھوں نے برگسن (Bergson) اور نیتشے (Nietzsche) کو پڑھا اور سمجھا۔ اگرچہ وہ باقاعدہ صوفی نہیں تھے لیکن مولانا رومی کے زیر اثر تھے۔ اسی طرح ہیگل (Hegel) یا برگسن کے مقلدین میں سے بھی نہیں تھے، لیکن ان کا شمار نظریاتی فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ ہیے کے مطابق اقبال کی عظمت کا راز ان کی دین داری اور ایمان ہے۔ وہ چوں کہ ایک متقی انسان تھے، اس لیے انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی نذر کر دیا تھا۔ ان کا ایمان بچوں کا نہیں تھا، بلکہ ایک سرگرم مرد مجاہد کا ایمان تھا۔ ان کا جہاد صرف اللہ کی راہ کے لیے نہیں تھا بلکہ دنیا کے لیے بھی تھا۔ اقبال کا عقیدہ محدود نہ تھا بلکہ سب کو شامل کرنا تھا۔ ان کی تمنا ایسی انسانیت تھی جو اللہ اور اس کی خدمت کے لیے اکٹھی ہو جائے۔ (فکر و فن [1979ء] صفحہ 1)

اقبال کی تعمیر لاہور میں ہوئی۔ اس وقت علم و ثقافت کی باگ ڈور فرنگیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے اقبال نے بھی انگریز مستشرق سر تھامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی دونوں طرز کی تعلیم کے لیے راہ ہموار کی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے 1905ء میں انگلینڈ اور ٹرینٹی کالج (Cambridge) میں داخل ہو گئے اور وہاں فلسفے اور قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1907ء کے موسم بہار میں ہائیڈل برگ (Heidelberg) جرمن زبان سیکھنے کے لیے پہنچے۔ پھر اسی سال خزاں میں میونخ (Muenchen) پہنچے اور وہاں کی یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے ماہر ڈاکٹر ہومیل (Dr. Fritz Hommel) کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ جمع کرایا۔ مقالے کا عنوان تھا "The Development of Metaphysics in Persia" (فارس میں فلسفہ مابعد الطبیعی کا نشو و نما)۔ ڈاکٹری حاصل کرنے کے بعد اقبال نے انگلینڈ واپس جا کر قانون کی تعلیم مکمل کی اور 1910ء میں واپس لاہور آ گئے اور وہیں رہے، لیکن اسفار کا سلسلہ جاری رہا اور یورپ، بیت المقدس، افغانستان کے مختلف سفر کیے اور ہندوستان کی مختلف جامعات بھی جاتے رہے۔ یہاں تک کہ 21 اپریل 1938ء میں

Guess you like

130
of 428

6.34KB/s 6:35 48%
https://www.rekhta.or Search

ان کا انتقال ہوگیا۔ اقبال کا بنیادی مقصد علم و دیمان یا دین اور جدید علوم میں موافقت پیدا کرنا تھا۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ دین و دنیا اور مادہ و روح کے درمیان توازن قائم کیا جائے جو مفقود ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح عصرِ حاضر میں دینی فکر کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کے علی گڑھ، مدراس اور حیدر آباد میں دیے وہ خطبے اس بات کے شاہد ہیں جو The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ وائشر (Weischer) کے مطابق اس عنوان میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین کی طرف اشارہ اور تلمیح ہے۔ (فکر و فن [1979ء] صفحہ 5)

یورپ سے لوٹنے کے چند سال بعد ہی شکوہ اور جواب شکوہ لکھ کر اپنے ہم وطنوں میں ہلچل مچادی جس میں انھوں نے مسلمانوں کے حال زار پر اشک باری کی ہے اور انھوں نے مسلمانوں کو دین کی اصل کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی ہے۔ اسی طرح ''پس چہ باید کرد'' لکھی۔

علامہ اقبال کی فکر پر مغربی اور خاص طور پر جرمن فلسفے اور افکار کا اثر ہے۔ اقبال نے اپنے اسلامی فلسفے کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ اس دور کے ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی از سرِ نو تنظیم کے لیے کوشاں ہو۔ اس طور پر کہ ماضی سے تغافل نہ برتا جائے۔ اقبال نے اپنی تقریروں، تحریروں اور اشعار میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ مسلمان مغربی عصری علوم سے استفادہ کے ساتھ ساتھ کس طرح ایک پکا اور سچا مذہبی رہ سکتا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات میں بعض جرمن فلسفے کی تعبیرات و اصطلاحات کا استعمال کیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اقبالی فلسفے کا اہم اصول 'خودی' بنیادی اسلامی اصولوں اور اسلامی تصوف سے ماخوذ ہے۔

اقبال اپنی جوانی میں ہیگل (م 1832ء) کے فلسفے سے متاثر تھے۔ تجرید و خیال میں انھوں نے اس کے اعلیٰ مقام کا اعتراف کیا ہے۔ انھیں اس کے کلام میں ایسے روابط بھی ملے ہیں جن کا تعلق اسلامی تصوف سے ہے۔ ان میں خاص طور پر وحدت الوجود کا

Guess you like
Careem is MENA's #1 car
Careem
131
of 428

36.5KB/s 6:35 48%

نظریہ ہے۔ ''پیامِ مشرق'' میں ہیگل کے بارے میں رقم طراز ہیں :

حکمتش معقول و محسوس در خلوت نرفت
گرچہ بحر فکر اور پیرایہ پوشد چوں عروس
طائرِ عقل فلک ، پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کنز زور مستی خایہ گیرد بے خروس

دوسری جگہ کہتے ہیں :

''ہیگل جرمن قوم کے نزدیک افلاطون سے بڑھ کر ہے۔ اگر اس کی قوت خیال کو پیش نظر رکھا جائے تو واقعی افلاطون سے بڑھا ہوا ہے۔''

اس کے علاوہ اقبال پر جرمن کے عظیم شاعر گوئٹے اور دو مشہور فلسفیوں نیٹشے اور برگسن کا بھی گہرا اثر تھا۔ برگسن حیوی فلسفے (Vitalism) کی راہ پر تھا۔ یہ مسلک صرف برگسن ہی کا نہیں تھا بلکہ اس مسلک پر دیگر جرمن فلسفی بھی تھے جیسے یوکن (Euken) اور لوتسے (Lotze)۔

برگسن نے زندگی کی اچھال یا کود (Elan Vital) پر گفتگو کی ہے جو خالق کا نظریہ ہے۔ جو فطرت اور تمام عالم ہستی میں موجود ہے۔ اس کا ہم رومی کے نظریۂ عشقِ خلاق سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ اقبال نے تطور خلاق (Evolution creatice) کا نظریہ برگسن سے لیا ہے۔ یہ نظریہ اقبال کی خودی کے اصول کی تدریجی ترقی کے ضابطے کے مطابق ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں برگسن کی تقسیم زمانہ کی اتباع نہیں کی ہے۔ برگسن کے یہاں زمانہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک دنیوی زمانہ (Iedure) اور دنیا سے باہر یا آخرت کا زمانہ یا صوفیانہ وجد کا زمانہ (Intuition)۔ اقبال نے مکان و زماں کا مزید گہرائی اور غور و فکر سے مطالعہ کیا اور دورِ حاضر کے فلسفیانہ اور طبیعی علوم (Physics, natural sciences) سے متعلق آئنسٹائن (Einstein)، رسل (Russel) اور وہائٹ ہیڈ (Whitehead) کے نظریات کا مقابلہ اسلامی مفکرین و متصوفین کے نظریات و تجربات

Guess you like

132
of 428

43.3KB/s 6:35 48%
https://www.rekhta.or Search

سے کیا۔ اس موقع پر لاشعری اور فخر الدین العراقی الصوفی کا نام لیا جا سکتا ہے اور آخر الذکر عرصۂ دراز تک پنجاب کے شہر ملتان میں رہے۔

اقبال اپنے بنیادی فلسفے میں نیتشے (م 2000ء) کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چوں کہ وہ اس فلسفی کے افکار کی تنظیم کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے اور انھوں نے اس مظلوم فلسفی کو اپنے ادبی کاموں ''جاوید نامہ''، ''پیام مشرق'' اور ''اسلام میں دینی فکر کی تجدید'' میں اہم مقام دیا ہے اور اس کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ''تکرار ابدی'' کے نظریے پر انھیں اعتراض تھا لیکن ساتھ ہی اس کے اہم اصول بھی لیے جیسے قوتِ ارادہ یا انسان اعلیٰ تا کہ ان کی اصلاح کر کے اسلامی تصوف کے انسانِ کامل کے نظریے سے وابستہ کر سکیں۔ اقبال کے مطابق ان نیتشے چوں کہ خدا کا منکر ہے، اس لیے اس کی عقل ''لا الٰہ'' پر رک گئی ہے اور شہادت کا دوسرا حصہ ''الا اللہ'' پورا نہ کر پائی۔ چناں چہ اقبال کے نزدیک اس کا دماغ کافر ٹھہرا لیکن چوں کہ اس کے بعض افکار اسلام سے بہت قریب ہیں، اس لیے اس کا دل مومن قرار پایا :

آن کہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

اقبال کے نزدیک نیتشے میں یہ کمی رہی کہ اسے وہ خدا نہ مل سکا جس کی اسے تلاش تھی اور جو اسے عیسائیت میں بھی نہ مل سکا تھا۔ اقبال نے ''اسرارِ خودی'' میں نیتشے جیسے نظریات پیش کیے ہیں۔ اقبال نے قرآن اور انسانِ کامل کے بارے میں صوفی نظریات کی روشنی میں انسانِ قوی جو نیتشے کے یہاں انسانِ اعلیٰ ہے، کو اس دنیا میں خلیفۃ اللہ قرار دیا ہے۔ خودی زندگی کا بنیادی اصول ہے :

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

یہ نظریہ حیوی فلسفے کے نظریے کے مطابق ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو یہ سمجھنے کی دعوت دی ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ انسانوں کو اپنے خلیفۃ اللہ ہونے کی ذمہ داری دنیا کی

Guess you like
133
of 428

54.9KB/s 6:35 48%
https://www.rekhta.or Search

اصلاح کر کے بھائی چاہیے۔ اس سے اقبال اور نیتشے کے نظریے کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

اقبال کی بہترین نظموں میں عشق اور عقل کا تقابل پایا جاتا ہے۔ تاریخ فکر میں یہ تقابل بہت قدیم ہے۔ نیتشے کا خیال ہے کہ یونانی تہذیب میں جب صحیح زندگی موجود تھی تو یونانیوں میں Dionysims کی پوجا ہوتی تھی جو جذبہ حیات اور جذبہ تخلیق کا دیوتا تھا۔ پرجوش رقص و سرور کے ذریعہ لوگ اس دیوتا سے ہم آغوش ہوتے تھے۔ یہ جذبہ بہ نسبت مصوری اور سنگ تراشی کے موسیقی میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ عقل اس سے بہت بعید ہے اور فن لطیف اس سے بہت قریب ہے۔ بشرط یہ کہ فن لطیف عقلیت کا شکار نہ ہو جائے۔ افلاطون کا تصور موسیقی کی نسبت رومی اور نیتشے کے وجدانی اور تاثراتی تصور سے الگ ہے۔ زمانہ حال میں پہلے نیتشے نے اور اس کے بعد اقبال نے سقراطی و افلاطونی نظریات پر حملہ کیا ہے۔ اقبال نے ''اسرار خودی'' میں افلاطون کو گوسفند قرار دیا ہے :

راہب دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم

اس تلخ تنقید کا ماخذ نیتشے ہی کا وہ زبردست وار ہے جو اس نے افلاطون کی عقلیت پر کیا ہے۔ (دیکھیے اقبال 65-62)

جب اقبال نے اپنے نئے دینی فلسفے میں مغربی فلسفے کے عناصر شامل کیے تو اسلامی علم نفس کی بھی بنیاد رکھنی چاہی جس کے ذریعہ جدید علم نفس کے نتائج کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جا سکے اور اس کے دینی یا صوفی تجربے سے تعلق کو جانچا جا سکے۔ خاص طور پر اپنے لیکچروں Knowledge and religious experience, Is religion possible and the conception of God and the meaning of prayers میں اس طرف توجہ کی ہے۔

اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ امریکی عالم جیمس (W. James) نے دینی تجربوں کے مطالعے کے لیے بھی غور و فکر کے طریقے اور حیاتیاتی اصول و ضوابط استعمال

Guess you like
134
of 428

54.7KB/s 6:35 48%
https://www.rekhta.or Search

کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صوفی تجربہ سے سمجھ اور بے داری میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور اس کے گمان کے مطابق حقیقتِ مطلقہ کوئی چیز نہیں۔

فطری بات ہے کہ اقبال ان نظریات کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں جن میں دین کے اندر حیاتیاتی وسائل ہی تلاش کیے جائیں بلکہ ان کے نزدیک ایک ذات اور معنی دونوں ہی ایمان ہیں۔ اقبال کی رائے میں باطنی تجربات جن کا ذکر ہمیں دنیا کے تمام مذاہب اور صوفیانہ طریقوں میں ملتا ہے، ان کی حیثیت معرفِ مطلق کی ہوتی ہے۔ یہ حیثیت موجودہ علم نفس کی نہیں ہوتی۔ اقبال کی یہ بھی رائے ہے کہ فرائڈ (Freud) اور یونگ (Jung) کو صوفی تجربات کی تشریح کے لیے مناسب الفاظ اور تعبیرات نہیں مل سکیں۔

اقبال نے اپنے روحانی مطالعے میں جرمن شعر و ادب کے ساتھ بڑی ہم آہنگی اور یکسانیت پائی۔ اقبال گوئٹے اور اس کے ہمہ گیر افکار کی بہت قدر کرتے تھے۔ گوئٹے ہی "پیامِ مشرق" لکھنے کے محرک تھے۔ اقبال نے بہت سے اشعار اور قصیدے گوئٹے کے اسلوب اور طریقے پر لکھے۔ اقبال کی نظر میں گوئٹے یورپ کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اقبال کہتے ہیں :

> "شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں نے خلق یا پیدائش پر طبع آزمائی کی ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ واقعیت پسند اگر یزتجا انسان کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے لیکن مثالی شاعر گوئٹے تمام عالم پر غور کرتا ہے۔ فاؤسٹ (فوسٹ/Faust) جو گوئٹے کا مشہور ترین ڈراما اور اس کا کردار بھی ہے، اس کی شخصیت اگرچہ ظاہر میں انفرادی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں پوری انسانیت کی نمائندگی کرتی ہے۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

> "فاؤسٹ ڈراما عیسائی مذہب کے مقابلے میں جرمن قوم کے زیادہ قریب ہے۔"

گرچہ اقبال کے نزدیک شیکسپیئر اور دانتے کی بھی بڑی قدر تھی لیکن گوئٹے ان کی نظر میں دنیائے غرب کا سب سے عظیم شاعر ہے جیسا کہ رومی عالمِ اسلام کا سب سے بڑا شاعر

Guess you like

135
of 428

13.5KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

ہے۔ اقبال نے اپنی اس رائے کا اظہار اپنی نظم ''جلال و گوئٹے'' میں کیا ہے :

نکتہ دانِ المنی را در ارم
صحبتے افتاد با پیرِ عجم
شاعرے کو ہم چو آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

اقبال کے خیال کے مطابق اب وقت آچکا ہے کہ تمام ایمان والے مشرق و مغرب میں اکٹھے ہوجائیں۔ اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہ مومن اپنے بھائی کا آئینہ ہوتا ہے۔ پورے عالم کی نجات اللہ کے لیے خشوع و خضوع میں ہے۔ تقریباً یہی بات گوئٹے نے اپنے غربی شرقی دیوان (West-Ostilicher Diwan) میں کہی ہے جو اس نے حافظ شیرازی سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور اشاعت کے وقت جرمن عنوان کے ساتھ اس کا عربی عنوان بھی لکھا تھا۔ ''الدیوان الشرقی للمولف الغربی''۔ اس میں وہ کہتا ہے :

''پاگل پن کی بات ہے کہ انسان ہر حالت میں اپنی رائے دوسروں پر تھوپے اور اس کی برتری ثابت کرے۔ اگر اسلام اللہ کے لیے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے تو ہم سب اسلام پر ہی جیتے ہیں اور اسلام پر ہی مرتے ہیں۔''

اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ علامہ اقبال کے افکار اور جرمن افکار میں کتنی یکسانیت ہے اور انھوں نے دیگر افکار کے مقابلے میں جرمن علما کے افکار کو حقیقت سے قریب جانا اور قابل اعتنا سمجھا۔ علامہ اقبال ناقل محض نہیں تھے اس لیے انھوں نے ہر چیز پر غور و فکر کی نظر ڈالی اور قابل تنقید امور کی تنقید کی اور جس کو درست سمجھا اس سے استفادہ کیا۔ خلاصہ یہ کہ حق کو حق اور ناحق کو ناحق بتایا۔

❖❖❖

Guess you like
136
of 428

0.72KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد (نئی دہلی)

اقبال اور کالی داس کی شاعری میں فطرت کی منظر کشی

قرآن شریف میں مطالعہ کائنات سے متعلق 756 آیتیں ہیں جو اہل علم کو دعوت فکر دیتی ہیں۔ موجودات کائنات میں پائی جانے والی خوبیوں کا جوہر جو ناظرین میں لذت اور سرور کی خاص کیفیت پیدا کرتا ہے، دراصل حسن کہلاتا ہے اور حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے رجحانات انسانوں میں عموماً اور تخلیق کاروں میں خصوصاً پیدائشی طور پر پائے جاتے ہیں۔ حسن کے مظاہر کو قبول کرنے کے بعد ہی تخلیق کار اشیا کے مظہری پہلوؤں میں ایک طرح کی حقیقت نمود دینے کا کام کرتا ہے جسے فن کہا جاتا ہے۔ موسیقی، نغمہ و آہنگ، رنگ آمیزی یا تصویر کشی وغیرہ کچھ ایسے فنون ہیں جو ہماری پیشہ ورانہ اور کاروباری امور اور سیاسی و اقتصادی زندگی کے فرائض کو پورا کرنے میں ہونے والی محنت اور تھکن کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ہماری پریشان و مضطرب زندگی کو ایک طرح کا سکون بخشتے ہیں۔ اسی لیے عظیم شاعر یا فن کار کچھ ایسی تخلیقات کو جنم دیتے ہیں جو خود ان

Guess you like

137
of 428

52.1KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

کی حیات کی بقا کے لیے اتنی ضروری نہیں ہوا کرتیں لیکن پھر بھی ایسا کرتے ہوئے انہیں مسرت ضرور ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک تخلیق کار اپنی فطری ذہانت کے سہارے ایک قسم کی شاہانہ فیاضیوں کا برملا اظہار کرتا رہتا ہے۔ ان تخلیق کاروں میں سنسکرت کے مہا کوی کالی داس اور اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبال خاص اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے فطرت کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے حسین مناظر کی ایسی تصویر کشی کی ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی ہے۔ ان شعرا کی شاعری میں مناظر فطرت کی تصویر کشی کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کائنات کیا ہے؟ فطرت کسے کہتے ہیں؟ کیا فطرت کائنات واقعی بے حد حسین ہے؟ یا صرف ایک بدصورت مادہ ہے؟ فطرت کائنات اگر حسین ہے تو پھر حسن کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب فلسفیوں اور صوفیوں نے دیا ہے۔ مطالعۂ کائنات فلسفیوں اور صوفیوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ اس کے متعلق متعدد فلسفیوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً لائبنیز کے فلسفۂ مونادیت کے مطابق کائنات مونادوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے۔ جو نہایت ہی سادہ، ناقابل تقسیم اور غیر فانی ہے۔ (واضح ہو کہ مونا دایک طرح کے مراکز قوت ہیں جن میں سے ہر وقت توانائی پھوٹتی رہتی ہے۔ مونادوں کو روحیتی ذرات (Spiritual Atoms) بھی کہا جاتا ہے۔ لائبنیز کا یہ خیال کہ کائنات مونادوں کا مجموعہ ہے صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس نے مونادوں کو روحیتی ذرات یعنی Spiritual Atoms کہا ہے جو قوت کے مراکز ہیں اور جن سے توانائی نکلتی رہتی۔ جدید سائنسی تھیوریز (Theories) نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ مادے کا سب سے چھوٹا ذرہ جسے تقسیم نہیں کیا جا سکے Atom کہلاتا ہے جس کے اندر بے شمار توانائی ہوتی ہے Atom کے اندر پائے جانے والے Electron, Proton and Nutron توانائی کے سرچشمے ہیں۔ لیکن لائبنیز کا یہ کہنا کہ کائنات نہایت سادہ ہے قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ مونا دا گر مراکز توانائی ہے تو آفتاب کی ست رنگی روشنی، پہاڑ کی اونچی چوٹیوں سے بہتے ہوئے خوب صورت جھرنے کیا توانائی کے سرچشمے نہیں ہیں؟ اگر ہاں تو پھر کائنات سادہ کہاں ہے۔

Guess you like

138
of 428

58.6KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

برکلے نے بھی فطرتِ کائنات کے متعلق اپنا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ خارجی عالم کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ تجربہ ہمیں اشیا کی صفات کا علم فراہم کرتا ہے اور صفات صرف ہمارے نفس یا ذہن کے تصورات ہیں۔ اس لیے فطرت کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فطرت دراصل تصورات اور حسیات کا ایک نظام ہے جسے خدا کچھ خاص اصولوں کے تحت محدود اذہان میں پیدا کر دیتا ہے۔ فطرتِ کائنات کے سلسلے میں وہائٹ ہیڈ نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے :

''گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخیل کے خوب صورت موضوعات بنتے رہے ہیں مگر حقیقت تو یہ ہے کہ شعرا مغالطہ فہمی کے شکار ہیں اور انھیں اپنی نظموں میں خود اپنی ذات کو موضوعِ داد و دہش بنانا چاہیے اور تحسین بالذات اور بالذات تشکر کے کلمات ادا کرنے چاہئیں کیوں کہ یہ سارا حسن فطرت خود فطرت میں موجود نہیں، بلکہ یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوب صورت اور خوش نما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ فطرت بالذات تو ایک بوجھل و مکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی رنگ و آہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بود و سرور ہے۔ نہ تو فطرت کوئی شئے چشیدنی ہے اور نہ ہی یہ کوئی عالم دیدنی ہے بلکہ فطرت تو بالذات ایک سریع الفہم چیز ہے جس کا کوئی سر انہیں اور نہ ہی اس میں کوئی معنی و مفہوم ہیں۔ نہ ہی اس میں غایات و مقاصد ہیں۔''

(بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص 89-88)

وہائٹ ہیڈ کے پہلے جملے میں ہی تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ''گلاب کا پھول اپنے عطر کے لیے، بلبل اپنے سرور انگیز گیتوں کے لیے اور سورج اپنی درخشندگی کے لیے شاعرانہ تخیل کے خوب صورت موضوعات بنتے رہے ہیں۔'' دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ''فطرت بالذات تو ایک بوجھل و مکدر صورت حال ہے، جس میں نہ تو کوئی

Guess you like

139
of 428

99.3KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

رنگ و آہنگ ہے اور نہ ہی کوئی عالم بو و سرور ہے۔'' تو پھر گلاب کی خوشبو، بلبل کے سرور انگیز گیت اور سورج کی درخشندگی کیا فطرت کے حسین مناظر نہیں ہیں؟ اور اگر یہ حسین مناظر نہیں ہیں تو پھر شاعرانہ تخیل کے خوب صورت موضوعات کیسے بنتے رہے ہیں؟ البتہ وہائٹ ہیڈ کا یہ کہنا درست ہے کہ'' یہ حسن تو خود انسانی ذہن کے عمل ادراک کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ فطرت کو اس قدر خوب صورت اور خوش نما بنا کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔''

وہائٹ ہیڈ کے نظریے سے اتفاق کرتے ہوئے کروچے نے حسن کے موضوعی نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> ''حسن کھیتا نفس یا ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ کہ طبیعی اشیا بجائے خود اپنے اندر ذاتی طور پر کوئی حسن نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان اشیا کے اندر حسن کا ادراک خود ہمارے ذہن کا اعجاز ہوا کرتا ہے۔ اور انھیں ہمارا ذہن ہی حسین، قبیح اور جلیل بناتا ہے۔''

(بحوالہ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص: 47)

حسن کے متعلق رسکن کا خیال ہے کہ ہم حسن کی حقیقت سے اس وقت واقف ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر خدا کے ہر کام میں حسن و جمال کا احساس کرنے لگ جائیں لیکن رسکن نے حسن کو ایک جال قرار دیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس سے قدرت، عقل یا شعور کا شکار کرتی ہے۔ حسن کے متعلق بعض اہل علم حضرات کا خیال ہے کہ کوئی چیز صرف اسی قدر حسین ہوتی ہے، جس قدر کہ اس چیز کو اپنی نوع کے اعتبار سے ایک خاص تناسب حسن کا درکار ہوتا ہو۔ چنان چہ ہم کو مثالی حسن کا مکمل عرفان صرف اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ ہم فنا فی التصور ہو جائیں۔ یہ تصور ایک ایسا نقطۂ عروج ہے کہ جہاں تمام خواہشیں یا تمام ارادے ایک ارادۂ مطلق یا خواہش کلی میں ضم ہو کر ایک بڑے کل میں فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑے شاعر کا شدت احساس ایک خاص تناسب حسن والی اشیا کو دیکھنے کے بعد شدید ہو جاتا ہے یا وہ ان کے تصور میں اپنے آپ کو فنا کر لیتے ہیں اس لیے فطرت کائنات انہیں بے حد حسین نظر آتی ہے اور مناظر فطرت کی حسین تصویر کشی کرنے لگتے ہیں۔

Guess you like

140
of 428

0.00KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

وہائٹ ہیڈ کے برخلاف ایمرسن کا خیال ہے کہ یہ کائنات بے حد خوب صورت ہے۔ ہمارے چاروں طرف سحر انگیز کیفیت کا جال سا بچھا ہوا ہے جو اپنی طرف ناظرین کو متوجہ کرتی رہتی ہے لیکن ہم دنیاوی اور کاروباری معاملات میں اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ کائنات کا حسن ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر ہم پھر سے اپنے بچپن میں لوٹ جائیں اور ایک بچے کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کائنات بے حد حسین ہے۔ وہ کہتا ہے:

''ہمارے چاروں طرف کائنات کی سحر انگیز کیفیات نے ایک جال سا بنا رکھا ہے اور ہم خوب صورتی کے سمندر میں گویا ڈوبے ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی سے دنیاوی مسائل میں گرفتار ہونے کے باعث اور اپنے ماحول کا ہر روز نظارہ کرنے کی وجہ سے اس کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ ہماری آنکھیں کائنات کی رعنائیوں کے لیے اندھی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہمارا بچپن واپس آ جائے تو ہمیں اڑتے ہوئے طیور، چمکتے ہوئے تارے حیران نظروں والے پھول اور شفق کے لامثال رنگ ایک مسحور کن ترتیب کی صورت میں نظر آئیں اور ہم فرطِ طرب سے لرز اٹھیں۔''

(بحوالہ وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ص۔27)

اس سلسلے میں ہیگل کا خیال ہے کہ کائنات ایک عالمِ متصورہ (The world of Ideas) ہے۔ اس کو ہم عالمِ فطرت کہتے ہیں۔ اس کے مطابق عالمِ فطرت دراصل افکار و تصورات کا ایک عالمِ خارجی ہے اور عقلِ مطلق (یعنی خدا) اپنے آپ کو اشکالِ خارجیہ میں تبدیل کر کے ہمارے سامنے عالمِ ظاہر کے طور پر ہر وقت پیش ہوتی رہتی ہے۔ ہیگل کے جدلیاتی تصور کے مطابق ''نفس کی دنیا'' یعنی مبدائے اوّل ہی اصل ہے اور مادۂ نفس (یعنی مبدائے اوّل) کا مظہر ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ جدلیاتی عمل، نفس سے مادہ کی جانب نزول کرتا ہے گویا لطیف ترین تصور جب بلندی سے پستی کی طرف یا عروج سے زوال کی جانب آتا ہے تو لطیف ترین سے کثیف ترین صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ کثیف ترین صورت مادہ کہلاتی ہے جسے ہم عالمِ ظاہر کہتے ہیں اور جسے ہمارے حواس اپنی گرفت میں

Guess you like

141
of 428

46.4KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

لے لیتے ہیں اور ہم اس کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے مطابق کائنات فطرت خدا کا عین ہے۔ابن عربی نے اس سلسلے میں یہ آیت ''کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق ''(یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اس لیے میں نے خلقت کو پیدا کیا)۔گویا یہ تمام کائنات اسی وجود مطلق کی 'تجلی' ہے۔اگر فطرتِ کائنات واقعی خدائے مطلق کی تجلی ہے تو یہ یقیناً بے حد حسین ہے۔غالب بھی اس نظریے سے متفق ہیں اس لیے اس نظریے کی وضاحت کے لیے انہوں نے مختلف قسم کے الگ الگ رنگوں کے پھولوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان مختلف رنگوں میں بہار کا ثبوت ملتا ہے:

ہے رنگ لالہ وگل ونسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یعنی موجوداتِ کائنات اپنے رنگ و روپ کے اعتبار سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔

علامہ اقبال بھی اس نظریے کے قائل ہیں۔مثلاً انھوں نے اپنی نظم ''ہمالہ'' میں 'ہمالہ' کو خدا کے جلوہ سے تعبیر کیا ہے:

ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اس لیے فطرت کی منظر کشی کرتے وقت اکثر مقامات پر ان کا وجود فطرت میں فنا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن فنا کے مقام سے جب واپس آتے ہیں تو ان پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ کائناتِ فطرت اگر ایک جسم ہے تو انسان اس کی روح ہے اس لیے اقبال انسان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں اور فلسفۂ خودی جیسے نظریے کو پیش کرتے ہیں۔دوسری طرف کالی داس جب رگھونشم، کمار سمبھو، میگھ دوتم اور ابھگیان شکنتلم جیسے مہا کاویہ کی تخلیق کر رہے تھے اس وقت ان کے ذہن میں موجودہ دنیا نہیں تھی جسے 'کل یگ' سے تعبیر کیا

Guess you like
142
of 428

52.1KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

جاتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں وہ دنیا تھی جسے ''ست یگ'' کہا جاتا تھا اور جس دنیا میں تمام دیوی اور دیوتا چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کالی داس کی نظر میں ''ہمالہ'' صرف ایک پہاڑ ہی نہیں بلکہ ایک دیوتا بھی تھا جس کی بیٹی پاروتی تھی۔ اس زمانے میں زمین سے سورگ لوک میں جانا اور وہاں سے واپس آجانا ایک عام بات تھی۔ پہاڑ کی وادیوں میں رنگ برنگ کے پھول کھلا نے اور تمام گلستاں کو پھولوں کی خوشبو سے معطر کرنے کے لیے ''کام دیو'' بھی مامور کیے جاتے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں کالی داس کی تخلیقات میں فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی نہیں کی گئی ہوتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دونوں شاعروں نے فطرت کی جو منظر کشی کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ فطرت کے مناظر کو دل کش و دل فریب بنانے کے لیے کس طرح کی تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ایک ہی منظر کو دونوں شاعروں نے کس طرح پیش کیا ہے؟ ان تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے دونوں شاعروں نے فطرت کی جو تصویر کشی کی ہے اس کا تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔

علامہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں فطرت کی منظر کشی کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ بانگ درا کی پہلی ہی نظم ''ہمالہ'' میں اقبال نے خوب صورت تشبیہات و استعارات کی مدد سے قدرت کا مطالعہ اور فطرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کی شاعری بھی کی ہے۔ ہمالہ سے خطاب کرتے ہوئے اس کی جغرافیائی حالت، عظمت، اہمیت اور افادیت کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اس نظم کا پہلا بند ہے:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

اس بند کے پہلے ہی مصرعے میں ''فصیلِ کشورِ ہندوستاں'' کہہ کر اقبال نے ہمالہ کی وسعت اور پھیلاؤ کا منظر پیش کرنے کے ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا

Guess you like

143
of 428

52.1KB/s 6:36 48%
https://www.rekhta.or Search

ہے کہ ہندوستان کی وہ سرحدیں جو خشکی میں ہیں، ہمالہ کے لمبے سلسلے سے گھری ہوئی ہیں۔ اسی بات کو کالی داس نے اپنی تخلیق ''کمار سمبھو'' میں پہلے سرگ کے پہلے شلوک میں اس طرح کہی ہے کہ بھارت کے شمال میں دیوتا کی طرح عبادت کے لائق ہمالہ نام کا بڑا بھاری پہاڑ ہے جو مشرق اور مغرب کے سمندری ساحل تک پھیلا ہوا ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس سرزمین کو ماپنے اور تولنے کا میزان ہو۔ کالی داس نے ہمالہ کو دیوتا کی طرح لائق عبادت کہہ کر ہندو مائتھولوجی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کے مطابق ہمالہ صرف ایک پہاڑ ہی نہیں ہے بلکہ بھگوان شیو کی اہلیہ پاروتی کے جنمی (تخلیق کا سرچشمہ) بھی ہیں۔ اقبال نے بھی کہا ہے کہ اہل بینا کے لیے ہمالہ سراپا تجلی خدا ہے:

تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اقبال نے جب یہ کہا ہے کہ آسمان اس کی بلندی کو جھک کر چومتا ہے تو اس سے نہ صرف اس کی بلندی ظاہر ہوتی ہے بلکہ زمین سے آسمان تک کا نظارہ آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے اور ساتھ ہی زمین و آسمان کی دوری بھی مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمالہ کو یہ کہہ کر کہ ''تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں'' اس کے مناظر کو مزید دل فریب بنا دیا ہے کیوں کہ جوانی سے زیادہ پُرکشش کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے شعر میں علامہ اقبال نے ہمالہ پہاڑ کے نظارے پیش کرنے کے لیے اس کی چوٹیوں کو ثریا سے سرگوشی کرتے ہوئے دکھایا ہے اور یہ کہا ہے کہ زمین پر ہوتے ہوئے بھی ہمالہ کا وطن آسمان ہے۔ اس سے نہ صرف ہمالہ کی بلندی کا احساس ہوتا ہے بلکہ ہمالہ کی وادیوں سے چوٹیوں تک اور چوٹیوں سے تاروں کی انجمن تک کے مناظر آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں:

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پنہائے فلک تیرا وطن

شاعر نے اس کے علاوہ ہمالہ کے دامن میں پائی جانے والی کالی گھٹاؤں، چشموں اور ہوا کے جھونکوں کی بھی انتہائی خوب صورت منظر کشی کی ہے۔ فطرت کے ان حسین

Guess you like
144
of 428

55.7KB/s 6:37 48%
https://www.rekhta.or Search

مناظر کی تصویر کشی کرنے کے لیے شاعر نے ہمالہ کی گود میں پائے جانے والے چشموں کے پانی کو صاف اور شفاف بتانے کے لیے اس کی سطح کو آئینۂ سیال قرار دیا ہے جس میں فطرت اپنی تصویر دیکھا کرتی ہے:

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے

آئینے میں جب کوئی حسینہ اپنے حسن کو دیکھتی ہے تو اس کے چہرے پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہونے لگتی ہے مثلاً نپولین کی بہن پولائن نے مرتے وقت آئینہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور جب اسے آئینہ پیش کیا گیا تو آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کا شکر ہے میں اب بھی خوب صورت ہوں۔ اس لیے آئینہ دیکھنے کے بعد کی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فطرت جو انتہائی حسین ہے اس پر کیا گزرتی ہوگی جب وہ اپنے حسن کو آئینے میں دیکھتا ہوگا۔ اقبال کا یہ شعر:

حسن آئینۂ حق، دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ کالی داس نے کیلاش پربت کی گود میں بسی ہوئی 'الکاپوری' کی تشبیہ عاشق کی گود میں بیٹھی ہوئی ''کامنی'' سے اور وہاں سے نکلنے والی گنگا کی دھار کی تشبیہ اس کامنی (یعنی الکاپوری) کے جسم سے ڈھلکی ہوئی ساڑی سے اور پھر الکاپوری پر بارش کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کے سایے کی تشبیہ کامنیوں کے سر پر موتی گتھے ہوئے جڑے سے دے کر الکاپوری کی نہ صرف خوب صورت تصویر کشی کی ہے بلکہ گنگا کی دھار، برستے ہوئے بادل اور بادلوں کے سایے کے اثرات اور موتی جڑے ہوئے کامنیوں کے جڑوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام مناظر حرکت کرتے ہوئے آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔ کالی داس نے الکاپوری کو کامنی سے تعبیر کر کے پہلے قاری کے جنسی تلذذ کو بے دار کیا اور پھر اس کے بدن سے اس کی ساڑی کو سرکا کر قاری کی جنسی خواہش کو بھڑکا دیا اور وہاں کے پوری فضا میں رومان اور سرمستی کی سی کیفیت پیدا کر دی

Guess you like
145
of 428

0.62KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ہے۔ 67ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

"ہے کام چارنی! اس کیلاش پربت کی گود میں الکاپوری ویسے ہی بسی ہوئی ہے جیسے اپنے پیارے کی گود میں کوئی کامنی بیٹھی ہو۔ وہاں سے نکلی گنگا جی کی دھارا ایسی لگتی ہے، مانو اس کامنی کے شریر پر سے سرکی ہوئی اس کی ساڑی ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایسی الکا کو دیکھ کر تم پہچان نہ پاؤ۔ اونچے اونچے بھونوں والی الکاپوری پرورسا کے دنوں میں برستے ہوئے بادل کامنیوں کے سر پر موتی گتھے ہوئے جڑے جیسے چھائے رہتے ہیں۔"

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔ ۳۰۹)

اقبال نے ہمالہ کی رونق اور چمک کو ظاہر کرنے کے لیے اور آلودگی سے پاک وہاں کی ہواؤں کی اہمیت کو بتانے کے لیے اسے ہمالہ کا رومال قرار دیا ہے:

دامنِ موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

اسی نظم کے ایک اور بند میں شاعر نے فطرت کے حسین مناظر کی تصویر اس حسن و خوبی سے کی ہے کہ پہاڑ کی وادی میں نہ صرف حرکت پیدا ہوگئی ہے بلکہ یہ محاکات کی عمدہ مثال بھی ہے جس سے وہاں کے تمام مناظر آنکھوں میں رقص کرنے لگتے ہیں۔ ہمالہ کی وادی میں کالی گھٹاؤں کو گھڑسوار، تیز ہوا کے جھونکوں کو گھوڑے اور بجلی کی چمک کو چابک سے تعبیر کرکے ہمالہ کی وادی کو بازی گاہ بنا دیا ہے جہاں فطرت کے عناصر ہمہ وقت مختلف کھیلوں میں مصروف رہتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں شاعر نے ہوا میں اڑتی ہوئی کالی گھٹاؤں کو اس مست ہاتھی سے جس کے پاؤں میں زنجیر نہ ہو سے تشبیہ دے کر عجیب و غریب نظارہ پیش کیا ہے:

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی، جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

146
of 428

0.62KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

ایسے ہی نادر تشبیہات کالی داس نے بھی اپنی تخلیق میگھ دوتم میں بڑے آب و تاب سے استعمال کیے ہیں۔ پرومیگھ، شلوک-2، میں کالی داس نے پہاڑ کی چوٹی سے لپٹے ہوئے بادل کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی تشبیہ ہاتھی سے دی ہے۔ کچھ کے متعلق لکھتے ہیں:

"اساڑھ کے پہلے ہی دن وہ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے پہاڑی کی چوٹی سے لپٹا ہوا بادل ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ہاتھی اپنے ماتھے کی ٹکر سے مٹی کے ٹیلے کو بنانے کا کھیل کھیل رہا ہو۔"

کالی داس نے ہوا کے جھونکوں سے ادھر اُدھر گھومتے ہوئے بادلوں کی تشبیہ مٹی کے ٹیلوں کو اپنے ماتھے سے مار مار کر بنانے کا کھیل کھیلتے ہوئے ہاتھی سے دے کر موثر انداز میں فطری منظر کشی کی ہے۔ علامہ اقبال نے ایسے بادلوں کو فیل بے زنجیر کہا ہے اور پہاڑی علاقوں کو بازی گاہ یعنی کھیل کا میدان قرار دیا ہے جہاں فطرت ہاتھی اور گھوڑوں کا کھیل کھیلا کرتی ہے۔ ایک دوسرے بند میں صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اور ان جھونکوں کے اثرات سے پھولوں کی کلیوں پر جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو انتہائی شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صبح کی ٹھنڈی ہواؤں نے کلیوں پر ایسا اثر ڈالا کہ زندگی کے نشے میں ہر پھول کی کلی جھومتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ زندگی کے نشے میں پھول کی کلیوں کا جھومنا انتہائی لطیف خیال ہے:

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی

مثنوی سحر البیان کے مصنف میر حسن نے بھی ایک باغ کا منظر اس طرح کھینچا ہے:

گلوں کا لبِ نہر وہ جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

147
of 428

48.2KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

کالی داس نے اپنی تخلیق رگھونشم میں موسم بہار کا نقشہ پیش کرتے ہوئے کچھ ایسی ہی منظر کشی کی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ اچانک نوخیز منجری (flower of mango tree) سے بھرے آم کے پیڑ کی ڈالیاں، ہمالہ سے آتی ہوئی ہواؤں سے ایسی جھوم اٹھتی ہیں جیسے انہوں نے اداکاری سیکھنا شروع کر دیا ہو اور انہیں دیکھ کر حسد اور کدورت سے دور رہنے والے یوگیوں کا دل بھی جھوم اٹھا۔ (نواں سرگ، 33واں اشلوک، ص-81)

اقبال نے نظم "ابر کوہسار" میں بھی فطرت کا مطالعہ پیش کیا ہے اور خوب صورت تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے قدرت کے حسین مناظر کی بے حد خوب صورت تصویر کھینچی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے تمثیلی انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کوہسار کے بادل کو جان دار کی صورت میں پیش کیا ہے اور بادل کی زبانی اس کی تمام خوبیوں کو بیان کیا ہے اور بادل کی وجہ سے پہاڑ کی وادیوں میں جو حسین مناظر نظر آتے ہیں ان کی تصویر کشی کی ہے۔ شاعر نے یہ کہہ کر کہ ابر کوہسار کے دامن میں چاروں طرف پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور پہاڑ کی وادیوں کے ہرے بھرے گھاس کو مخمل کے بچھونے سے تشبیہ دے کر نہ صرف پہاڑ کی وادیوں کی حسین منظر نگاری کی ہے بلکہ ابر کوہسار کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

148
of 428

51.6KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

دراصل بارش کی وجہ سے ہی کسانوں کی کھیتی اور میدانوں کے سبزے لہلہاتے ہیں لیکن اس بات کو کہنے کے لیے شاعر نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔اس بند کا پہلا مصرع ملاحظہ کیجیے:

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

دُر افشاں (یعنی موتی) بلبلے کا استعارہ بالکنایہ ہے۔اس استعارے سے مصرعے میں جہاں حسن پیدا ہوا ہے وہیں بارش کے وقت کھیتوں اور میدانوں کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔کالی داس نے میگھ دوتم میں ایک جگہ بارش کے دنوں میں بادل اور بادل سے لپٹے ہوئے قوسِ قزح (اندر دھنش) کی منظر کشی کی ہے اور اس کے ساتوں رنگوں کو قیمتی جواہرات سے تعبیر کیا ہے۔اس رنگین فضا میں بادلوں کے سانولے رنگ کو کرشن جی کے چہرے کے رنگ سے اور اندر دھنش کے رنگوں کو کرشن جی کے تاج سے مشابہ قرار دے کر عجیب وغریب کیفیت پیدا کر دی ہے۔پندرہویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''دیکھو! سامنے سورج کی کانتی سے پربھاوت میگھ اٹھا ہوا اندر دھنش کا وہ ٹکڑا ایسی خوب صورت دکھائی پڑ رہا ہے، جیسے بہت سے جواہرات کی چمک ایک ساتھ یہاں لا کر اکٹھی کر دی گئی ہو۔اس اندر دھنش سے سجا ہوا تمہارا سانولا جسم اتنا خوب صورت لگنے لگا ہے جیسے مور مکٹ پہنے اور گوالے کا بھیس بنائے ہوئے خود شری کرشن آ کھڑے ہوئے ہوں۔'' (کالی داس-گرنتھاولی،ص301)

اس بند کے دوسرے مصرعے میں بادل کو شاہدِ رحمت اور ناقۂ حُدی خواں سے تعبیر کر کے بادل کی آواز کو نغمہ قرار دیا گیا ہے جس کی تاثیر سے ریگستان میں اونٹ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اس طرح بادل کے گرجنے کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔کالی

149
of 428

97.3KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

داس نے بھی بادلوں کے گرجنے اور اس کی گرجن سے ڈر کر محبوب کے آپس میں گلے سے لپٹنے کا بھی نقشہ کھینچا ہے اور بادلوں کی آواز کو دو چاہنے والے جوڑوں کے درمیان کی دوری ختم کرنے والا نغمہ قرار دیا ہے۔ 23ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

''اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اوپر ہی اوپر سے چونچ میں لے لینے چتر چاتکوں اور جھنڈ باندھ کر اڑتی ہوئی چانگیوں کو گناتے ہوئے سدھ جن، جب تم وہاں پہنچ کر گرجنے لگو گے تو سدھ جانتا ئیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔ اس گھبراہٹ بھرے ہم آغوش کو پا کر وہ تمہارا احسان مانیں گے''۔

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص۔302)

علامہ اقبال نے اس سرزمین کو ایک دلہن قرار دیا اور کالے کالے بادلوں کو دلہن کی زلف سے تعبیر کیا ہے جو ہوا کے جھونکوں سے دلہن کے کندھوں پر کبھی بکھر جاتی ہیں تو کبھی سنور جاتی ہیں۔ کالی داس نے بھی میگھ دوت میں ایک جگہ کہا ہے کہ بادل جب ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر اوپر اٹھے گا تو الکا پوری کی وہ تمام عورتیں جن کے شوہران سے دور ہیں اپنے لمبے بالوں کو اوپر اٹھا کے بڑے بھروسے سے تمہیں دیکھیں گی۔ کھلے ہوئے کالے بال گھنے بادلوں کی علامت ہے تو دوسری طرف یہ جدائی اور غم کی بھی علامت ہے۔

کالی داس نے ایک جگہ اور کالے کالے بادلوں کو کہیں نرم و نازک جڑوں سے تو کہیں پہاڑوں میں پائے جانے والے جواہرات اور کہیں موتیوں سے بھرے ہوئے کامنیوں کے جڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ کالی داس نے میگھ دوتم کے پہلے سرگ کے اٹھارہویں شلوک میں کہا ہے کہ پکے ہوئے پھلوں سے لدے آم کے پیڑوں سے گھرا ہوا آمرکوٹ پہاڑ پیلا ہوگا۔ اس کی چوٹی پر جب تم (بادل) نازک بالوں کی جڑوں کی طرح سانولا رنگ لے کر چڑھو گے تب وہ پہاڑی دیوتاؤں کی بیویوں کو دور سے ایسے دکھائی دے گا جیسے وہ زمین سے اٹھا ہوا ایسا جوہر ہو جس کے بیچ میں سیاہ اور چاروں طرف زرد ہو۔ اسی طرح 67واں شلوک میں وہ کہتے ہیں کہ اونچے اونچے محلوں والی الکا پوری پر برسات کے دنوں میں

150
of 428

97.3KB/s 6:41 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

برستے ہوئے بادل کامنیوں کے سر پر موتی گتھے ہوئے جوڑوں کی مانند چھائے رہتے ہیں۔

تیسرے بند میں بھی بادل اور بارش کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس مضمون کو نئے نئے انداز میں باندھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بظاہر شاعر صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادل کہیں برستا ہے اور کہیں نہیں برستا ہے۔ لیکن جہاں برستا ہے وہاں کی نہر کو بھنور کی بالیاں پہناتا ہے۔ دراصل پانی کی بوندوں سے نہر میں جو بھنور پیدا ہوتا ہے اسے شاعر نے بالیوں سے تعبیر کیا ہے۔ نہر کو گرداب کی بالیاں پہنانا صرف Poetic description ہے۔ اس مصرعے سے بھی بارش کی خوب صورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ اگر کسی جگہ سے بغیر برسے ہوئے بادل گزر جاتا ہے تو وہاں کے لوگ مایوس ہو جاتے ہیں اور بارش کے لیے ترسنے لگتے ہیں کیوں کہ بادل نوخیز سبزے کی امید ہے یعنی جو سبزہ ابھی ابھی زمین سے اُگتا ہے وہ پانی کی کمی سے سوکھ جاتا ہے۔ اس لیے اس کی زندگی کا دارومدار بارش پر ہے۔ اس بند کے آخری مصرعے میں شاعر نے بادل کے بننے کی سائنسی وجوہات کی طرف روشنی ڈالی ہے۔ بند ملاحظہ کیجیے:

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں، پروردۂ خورشید ہوں میں

بندھیاچل پہاڑ کی چوٹی (جسے نیچ بھی کہا جاتا ہے) پر کھلے ہوئے کدمبھ کے پیڑ اور بادلوں کے دیدۂ امید کے خواہش مند، ان پیڑوں کی بے قراری اور اس پہاڑ کے غاروں سے خوشبودار اشیا سے نکلتی ہوئی خوشبو کو بھی کالی داس نے محسوس کیا ہے۔ وہاں کے بازارِ حسن کی عورتوں کے ذریعے جنسی لذت حاصل کرتے وقت ان خوش بوؤں کا صحیح

151
of 428

34.5KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

استعمال کیے جانے کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ 27ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے مترا وہاں پہنچ کر تم تھکاوٹ مٹانے کے لیے 'نیچ' نام کی پہاڑی پر اتر جانا۔ وہاں پر پھولے ہوئے کدمب کے پیڑوں کو دیکھ کر ایسا لگے گا کہ تم سے ملنے کے لیے ان کے روم روم پھڑ پھڑا اٹھے ہوں۔ اس پہاڑی کی گپھاؤں میں سے ان خوش بودار اشیا کی خوشبو نکل رہی ہوگی، جنہیں وہاں کی رمنک (عاشق مزاج) دیشیاؤں کے ساتھ ہم بستری کرنے کے وقت کام میں لاتے ہیں۔ اس سے تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ وہاں کے شہری کتنی آزادی سے جوانی کے مزے لیتے ہیں''۔

(کالی داس۔ گرنتھاولی ص-303)

نروندھیا ندی کی اُچھلتی ہوئی لہروں اور ان لہروں پر گرد جھی سی دکھائی دینے والی چڑیوں کی چہکتی ہوئی قطاروں کی تصویر کشی کے علاوہ رُک رُک کر بہنے والی لہروں اور ان میں پڑی ہوئی بھنور (گرداب) کو عورتوں کی ناف سے اور بل کھاتی ہوئی ندی کی لہروں کو عورتوں کی اداؤں سے تشبیہ دے کر کالی داس نے پورے منظر کو دل فریب بنا دیا ہے۔ 30ویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''ہے مترا اتھینی کی طرف جاتے ہوئے تم اتر کر اس نروندھیا ندی کا بھی رس پی لینا، جس کی اُچھلتی ہوئی لہروں پر چڑیوں کی چہکتی ہوئی پنکتیاں کردھنی سی دکھائی دیں گی۔ جو بہت خوب صورت ڈھنگ سے رُک رُک کر بہہ رہی ہوں گی اور اس میں پڑا ہوا بھنور تمہیں اس کی نابھی جیسی دکھائی دے گا۔ کیوں کہ عورتیں ہاؤبھاؤ کے ذریعے ہی اپنے محبوب کو محبت کی بات بتلاتی ہیں۔'' (کالی داس۔ گرنتھاولی ص-303)

آخری یعنی چوتھے بند میں بھی شاعر نے بادل کی فضیلت کو خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے جس سے پہاڑی علاقوں، پہاڑی ندیوں پہاڑ کے آس پاس کے میدانوں، ان میدانوں میں کھلے ہوئے پھولوں اور اس علاقے میں بنے ہوئے جھونپڑوں کا منظر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ساتھ ساتھ بادل کی اہمیت کا احساس اپنے قاری

152
of 428

105KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

کو کرا دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ پہاڑ کے جھرنوں میں سمندر جیسی جو ہلچل ہے وہ بادل نے عطا کی ہے۔ شاعر نے یہ بتا کر کہ پرندے بادل کی آواز میں محو ہو جاتے ہیں، بادل کی آواز کو نغمہ قرار دے دیا ہے۔ اس بند کے تیسرے مصرعے میں شاعر نے بادل کو حضرت عیسیٰ قرار دے دیا ہے یعنی جس طرح عیسیٰ الیہ اسلام مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اسی طرح بادل بھی سبزے کو ہرے بھرے ہو جانے کے لیے حکم دیتا ہے۔ شاعر آگے کہتا ہے کہ بادل صرف غنچوں کو کھلانا ہی نہیں سکھاتا بلکہ اپنی رحمت سے کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی خوشی پیدا کر دیتا ہے جو خوشی محلوں میں پائی جاتی ہے۔

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سرِ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

کالی داس نے آمرکوٹ کے جنگل اور جنگل میں کدمب کے پیڑ اور اس کے پھولوں کے علاوہ ان پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدل میں کھلے ہوئے کمل کے پھول، پتیوں اور ان پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن، زمین کی سوندھی خوش بو اور ان خوش بوؤں کو سونگھتے ہوئے ہاتھیوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ جنگل میں ایک طرح کی ہلچل پیدا کر دی ہے۔ بائیسویں شلوک میں لکھتے ہیں:

''اور پھر جس سے تم پانی برساتے ہوئے چلے جا رہے ہوں گے اس وقت ادھ پکے اور ہرے پیلے کدمب کے پھولوں پر منڈلاتے ہوئے بھنورے، دلدلوں میں نئی پھولی ہوئی کمل کی پتیوں کو چرتے ہوئے ہرن اور جنگلی دھرتی کی سوندھی خوشبو سونگھتے ہوئے ہاتھی تمہیں راستہ بتلائیں گے۔'' (کالی داس۔ گرنتھاولی، ص 303)

153
of 428

105KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

بارش کی بوندوں کا انتظار نہ صرف پھولوں اور پودوں کو ہوتا ہے بلکہ آسمان میں اُڑتے ہوئے پرندوں کو بھی ہوتا ہے۔ بعض پرندے سواتی نکشتر کے پہلے بوند کو پی کر حاملہ ہوتے ہیں۔ کالی داس نے جھنڈ کے جھنڈ آسمان میں اڑتے ہوئے ان پرندوں کی بھی منظر کشی کی ہے جو بارش کی بوندوں کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنی چونچ میں روک لیتی ہیں۔ 23ویں شلوک میں کالی داس نے لکھا ہے:

''اور دیکھو! برسات کی بوندوں کو اُوپر ہی اُوپر سے چونچ میں لے لینے چتر چاتکوں
اور جھنڈ باندھ کر اڑتی ہوئی چاتکیوں کو گناتے ہوئے سدھ جن، جب تم وہاں پہنچ
کر گرجنے لگو گے تو سدھ حانڈنائیں گھبرا کر اپنے اپنے محبوب سے لپٹ جائیں گی۔''

(کالی داس۔ گرنتھاولی، ص302)

کالی داس نے پھولوں سے لدے ہوئے پہاڑ، پہاڑ پر بادلوں کے انتظار میں آنکھوں میں آنسو لیے کوئل اور ان کی کوک کی بھی منظر کشی کی ہے۔ 24ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے متر! میں جانتا ہوں کہ تم میرے کام کے لیے بغیر رُکے جلد جانا چاہو گے پھر
بھی میں سمجھتا ہوں کہ لوچ کے پھولوں سے لدے ہوئے ان خوش بودار پہاڑوں پر
تمہیں رکتے ہوئے ہی جانا ہوگا کیوں کہ وہاں کے مور آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر کر
اپنی کوک سے تمہارا خیر مقدم کر رہے ہوں گے۔'' (کالی داس۔ گرنتھاولی، ص304)

الکا نگری کے راستے میں پڑنے والے دشارن نام کے ایک دیش کے گلشن اور گلشن میں کھلے ہوئے پھول اور خاص کر کیوڑے کے سفید پھولوں سے آراستہ سفید گلشن کی تخلیق کی اور پھر ان کی تصویر کشی کی ہے۔ وہاں کے گاؤں کے مندروں میں لگتی ہوئی چڑیوں کے گھونسلوں، وہاں کے جنگلوں میں پکی ہوئی جامنوں کے پیڑ اور باہر سے آئے ہوئے ہنسوں کی بھی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ تمام منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ 25ویں شلوک میں لکھا ہے:

''ہے متر! جب تم دشارن دیش کے پاس پہنچو گے تب وہاں کی پھولی ہوئی پھلواریاں

154
of 428

51.8KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

پھولے ہوئے کیوڑے کی وجہ سے سفید دکھائی دیں گی۔ گاؤں کے مندر کا اونچا و
چڑیوں کے گھونسلوں سے بھرے ملیں گے۔ وہاں کے جنگل پکی ہوئی کالی جامنوں
سے لدے ملیں گے۔ اور ہنس بھی وہاں پر کچھ دنوں کے لیے آ کر بسے ہوں گے۔"

(کالی داس۔ گرنتھاولی ص302-303)

اقبال کی نظم "ہمالہ" اور "ابر کہسار" اور کالی داس کی شاہ کار "میگھ دوت" میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کالی داس نے اپنی اس بیانیہ نظم میں بادل کو اپنا پیغام بر بنا کر جہاں اپنی بیوی کے پاس اپنا پیغام بھیجا وہیں فطرت کا وسیع مطالعہ اور حسین منظر بھی پیش کیا۔ اقبال نے بھی اپنی ان دونوں نظموں میں کالی داس کی طرح بادل اور قدرت کے مناظر کا بیان جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے تخیل کی پرواز کس قدر بلند ہے۔

فطرت کے حسن کی منظر کشی کی اہمیت آج کے دور میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ پوری دنیا میں خلفشار برپا ہے۔ انسان حیوان سے بھی بدتر شے بنتا جا رہا ہے اور انسان ہی انسان کا دشمن ہوتا جا رہا ہے۔ مہلک ایٹمی ہتھیاروں کے تجربے ہو رہے ہیں اور انسانیت کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی توازن بگڑتا جا رہا ہے جس سے کائنات کی بقا کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس لیے ایسے منصوبے بھی بنائے جا رہے ہیں جس سے کائنات کو محفوظ رکھا جا سکے اور فطرت کے لطیف و نازک حسن کو برقرار رکھا جا سکے۔ ان منصوبوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اہلِ دنیا کو پھر سے فطرت کے حسین مناظر کی طرف متوجہ کیا جائے تا کہ ان کے اندر کی درندگی ختم ہو جائے اور معصومیت پیدا ہو سکے اور وہ بھی میر کی طرح یہ محسوس کر سکیں کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

❖❖❖

155
of 428

56.9KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع (ساہیوال، پاکستان)

علامہ اقبالؒ اور مسلم فلسطین کی گم شدہ میراث

Abstract:*Our National poet Allama Muhammad Iqbal was not only worried about the muslims of Sub conttant but about the whole muslim ummah.He was well aware of the Palestine issue.in this article scholars have probed in to Iqbal.s view about Palestine.s issue this article reveals the new aspects of Iqbal's thoughts.*

ہر قوم کو دیگر اقوام کی بالا دستی اور دباؤ کے بغیر آزادانہ طور پر اپنا نظام حکومت چلانے کی مکمل آزادی ہے اور کسی بھی ریاست کے باشندوں کو مذہبی، سیاسی اور سماجی طور پر اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہے۔ مغربی معاشروں میں رائج آزادی دراصل خوے غلامی ہی کی ایک مبہم سی شکل ہے۔ اصل میں آزادی متحرک ہونے اور تحرک کے احساس سے سرشاری کا نام ہے۔ رابرتو زیلویلونی نے اپنی کتاب

156
of 428

50.0KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

Self-Determination میں آزادی کے موضوع پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے :

"To be and to be free are the same thing for a person. When we act freely, we not only understand the act, but we also feel we have the power of evoking motives and making them our own."[1]

فرد سے قوم تک آزادی کے اس حق کو تسلیم کرنے کے باوجود، اس کے منفی پہلو نوآبادیاتی نظام کی شکل میں وقوع پذیر ہوئے۔ طاقت ور اقوام نے کم زور ریاستوں کو ان کے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کی شکل میں دیتے ہوئے مختلف زاویوں سے ان کی آزادی کو سلب کیے رکھا۔ ان کم زور اقوام کی غلامانہ ذہنیت کو پُر وقار قسم کا چغہ پہنانے کے بے شمار طریقے بھی ایجاد کیے گئے۔

خطۂ فلسطین بھی بدقسمتی سے ان علاقوں میں شامل ہے، جو عرصہ دراز سے اقوامِ عالم کی بے حسی اور عدم توجہی کا شکار ہے۔ فلسطین مذہبی، لسانی اور تہذیبی لحاظ سے مسلم تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ اس کا رقبہ 27009 کلومیٹر کو محیط ہے۔ اس کے مشرق و شمال میں جہاں پہاڑوں کا طویل سلسلہ ہے، وہیں مغربی علاقہ اپنی زرخیزی اور ہم وار زمینوں کی بدولت نباتات سے مالا مال ہے۔ یوں تو فلسطین کے بہت سے شہر تاریخی پس منظر اور جغرافیائی اہمیت کے حامل ہیں، لیکن 'القدس' سب سے مشہور و معروف ہے۔ قبۃ الصخرہ اور مسجد عمرؓ اسی شہر میں واقع ہیں۔ 'القدس' سے متصل دوسرا شہر 'الخلیل' ہے، جس میں مسجد ابراہیم ہے۔ اس شہر کی وجہ تسمیہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کا مزار اقدس بھی یہیں واقع ہے۔

فلسطین امن اور آشتی کا گہوارہ اور صدیوں سے مسلم دنیا کا حصہ رہا ہے۔ مسلم اقتدار کے زیرِ اثر تینوں آسمانی مذاہب کے پیروکار یہاں امن کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ آج کے فلسطین کا المیہ یہ ہے کہ استعماری سازشوں سے آج یہ ملک صرف تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ فلسطین انتظامی محدود اختیارات رکھنے کے باوجود، زمین سے محروم ہے، جو کسی بھی ریاست کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ فلسطین میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن 1878ء میں حیفہ کے مقام پر پہلی نوآبادکار بستی بسائی گئی۔ 1896ء میں ویانا کے

157
of 428

47.5KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

صحافی تھیوڈور ہرزل نے سب سے پہلے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اپنی رپورٹ میں اس نے کہا تھا:

"مجھے یہ یقین ہے کہ ہم ایک دن کرۂ ارض پر ایک یہودی ریاست قائم کر کے ہی دم لیں گے! چاہے وہ ارجنٹینا میں ہو یا فلسطین میں! اس ریاست کے قیام کے بغیر دنیا بھر کے یہودی آزادی، عزت اور خوش حالی کی زندگی گزارنے کے قابل نہ ہوں گے۔" [2]

ہرزل نے صرف اپنی رپورٹ پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ برطانیہ سمیت دنیا بھر کی بڑی طاقتوں کی حمایت بھی حاصل کر لی۔ ہرزل نے اپنی سفارت کاری کے ذریعے اُس وقت کی عثمانی سلطنت کو فلسطین کے بدلے استنبول میں ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے قیام اور اس کے تمام غیر ملکی قرضے ادا کرنے کی تجویز بھی پیش کی، جسے سلطان عبدالحمید ثانی نے مسترد کر دیا۔ سلطان نے فلسطین میں آنے والے یہودی زائرین کے لیے سرخ پاسپورٹ کا اجرا بھی کیا، جس کی وجہ سے کسی یہودی کو تین ماہ سے زیادہ فلسطین میں قیام کی اجازت نہ تھی۔ ان تمام کوششوں کے باوجود، بین الاقوامی سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان قوتوں نے ترکی کی 'ینگ ترک پارٹی' میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر کے سب سے پہلے سلطان عبدالحمید ثانی عثمانی کو معزول کیا۔ اس کے بعد شریف مکہ کے ذریعے عربوں کی آزادی اور اتحاد کی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ برطانیہ ایک طرف شریف مکہ کے ساتھ مذاکراتی عمل سے گزر رہا تھا تو دوسری طرف اس کے عالمی صیہونی اداروں سے بھی مکمل رابطے تھے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کی یہودیوں سے جو گفت و شنید ہوئی، اس کا نتیجہ وہ خط ہے، جو برطانوی سکریٹری خارجہ مسٹر بالفور نے روتھ شیلڈ کو لکھا۔ خط میں کہا گیا تھا:

"His mejesty's Government view with favour the establishment in Palestine of a national home for the Jewish people, and will use their best endeavours to facilitate the achievement of this object." [3]

158
of 428

47.5KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اعلانِ بالفور کے ساتھ ہی دنیا کے مختلف ممالک کے یہودی ایک سیلاب کی شکل میں فلسطین کی طرف اُمڈ پڑے۔ شہری علاقوں اور منڈیوں سے بتدریج عربوں کی بے دخلی شروع ہوئی۔ 1920ء میں منعقدہ مشرق وسطیٰ کانفرنس میں ڈاکٹر ویزمین نے اس سوال ''اسرائیل کے قیام کے بعد عربوں کا حشر کیا ہوگا؟'' کے جواب میں کہا:

''وہ ہم فلسطین کو خالص یہودی ریاست بنانا چاہتے ہیں، اس کے باوجود جو عرب فلسطین میں رہنا چاہیں گے، انھیں اس کی اجازت ہوگی! لیکن جو نہیں رہنا چاہیں گے، ان کے لیے مصر ہے، شام ہے اور مشرق کی پہاڑیوں کے اُفق سے اُس پار وسیع صحرا ہے، جہاں سے آکر وہ یہاں آباد ہوئے تھے۔''[4]

نومبر 1916ء میں شریف مکہ کی عمل داری کا اعلان ہو چکا تھا، لیکن 'اعلانِ بالفور' نے اسے بدظن کر دیا۔ جنگ جاری تھی اور شریف مکہ اور اس کے حواری اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ جنگ کے خاتمے پر شریف حسین کو یقین دلایا گیا کہ برطانیہ عرب اقوام کے اتحاد کا خواہش مند ہے۔ دسمبر 1917ء تک برطانیہ جنوبی اور مرکزی فلسطین پر مکمل طور پر قابض ہو چکا تھا، جس میں یروشلم بھی شامل تھا۔ برطانوی فوج کے سپہ سالار لارڈ ایلن بے نے فاتح کی حیثیت سے پرانے شہر کا دورہ کیا اور کہا: آج صلیبی جنگیں ختم ہوگئی ہیں۔[5]

فلسطینی عوام نے ملک پر برطانوی راج اور اعلانِ بالفور کے ذریعے فلسطین میں یہودی آبادکاری کی شدید مخالفت کی۔ فلسطین کی قومی تحریک بھی انھی خطوط پر پروان چڑھی۔ فلسطین کی قومی تحریک کا باقاعدہ آغاز 27 جنوری سے 10 فروری 1919ء تک یروشلم میں منعقد ہونے والی پہلی عرب فلسطین کانفرنس کے موقع پر ہوا۔ 1919ء سے 1928ء تک ایسی سات کانفرنسیں ہوئیں، جن کے نتیجے میں موسیٰ کاظم الحسینی اور الحاج سید امین الحسینی تحریک آزادیِ فلسطین کے قائدین کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے۔ یہودی آبادکاری کے خلاف اس تحریک کو بُری طرح کچل دیا گیا اور اس کے قائدین کو شہید کر دیا گیا۔[6]

159
of 428

84.0KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اس کا ردِعمل مسلح مزاحمت کی شکل میں ہوا۔ برطانوی قیادت کے خلاف مسلح جدوجہد کا باقاعدہ آغاز فلسطینیوں کی خفیہ تنظیم 'الجہاد یہ' نے کیا، جس کی قیادت شیخ عزالدین القسام کر رہے تھے۔ شیخ کی رہنمائی میں فلسطینی جدوجہد کو یک سوئی اور اتحاد کی دولت میسر آئی۔

شیخ القسام 20 نومبر 1935ء میں برطانوی حکومت سے آزادی کے حصول کی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔ ان کی مزاحمت مختصر عرصے کے لیے تھی، لیکن اس جدوجہد اور خود شیخ کی شہادت کے دُور رس اثرات مرتب ہوئے اور مسلح جدوجہد کا دائرہ کار پھیلتا چلا گیا، یہاں تک کہ برطانیہ کا اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور اس نے اپنے اتحادی عرب حکمرانوں سے مدد چاہی۔ عرب حکومتیں عملی طور پر برطانیہ کی حامی تھیں، چناں چہ انھوں نے فلسطینی عوام سے بغاوت ختم کرنے کی اپیل کی۔ بقول ظفر الاسلام خاں، عرب کے شاہ سعود، عراق کے شاہ غازی اور اردن کے امیر عبداللہ نے اکتوبر 1936ء میں ایک ہی جیسی اپیلوں کے ذریعے فلسطینی عوام سے درخواست کی کہ وہ برطانیہ کے خلاف مسلح بغاوت ختم کر دیں۔ [7]

فلسطین میں ہونے والی بغاوت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے 'شاہی کمیشن' تشکیل دیا گیا۔ فلسطینی عربوں نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ 'شاہی کمیشن' نے جولائی 1937ء میں تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی۔ کمیشن کے مطابق، فلسطین کا تین حصوں میں تقسیم کیا جانا ضروری تھا۔ اپنی تجویز میں کمیشن نے کہا تھا کہ اس سارے قضیے کے تین فریق، یعنی برطانیہ، عرب اور یہودی ہیں۔ فلسطین کا ایک ایک حصہ ان میں بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔ [8]

تقسیم فلسطین کی تجویز کو نہ صرف فلسطینی عوام نے رَد کر دیا، بلکہ عالم اسلام میں بھی اس کا شدید ردِعمل سامنے آیا۔ برعظیم پاک و ہند کے عوام و خواص میں قومی بے داری کے جذبات اُن دنوں عروج پر تھے۔ انھیں اپنے ملّی شعور کا بھرپور ادراک ہو چکا تھا۔ اردو شاعری میں بھی یہی ملّی و قومی شعور نہ صرف برعظیم کی مسلم قومیت کے فکر و عمل کی

160
of 428

45.1KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

نمایندگی کر رہا تھا، بلکہ دنیا کے دیگر اسلامی ممالک میں موجود مظلوم مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانا بھی اپنا قومی فریضہ سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے خیال میں:

''ہماری ملّی شاعری کا ایک پہلو وہ ہے، جس میں ہندستان کے علاوہ دوسرے خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی حمایت میں آواز بلند کی گئی ہے اور ہمارے بعض شعرا نے صحیح ملّی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے ان مسلمانوں کے دکھ درد کو محسوس کیا ہے، محض اس لیے کہ بہ لحاظ مذہب یہ بھی ہماری ملّت کے افراد ہیں۔ فلسطین و اہل فلسطین، جو برسوں سے اپنے دشمنوں سے معرکہ آرا ہیں، مسلمانوں کے لیے نہایت جذباتی موضوع ہے۔'' [9]

برعظیم میں اقبال پہلے شاعر تھے، جن کی جدید مشرقی اور مغربی علوم پر یکساں دسترس تھی۔ وہ نوآبادیاتی نفسیات اور سامراجی چالوں سے خوب آگاہ تھے، اس لیے ان کی شاعری اور نثر میں نوآبادیاتی سوچ کے بارے میں منطقی اور سائنسی اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے فلسطین کی صورتِ حال پر مسلسل نظر رکھی۔ اقبال کے وسیع ترین ملّی شعور میں جنگ بلقان طرابلس غرب پر اٹلی کے حملے اور فلسطین کے مسئلے نے ایک طوفان بپا کیے رکھا۔ فلسطین اور دیگر مسائل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار انھوں نے ہر فورم پر کیا۔ اقبال کے پس کریہ (Nostalgia) کا سنہری حصہ ان کا دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی کے سفر میں مصر سے بہ ذریعہ ریل فلسطین روانہ ہونا اور وہاں نو روز کا قیام بھی ہے۔ اس سفر میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا شوکت علی اور حافظ عبدالرحمٰن ان کے ہم رکاب تھے۔ اس دورے کا مقصد مفتی اعظم فلسطین، سید امین الحسینی کی دعوت پر مؤتمر عالم اسلامی میں شریک ہونا تھا۔

فلسطین میں قیام کے دوران انھوں نے یروشلم کے مقاماتِ مقدسہ، کلیسائے مولد مسیح، بیت اللحم میں حضرت داؤد کی جاے ولادت کے ساتھ انبیاے کرام اور ازواج مطہرات کی قبور کی زیارت کی۔ کانفرنس کے دوران انھیں ایک نشست میں نائب صدر

161
of 428

45.1KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

بنا کر اسٹیج پر بٹھایا بھی گیا۔ [10]

فلسطین میں منعقدہ کانفرنس کے مندوبین میں اقبال کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ انھیں کئی سرکاری اور نجی ظہرانوں اور عصرانوں میں معزز مہمان کے طور پر مدعو کیا گیا۔ اقبال کا دورۂ فلسطین میں فطری انہماک دیکھنے والا تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مطابق:

> ''القدس کے دارالایتام میں اقبال اور میر صاحب نے بچوں کی بنائی ہوئی اشیا دیکھیں اور مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ یہاں نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی تھا۔ ادارے کی طرف سے آپ کو قرآن مجید کا ایک خوب صورت نسخہ ہدیہ کیا گیا۔ اقبال نے مٹھائی کے لیے پانچ پاؤنڈ بچوں کی نذر کیے۔ اسی طرح ایک شب فتح اندلس کے متعلق ڈراما دکھایا گیا اور حاضرین کے اصرار پر علامہ اقبال کو بھی ڈرامے کی مناسبت سے فارسی قطعہ بعنوان 'الملک للہ' سنانا پڑا۔'' [11]

اقبال کی معروف نظم 'ذوق و شوق' ان کے سفرِ فلسطین کا ماحصل ہے۔ اس نظم کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے۔ اس نظم میں فلسطین کی نارنگیوں کے باغات، گرم پانی کے چشمے اور تاریخی مقامات، حسن کا ایک خوب صورت تلازمہ بنتے دکھائی دیتے ہیں:

قلب و نظر کی زندگی، دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ اضم دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگ نخیل دھل گئے
ریگ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں

162
of 428

42.9KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

'ذوق وشوق' کے پس منظر میں 'فلسطین کے حسن ازل' کی تفہیم کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی رقم طراز ہیں:

''اقبال کے زبردست تمثیلی احساس اور واقعیت و حقیقت پسندی کا کمال ہے کہ فلسطین کی مناسبت سے انھوں نے عرب ہی کے ریگ زار کی تصویر کشی کی ہے، جب کہ یہی تصویر نظم کے موضوع و مقصود کے لیے بھی موزوں ترین ہے۔ اقبال نے سرزمین فلسطین پر وہاں کے جغرافیے اور تاریخ کی روشنی میں فطرت کی ایک نہایت دل نواز اور خیال انگیز تصویر کھینچی ہے اور وہ منظر ایسا حسین اور دل کش ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے انسان اس میں کھو جاتا ہے۔'' 12

تقسیم فلسطین کی سازش سامنے آئی تو اقبال کا صدمہ دیدنی تھا۔ اپنے ایک خط میں قائداعظم محمد علی جناح کو لکھتے ہیں:

''میں فلسطین کے مسئلے کے لیے جیل جانے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ فلسطین نہ فقط ہندستان کے لیے، بلکہ اسلام کے لیے بہت عظیم ہے — یہ ایشیا کا دروازہ ہے، جس پر بُری نیت سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔'' 13

تقسیم فلسطین کی تجویز کے دنوں میں اقبال کی صحت خاصی بگڑ چکی تھی۔ یہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے، اس کے باوجود، وہ اس صورتِ حال سے مسلسل بے چین اور افسردہ رہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے مطابق:

''اپنی زندگی کے آخری ایام میں اقبال کو تقسیم فلسطین کے تصور نے مسلسل بے چین رکھا۔ اقبال نے اس وقت ہی سے فکری اور عملی پیش بندیاں شروع کر دی تھیں، جب برطانوی سامراج ابھی مسئلہ فلسطین ایجاد کرنے میں کوشاں تھا۔ اس محاذ پر بھی اقبال نے اپنی سیاسی فکر اور اپنے فنی اعجاز سے کام لیا، مگر برطانیہ اور دنیائے عرب میں رائے عامہ کی بے داری اور کل ہند مسلم لیگ کی عملی جدوجہد کے باوجود برطانوی سامراج اپنے ارادوں پر قائم رہا۔'' 14

163
of 428

46.2KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اقبال 30 جولائی 1937ء کو فارکوہرسن کے نام اپنے خط میں فلسطینی عوام کی وکالت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عربوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے، میں اس کو اسی شدت سے محسوس کرتا ہوں، جتنے مشرق قریب کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرنے پایا۔ انگریز قوم کو بے دار کر کے اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُن وعدوں کو پورا کرے، جو اس نے انگلستان کے نام پر عربوں سے کیے ہیں۔'' 15

حضرت علامہ کے خیال میں فلسطین اور فلسطینی عوام کے حقوق غصب کرنے میں برطانیہ کے ساتھ ساتھ مجلس اقوامِ عالم (League of Nations) اور عرب ملوکیت بھی برابر کے شریک تھے، چناں چہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

یہی شیخ حرم ہے، جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

ایک جگہ عرب ممالک کے بادشاہوں اور ان کی پالیسیوں پر طنز کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''عربوں کو چاہیے کہ اپنے قومی مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں، کیوں کہ بحالاتِ موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر و ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی فیصلے یا کسی صائب نتیجے پر پہنچ سکیں۔'' 16

'اقوامِ متحدہ' کی پیش رو مجلس اقوامِ عالم کا رویہ بھی مسئلہ فلسطین پر انتہائی سرد مہری سے عبارت تھا۔ اقبال اس کا مکمل ادراک رکھتے تھے، چناں چہ اس کی پالیسیوں اور رویوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''لیگ آف نیشنز (جمعیت اقوامِ عالم) کو چاہیے کہ بیک آواز اس ظلم و طغیان کے

164
of 428

29.4KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور برطانوی باشندگان کو سمجھائے کہ عربوں سے ناانصافی نہ کریں۔'' 17

حضرت علامہ کی شاعری میں، عالمی منظر نامے میں جمعیت اقوامِ عالم کے منفی کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل ، حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصد ہے فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیتِ آدم
تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ادبی منظر نامے پر جو آوازیں اٹھیں، وہ زیادہ تر آہ و بکا، شور و غوغا یا طنزیہ اسلوب کی غمازی کرتی ہیں؛ جب کہ حضرت علامہ نے منطقی استدلال اور فلسفیانہ شعور کے ساتھ مسئلہ فلسطین کو شعر و سخن کا موضوع بنایا۔

حضرت علامہ ضربِ کلیم میں شامل ایک نظم 'فلسطینی عرب سے' میں فلسطینی عوام سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فلسطینی عرب! تیرے وجود میں جو شعلہ جوالہ ہے، اس سے زمانے کو جلا کر خاکستر کیا جا سکتا ہے۔ تیرے مسائل کا حل اہلِ یورپ یا جمعیت اقوام کے پاس نہیں، کیوں کہ یہ دونوں یہودیوں کی معاشی پالیسیوں کے تابع ہیں۔ تو امن کے بجائے اپنی خودی کو بے دار کر، کیوں کہ امتوں کی نجات خودی کی نشو و نما اور تجلی کی مرہونِ منت ہوتی ہے:

165
of 428

29.4KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں، وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے، غلامی میں امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

فلسطین ہر لحاظ سے عالم اسلام کا حصہ ہے، لیکن اسے تاریخی طور پر یہودیوں کی ملکیت ثابت کرنے کے لیے بے شمار تاویلیں پیش کی گئیں۔ کیتھ وہائٹ ولیم نے اپنی کتاب **قدیم اسرائیل کی ایجاد** میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اسرائیل مؤثر اور جذباتی انداز میں آثارِ قدیمہ کی دریافتوں کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ [18]

اسرائیل کے قیام کو جائز قرار دینے کے لیے برطانوی حکام نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسرائیل کی سرزمین عرصہ دراز سے خالی پڑی تھی، یہاں طویل عرصے تک یہودیوں کی حکومت رہی، اس لیے ان کا گذشتہ دو ہزار سال سے اس سرزمین کے ساتھ ایک جذباتی تعلق ہے، اسی بنا پر یہاں اسرائیل کا قیام ضروری ہے۔ [19]

اقبال اپنی علمی بصیرت کے سبب مشرقِ وسطیٰ سے متعلق عالمی طاقتوں کے مذموم ارادوں سے بخوبی آگاہ تھے، چناں چہ اسرائیل کے قیام (1948ء) سے کئی سال پہلے **ضربِ کلیم** میں شامل ایک نظم 'شام و فلسطین' میں وہ کہتے ہیں کہ اگر اس دعوے کو تسلیم کر لیا جائے کہ فلسطین پر یہودیوں کا حق صرف اس لیے ہے کہ وہ کبھی یہاں قابض تھے تو پھر ہسپانیہ پہ مسلمانوں کا حق کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا، جنھوں نے سات سو سال تک وہاں اپنی حکمرانی کی عمدہ مثال قائم کی۔ ان اشعار میں منطقی انداز سے یہودیوں کے دعوے کی نفی کی گئی ہے:

زندانِ فرانسیس کا ہے خانہ سلامت

166
of 428

83.5KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

پُر ہے مے گل رنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہل عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و عنب کا

اقبال کی اپنے عہد کے معروضی حالات پر گہری نظر تھی اور یہ شعور رکھتے تھے کہ خوے غلامی ایک نسل سے دوسری نسل میں سرایت کر جاتی ہے اور رفتہ رفتہ امتیں اس جرأت رندانہ سے محروم ہو جاتی ہیں، جن سے ان کا اجتماعی تشخص ابھرتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اقبال کی شاعری کے ماخذ و مصادر میں قرآن سب سے مقدم ہے، اس لیے فلسطین سے ہزاروں کوس دُور ہونے کے باوجود فلسطینی بھائیوں کے غم واندوہ میں شریک ہونا عین فطرتِ اقبال کا حصہ ہے اور بجز نکتہ ایمان کی تفسیر کے اور کچھ نہیں۔

.....

حواشی اور تعلیقات:

1- Roberto, Zaroleoni, *Self-Determination* Tranlated by Vigiliobiasial Chicago: Forum Books, 1963, p-6

2- ڈاکٹر خالد سہیل: **ایک باپ کی اولاد**۔ لاہور: گورا پبلشرز، 1994ء، ص 61

3- Dr. M Saleh Mosin, *History of Palestine*, Cairo, Al-Fala Foundation, 2005, p-355

4- ممتاز لیاقت: **تاریخ بیت المقدس**۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1983ء، ص 246

5- بالکل اسی طرح 1920ء میں شاہ فیصل سے دمشق چھین کر جنرل گوراؤ سب سے پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار پر گیا اور اپنا جوتا قبر پر رکھ کر بولا: ادھر دیکھ صلاح الدین! ہم واپس آ گئے ہیں۔

167
of 428

43.8KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اسی طرح ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد امریکی صدر جارج بش کے منہ سے "صلیبی جنگوں" جیسے الفاظ نکلے، جنھیں بعد میں زبان کے پھسل جانے سے تعبیر کیا گیا، حالاں کہ جدید دور میں بھی صلیبی جنگوں کے عہد کا تعصب آج کے امریکا اور یورپ کے تہذیبی لاشعور کا حصہ ہے۔

6- حکومت برطانیہ نے اس مزاحمت کو کچلنے کے لیے باقاعدہ فوج استعمال کی۔ دونوں قائدین کو گرفتار کرلیا۔ سید موسیٰ کاظم الحسینی کو اس قدر سنگ دلی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر اکیاسی برس تھی۔ علامہ اقبال کے دورۂ فلسطین کی میزبانی کے فرائض بھی موسیٰ کاظم الحسینی اور امین الحسینی نے انجام دیے تھے۔

7- خفر الاسلام خاں، فلسطین کا تاریخی جائزہ۔ مترجمہ آصف فرخی۔ مطبوعہ کراچی: دنیا زاد، شمارہ 4، نومبر 2001ء، ص 46

8- ایضاً، ص 47

9- ڈاکٹر ساجد امجد، **اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات**۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 2004ء، ص 112

10- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: **علامہ اقبال: شخصیت اور فکر و فن**۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 2010ء (دوم) ص 185

11- ایضاً، ص 188

12- ڈاکٹر عبدالمغنی: **اقبال اور عالمی ادب**۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، 1982ء، ص 273

13- پروفیسر حمید رضا صدیقی: **اقبال کی سیاسی بصیرت**۔ ملتان: بیکن بکس، 2005ء، ص 41

14- فتح محمد ملک، **فلسطین اردو ادب میں**۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2000ء، ص 9

15- ایضاً، ص 233

16- ایضاً، ص 10

17- ایضاً، ص 237

18- ڈاکٹر مبارک علی: اسرائیل اور فلسطین، تاریخ نویسی کے رجحانات، مطبوعہ کراچی: دنیا زاد، شمارہ 4 نومبر 2001ء، ص 64

❖❖❖

168
of 428

102KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد (آرہ، بہار)

اقبال اور تصوف

اقبال کا شمار اردو اور فارسی کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا بھی جائے گا، اور ان کی شاعری کے سینکڑوں گوشے منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان کی شاعری میں مختلف شیڈس ہیں۔ ان میں ایک تصوف بھی ہے۔ انھیں صوفیوں سے بے پناہ عقیدت ہے۔ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کے متعلق لکھتے ہیں :

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری، فیض عام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

حضرت مجدد الف ثانی کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں :

169
of 428

102KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہ باں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

اور آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ قلندر شاہ ارزانی کے مزار پر حاضر ہوئے تو فرمایا:

نہ تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

یہ الگ بات ہے کہ اقبال صوفیائے کرام پر نظمیں لکھتے رہے اور تصوف پر اشعار کہتے رہے لیکن تصوف کے سلسلے میں خاصے مشکوک بھی رہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کنفیوزن ان کو اپنے عہد کے صوفی نما لوگوں کو دیکھ کر تھا یا تعلیمات تصوف پر۔

اگر ان کی شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے صوفی اور خانقاہی نظام سے خاصے بے زار تھے لیکن ان کے خطوط اور ان کی دوسری نثری تحریروں کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ وہ تعلیمات تصوف کے حامی بھی تھے اور منکر بھی۔ اقبال اپنی تالیف ''تاریخ تصوف'' میں مجدد الف ثانی کے حوالہ سے تصوف کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''تصوف شعار حق اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسلامی اقوام کی تاریخ میں ایسے بزرگ ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہوئے اور ہوتے رہیں گے جن کی زندگی کا نصب العین یہی خلوص رہا ہے۔ ان کی زندگیاں عام مسلمانوں کے لیے نشان راہ کا کام دیتی رہی ہیں اور

170
of 428

54.6KB/s 6:42 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

یہ بلا ابا تک جاری رہے گا۔ یہ بزرگ حقیقی معنوں میں جاں نشینان پیغمبر ہیں۔ راقم الحروف
ان کے کسی قول یا فعل پر اعتراض کرنے کو بدذوقی اور خسران تصور کرتا ہے اور ان کی صحبت
میں ایک لمحہ بسر کرنے کو دنیوی آرائش و آرام کی صد سالہ زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔" [1]

اور دوسری جگہ یہی اقبال علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں تصوف کو بھی نظریہ بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس
نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔" [2]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اقبال تصوف کے سلسلہ میں کبھی ایک نظریہ پر قائم نہ رہ سکے۔ "اسرار خودی" میں حافظ کے صوفیانہ نظریہ کو "گوسفندی مسلک" قرار دیتے ہوئے چونتیس (34) اشعار کا ایک بند لکھا لیکن یہی اقبال "اسرار خودی" کے دوسرے ایڈیشن میں اسے نکال دیتے ہیں۔

اقبال صوفیانہ اصطلاحات سے خوب خوب واقف تھے۔ پیری و مریدی، فقر و قناعت، قلندر اور قلندری، خرقہ و دستار اور اس طرح کی دوسری اصطلاحیں اقبال کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں، لیکن ان اصطلاحات کو اقبال کبھی مثبت بھی قرار دیتے ہیں اور کبھی منفی بھی مثلاً وہ قلندر کی بے پناہ تعریف کرتے ہیں۔ خود اپنے کو "دیگر دانائے راز آید کہ نہ آید" کے ساتھ ساتھ قلندر بھی کہتے ہیں اور فرماتے ہیں :

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

اور دوسری جگہ قلندر کے اوصاف بیان کرتے ہوئے قلندر کے متعلق کہتے ہیں :

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

لیکن "ارمغان حجاز" کی ایک غزل میں قلندری کو جادوگری سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

171
of 428

50.2KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ
کنارِ دریا خضر نے مجھ سے کہا کہ بہ اندازِ محرمانہ
سکندری ہو، قلندری ہو، یہ سب طریقے ہیں ساحرانہ

اقبال صوفیوں اور فقیروں کی اس قدر تعریف کرتے ہیں :

تمنا دردِ دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ان اشعار میں اقبال ماضی کے صوفیوں کی طرف اشارہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ حال کے صوفیوں کی خدمت کرنے یا ان کے راستے پر چلنے کے لیے مشورہ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو "یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں" وہی اقبال اپنے دور کے صوفیوں کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں :

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

.....

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی ہے، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

.....

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی

کلیاتِ اقبال میں اس طرح کے بیسیوں اشعار آپ کو اور بھی ملیں گے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں مالی منفعت اور سماجی اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے بعض لوگ

172
of 428

50.2KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اہل تصوف اور صوفی جیسی شکل وصورت بنا لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قصور کس کا زیادہ ہے۔ ان صوفی نما اشخاص کا، یا ان لوگوں کا جو انھیں اہل تصوف اور ان کے طرزِ عمل اور فکر کو صوفی فکر مانتے ہیں۔ ایسے صوفی نما اشخاص صرف اقبال ہی کے عہد میں نہیں بلکہ پہلے بھی پیدا ہوئے اور بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔ آج سے تقریباً ساڑھے نو سو سال قبل ابوالحسن ابوالشجہ کی ایک عبارت شیخ علی ہجویری نے "کشف المحجوب" میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوشجہ فرماتے ہیں :

"تصوف آج بے حقیقت نام ہے لیکن پہلے یہ نام کی حقیقت تھی یعنی صحابہ و سلف رحمہم اللہ کے وقت میں یہ نام نہ تھا لیکن اس کے معنی ہر ایک میں موجود تھے۔ اب نام ہے اور معنی نہیں، یعنی معاملات تصوف تھے، دعویٰ نہ تھا۔ اب دعویٰ ہے معاملات نہیں۔" [3]

آج سے تقریباً ساڑھے نو سو سال قبل ابوالشجہ نے تصوف کے زوال اور اہل تصوف کے حال پر رونا رویا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساڑھے نو سو سال کے عرصہ میں انسانی ضمیر کس قدر مردہ ہو چکا ہوگا۔ حالات کس قدر بگڑ چکے ہوں گے لیکن اسی ساڑھے نو سو سال کے عرصہ میں برصغیر کو چھوڑیے، خود ہندوستان میں بے شمار صوفی نظر آتے ہیں جن سے نہ صرف تصوف کی آبرو بچی ہوئی ہے بلکہ دنیائے اسلام کو ان پر ناز ہے۔ چاہے خواجہ خواجگان چشت محی ملت والدین حضرت معین الدین چشتی سنجری ہوں یا محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء ہوں یا مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہوں یا حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی ہوں یا مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی سرہندی ہوں یا آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ ارزانی ہوں۔ ایک بات اور جس طرح بے عمل، بے عقیدہ، سماج میں برائی پھیلانے والے ناجائز انداز سے دولت جمع کرنے والے، حرام کو حلال سمجھنے والے، احمد اور محمد نام رکھ کر مسلمان کہلانے والوں کو دیکھ کر اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اسلام یہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح بعض صوفی نما لوگوں کو دیکھ کر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تصوف یہی ہے، یا ان صوفی نما حضرات کے کارنامے کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھنا چاہیے

173
of 428

71.6KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

کہ تعلیماتِ تصوف یہی ہیں، بلکہ تصوف قرآن وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں۔ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء ابوسلیمان کا قول نقل کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان کہتے ہیں :

''جو بات بھی میرے دل پر گزرتی ہیں اسے قبول نہیں کرتا جب تک دو گواہ یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اس پر گواہی نہ دیں۔''

حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی فرماتے ہیں :

''اصل حجت کتاب وسنت ہے۔''

لہٰذا جو کتاب وسنت کا پابند نہ ہو فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول اللہ کے مقام پر فائز نہ ہو اور انسان دوستی کا علم بردار نہ ہو، ہرگز اور ہرگز وہ صوفی نہیں ہوسکتا، ایسے شخص کو صوفی کہنا اور صوفی سمجھنا غلط ہے۔ چاہے اقبال ہو یا کوئی اور۔

اقبال کو خانقاہوں میں لذتِ اسرار کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پیرِ حرم کو رسم و رہ خانقاہی کو چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں ''خدایانِ خانقاہی مجھ کو اپنا حریف سمجھ رہے ہیں'' اور یہ بھی کہتے ہیں :

''انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ'' اور بتاتے ہیں :

میرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسہ میں ہے باقی نہ خانقاہ میں

اور آخر میں کہتے ہیں :

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

اقبال بڑے شاعر ہیں، فلسفی ہیں، اسلامی مفکر ہیں۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم، لیکن ان کے عہد کا سب سے بڑا فتنہ قادیانیت تھا۔ ان ہی کے ایک ہم وطن کاذب نے نبوت کا دعویٰ کیا، تو اس فتنہ کو دبانے کے لیے کیا کوئی مفکر، فلسفی یا دانش ور سامنے آیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایک خانقاہ کے بوریا نشیں اور اپنے عہد کے معروف عالمِ دیں اور

174
of 428

62.4KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

عظیم المرتبت صوفی شیخ الاسلام حضرت شاہ غلام نجف نوے (90) سجادہ نشین خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی نے جس طرح فتنۂ قادیانیت کو دبانے کے لیے نہ صرف تحریک چلائی بلکہ اسے روکنے کے لیے اپنی زمین داری کے لگان کا بڑا حصہ اس پر صرف کیا اور اپنے خانوادے کے چند افراد کو پنجاب بھیج کر مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ساتھ دیا۔ یا اس سے قبل اکبر کے پیش کردہ باطل دین 'دین الٰہی' کے خلاف خود اس خانقاہ کے بانی آفتاب شریعت حضرت دیوان شاہ ارزانی نے حضرت بایزید روشان کے ساتھ مل کر جس طرح جہاد کیا اور اس فتنہ کو دبایا، کیا یہ رسم شبیری ہے یا نہیں؟ تاریخ تصوف اور صوفیا کی زندگی سے ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں، شرط مطالعہ ہے، چاہے ہم ہوں، آپ ہوں یا اقبال۔

اقبال کی ایک نظم ''باغی مرید'' ہے۔ یہ دراصل آج کے زیادہ تر پیر اور خانقاہی نظام کی آئینہ دار ہے۔ وہ روحانی نظام جو توکل علی اللہ پر قائم ہوا تھا اور وہ جانشینی جو خلافتِ راشدہ کے طرز پر تھی، وہ عہدِ اقبال تک آتے آتے بالکل بدل سی گئی تھی۔ توکل کی جگہ نذر کے نام پر پیر جیب بھرنے لگے ہیں اور جانشینی کے وقت سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر طریقۂ امیر معاویہ پر عمل شروع ہوگیا۔ اسے دیکھ کر اقبال ہی کیا ہر اسلامی فکر رکھنے والا تڑپ اٹھا، لیکن اقبال نے یہ جرأت کی اور بہ آہنگ دہل اعلان کیا :

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

175
of 428

92.1KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

شاید اقبال کی گزران خانقاہوں میں نہیں ہوئی جہاں آج کے دن بھی نذرانہ لیا جاتا ہے اور نہ جانشینی کے وقت طرزِ معاویہ پر عمل ہوتا ہے بلکہ سنت رسول اللہ کے مطابق متوفی بزرگ کا جانشیں اسے ہی بنایا جاتا ہے جو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کتاب و سنت کا علم رکھتا ہو اور اس کا عمل بھی اس پر ہو۔

پروفیسر صابر کلوری لکھتے ہیں :

''اقبال کو یورپ کے قیام اور اپنے Ph. D. کے مقالہ کی ترتیب کے دوران یہ احساس ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے قویٰ میں اضمحلال کی وجہ وہ تصوف ہے جس میں غیر اسلامی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اقبال تصوف پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے جو آج ''تاریخ تصوف'' کے نام سے ہمارے اور آپ کے سامنے موجود ہے لیکن کتاب کیا ہے، یہ خاکسار اس کتاب کو تقریباً 25 مرتبہ پڑھ چکا ہے لیکن تصوف کی تاریخ تو درتصوف کا تعارف بھی نہیں ہے بلکہ تصوف کے سلسلے میں کچھ گم راہ کن عبارت موجود ہے مثلاً علامہ اقبال لکھتے ہیں :

''لفظ صوفی، صوف سے مشتق ہے جو ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے۔''

اہلِ علم و دانش کا مجمع ہے، آپ خود ہی بتائیں کہ ''صوف'' کے معنی اون ہوتا ہے یا ریشمی کپڑا؟

میں یہ نہیں کہوں گا کہ تصوف کے سلسلہ میں اقبال کے یہاں مطالعہ و مشاہدہ کی کمی ہے لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اقبال آخر تک تصوف کے سلسلے میں خاصے کنفیوژ رہے۔

.....

حواشی :

1- تاریخ تصوف علامہ اقبال ص 91
2- ''اقبال نامہ'' (جلد نمبر 1) ص 78
3- ''کشف المحجوب'' علی ہجویری ص 93

❖❖❖

176
of 428

92.1KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر محمد منصور عالم (کولکاتا)

اقبالؔ اور ٹیپو سلطان

آن شہیدانِ محبت را امام
آبروئے ہند و چین و روم و شام
نام از خورشید و مہ تابندہ تر
خاک قبرش از من و تو زندہ تر

ترجمہ (ٹیپو سلطان جو شہیدان محبت کا امام رہا۔ جو ہند و چین و روم و شام کی آبرو ہے۔ جس کا نام چاند اور سورج سے زیادہ روشن ہے۔ جس کی قبر کی مٹی ہم زندہ انسانوں سے زیادہ تر زندہ ہے۔)

علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان کا شمار ہندوستان ہی نہیں بلکہ برصغیر کی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے۔ ٹیپو اپنے عہد کے ایک جلیل القدر، روشن خیال، بلند پایہ ناظم، معاملہ فہم، دور اندیش اور سیکولر انسان تھے۔ انہوں نے اپنی خداداد و غیر معمولی ذہانت و فطانت، بے مثال شجاعت و

177
of 428

48.5KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

جرات کی بدولت انگریزی افواج کے دانت کھٹے کر دیے اور اپنے وطن عزیز کی مقدس سرزمین کو انگریزوں کے ناپاک اور منحوس قدم سے پاک رکھنے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دشمنوں کے سامنے سرنگوں ہونے کے بجائے اپنا سر کٹا دینے میں اپنی شان اور اپنے ملک کی آبرو سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان ٹیپو کو آبروئے ہند کہا جاتا ہے اور شیر میسور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے عظیم شاعر اقبال کے مرد کامل اور ٹیپو سلطان میں بہت سی قدریں مشترک ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت ٹیپو نے ڈاکٹر محمد اقبال کو کافی متاثر کیا تھا۔ اپنے عوام کی فلاح و بہبودی، بلا مذہب وملت خدمت، مذہبی رواداری اور اسلامی حمیت جیسے اوصاف ٹیپو میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ مذہبی اشتغال اور عبادات کی طرف سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ ہر وقت باوضو رہنا اور نماز فجر کے بعد قرآن کی تلاوت ضرور کرنا، ستر پوشی کا التزام کرنا، سادہ لباس زیب تن کرنا اور کوشش کرنا کہ کوئی کام شریعت کے خلاف نہ ہو، مکروہات اور منہیات سے پرہیز کرنا ٹیپو میں وہ خصائل اور عادات تھے جس نے عظیم شاعر اقبال کو ان کا شیدائی بنا دیا تھا اور ان کی نظر میں ٹیپو کا درجہ بہت بلند ہو گیا تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے مکاتیب کے علاوہ فارسی اور اردو کلام میں کیا ہے۔ ٹیپو کے ساتھ اقبال کی گہری محبت وعقیدت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ٹیپو کو جنت الفردوس کا مکیں قرار دیا ہے۔

علامہ اقبال کو اولیاء کرام، بزرگان دین اور شاہان اسلام سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں غوطہ زنی کے باوجود اقبال جتنے مسلمان تھے۔ اس سے بھی زیادہ مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے قیام یورپ میں فرنگی فلسفوں کا ضرور مطالعہ کیا لیکن ان کے افکار سے متاثر ہونے کے بجائے ان سے بے زار ہوتے چلے گئے۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا، تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے۔'' (اقبال نامہ صفحہ 13) اقبال کے اردو فارسی کلام سے

178
of 428

42.7KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ان کی اسلامی خدمات، اسلامی تہذیب وثقافت کوفروغ دینے کا جذبہ، حب الوطنی اور قومی یک جہتی میں یقین کامل کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان کے تاریخی افق پر جتنے مصلح حکمرانوں کا ظہور ہوا، اقبال ان کی اس لیے قدر ومنزلت کرتے تھے کہ انہوں نے ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی۔ انسانیت کی خدمت کی اور اپنی قوم وملت کے لیے اپنی جان تک قربان کردی۔ ایسی ہی شخصیتوں میں میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان بھی تھے جو اقبال کے لیے محبوب شخصیت کا درجہ رکھتے تھے۔ اس مضمون میں ٹیپو سے اقبال کی گہری عقیدت اور محبوبیت بیان کی جارہی ہے۔

ٹیپو سلطان ہندوستان کے ایک جاں باز سپاہی، حب الوطنی اور قومی یک جہتی و ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار تھے۔ اپنے باپ حیدر علی کی وفات کے بعد 30 سال کی عمر میں وہ میسور کے حکمراں ہوئے۔ انگریز ان سے پناہ مانگتے تھے اور اپنی ناپاک سازشوں اور کامیابی میں ان کو سب سے بڑا روڑا سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ جنگ میں انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حالاں کہ انہوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن غدارانِ وطن میر قمرالدین، میر قاسم علی اور بدرالزماں جیسے با اعتماد امرا کی ناپاک سازشوں کی وجہ سے انہیں شہادت کا جام نوش کرنا پڑا۔ ٹیپو سلطان کی اسی ادا نے اقبال کے دل کو چھولیا اور انہوں نے شہید سلطان کو اتنی زبردست خراج عقیدت پیش کی جس کا جواب آج تک نہ تو کوئی شاعر دے سکا اور نہ مفکر۔

ایمان وایقان کی گہرائی، عزم واستقلال، جرأت وشجاعت، سخت کوشی وخطر پسندی، حب الوطنی، جذبہ جہاد، جمال وجلال وغیرہ ایسے صفات ہیں جو اقبال کے مرد کامل میں بھی ملتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں ٹیپو سلطان کی سرشت میں داخل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کی دیرینہ خواہش ٹیپو جیسے مرد مومن اور مرد کامل کی بارگاہ میں حاضری دینے کی تھی جو ایک طویل عرصے تک ان کے دل ودماغ پر چھائی رہی۔ اللہ نے ان کی یہ دیرینہ خواہش پوری کردی چنان چہ انجمن اسلامیہ، مدراس کی جانب سے انہیں ایک خاص اسلامی عنوان

179
of 428

42.7KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

پر لکچر دینے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے اس دعوت کو فوراً بخوشی قبول کرلیا اور 5 فروری 1929ء کو جنوبی ہند روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں محمد عبداللہ چغتائی اور چودھری محمد حسین ان کے ہم راہ تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کے پیش نظر مدراس کی دعوت پر اس لکچر کے علاوہ میسور میں سلطان ٹیپو شہید کے مرقد کی زیارت بھی تھی۔ علامہ اقبال کو سلطان شہید سے بہت لگاؤ تھا کیونکہ سلطان شہید نے حق و باطل کی جنگ میں خود کو شہید ہو کر نام پیدا کیا تھا۔''

(عبداللہ ڈاکٹر سید ''علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر'' صفحہ 19)

علامہ ڈاکٹر اقبال کے صاحب زادے جسٹس جاوید اقبال کے مطابق بھی جنوبی ہند کا سفر کا اول مقصد یہ تھا کہ وہ سلطان شہید کی تربت کی زیارت کرنا چاہتے تھے اور اس تجزیہ سے جو سوز و گداز کی کیفیت ان پر طاری ہوئی اسے نظم کر کے لافانی بنا دینے کا مقصد تھا۔

علامہ اقبال کی نظر میں ٹیپو سلطان کی کیا حیثیت تھی کہ انہوں نے ٹیپو کی عظمت و بزرگی میں چار چاند لگا دیے اس کا پتہ ''صحیفۂ ٹیپو سلطان'' کے مصنف محمود خان بنگلوری کے اس بیان سے چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ٹیپو سلطان کی عظمت کو نمایاں کرنے میں علامہ اقبال نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ آپ کی سرنگاپٹم میں تشریف آوری اور اخبارات لاہور میں آپ کے مضامین اور اوراس کے بعد جاوید نامہ کی اشاعت نے ملک میں سلطان کی شہرت کو اور وسیع کر دیا۔ مجھے حیرت ہے کہ اس حکیم ملت نے ایک ہی دن میں اپنی روحانی بصیرت سے وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کو ہندوستان ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں نہ دیکھ سکا۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا۔''

(''صحیفۂ ٹیپو سلطان'' از محمد بنگلوری)

علامہ اقبال ٹیپو سلطان کے مزار پر پہنچے تو ان پر عجیب وجدان کیفیت طاری تھی۔ وہی کیفیت جو نیگور پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب وہ مزار حافظ کی زیارت کر رہے تھے

180
of 428

44.4KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

لیکن دونوں کی کیفیات میں فرق ہے۔ ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مزار حافظ پر حاضر ہوا تھا تو دوسرا بڑا شاعر ڈاکٹر محمد اقبال ٹیپو سلطان شہید کے مزار پر اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ ٹیپو ایک سچا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ پاسبانِ اسلام تھا اور کردار کا غازی تھا۔ بہادری اور فہم و فراست کی مثال تھا۔ بہر حال ڈاکٹر اقبال نے ٹیپو سلطان کے مزار کی زیارت کی۔ چوں کہ انہیں سلطان ٹیپو سے شروع سے ہی عقیدت تھی اس لیے حضرت ٹیپو ان کے دل کے نہاں خانے میں اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ خود کو ان سے الگ نہیں کر پا رہے تھے۔ جب انہوں نے سلطان کی عزت و عظمت، سطوت و جلال اور اسلام دوستی کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا تو اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا:

> ''ہمارا خیال تھا کہ اورنگ زیب ہی ایسا مسلم شہنشاہ تھا جس پر مسلمانانِ ہند بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان شہید طلد آشیاں بھی ایک بہت بڑی بلند پایہ اور اسلام دوست حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے آگے شہنشاہ اورنگ زیب کے کارنامے بھی ہیچ ہیں۔''

(ماہ نامہ ''نشتر'' بنگلور اقبال نمبر فروری 1978ء)

ٹیپو سلطان کے مزار شریف کے اردگرد پھیلی ہوئی روحانیت اور عظمت ڈاکٹر اقبال کے حواس پر اس طرح حاوی تھی کہ انہوں نے دوسری جگہ اپنے احساسات کو قرطاس پر یوں ڈھال دیا:

> ''سرزمین ہند میں اگر نیابت الٰہی کے مقام تک کسی نے رسائی حاصل کی ہے تو وہ ٹیپو ان حیدر ہے اور اس کی نیابت الٰہی کی ایک ادنیٰ سی جھلک صرف یہی سن کر آنکھوں میں پھر جائے گی کہ اس کی سلطنت کا نام ''دولتِ خداداد'' اور اس کی ایوان عدالت کا نام ''دریا دولت'' تھا۔''

(تاج محمود محمود خانی بنگلوری ''تاریخ سلطنت خداداد'' صفحہ 519)

181
of 428

53.4KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

مزار ٹیپو پر حاضری دیتے وقت اقبال نے جب فاتحہ خوانی شروع کی تو کئی منٹ تک ان پر رقت کا عالم طاری رہا۔ کبھی آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا تو کبھی آنکھیں اشک بار ہو جاتیں۔ اسی دوران ایک ہم راہی علی جانی صاحب نے اقبال کے درج ذیل اشعار نہایت پرسوز اور پر درد آواز میں پیش کیے جو برمحل ثابت ہوئے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

علامہ اقبال جب مزار ٹیپو سے باہر نکلے تو کسی نے پوچھا۔ ''حضرت آپ مزار ٹیپو پر بہت دیر تک ٹھہرے۔ کیا اس دوران سلطان شہید سے آپ کو کوئی پیغام ملا۔ علامہ اقبال نے جواب دیا۔ ''ہاں یوں تو مزار پر مجھے بہت سے پیغامات ملے جن میں ایک پیغام کا فارسی شعر مراقبہ کے دوران ہی وجود میں آیا :

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں جان سپردن زندگیست

(ماہ نامہ ''نشتر'' بنگلور، اقبال نمبر، فروری 1978ء)

علامہ اقبال ٹیپو سلطان کے مزار کی زیارت، چند دنوں کے قیام اور ٹیپو سے متعلق بہت ساری معلومات لیے اپنے وطن لاہور لوٹ تو گئے لیکن ان کے دل و دماغ پر سلطان شہید کی عظمت اور سربلندی چھائی رہی جسے وہ بہت جلد قلم و قرطاس کے حوالے کرنے کے لیے بے چین تھے اور بعد میں ٹیپو شہید سے ان کی تمام عقیدتیں شعری سانچے میں ڈھلتی گئیں جو لاثانی و لافانی ثابت ہوئیں اور ''جاوید نامہ'' کی شکل میں زندہ و جاوید ہو گئیں۔

ٹیپو سے علامہ کی بے پناہ عقیدت کا پتہ ان کے ایک خط سے بھی چلتا ہے۔ میجر سعید محمود خان میسور میں علامہ اقبال کے نام سے ایک فوجی اسکول قائم کرنا چاہتے تھے

182
of 428

53.4KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اور اس کی اجازت چاہی تھی۔ علامہ نے جواب میں جو کچھ لکھا وہ ٹیپو سے ان کی بے پناہ عقیدت ثابت ہوتی ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی اسکول کو موسوم کرنا زیادہ موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس فوجی اسکول کا نام ''ٹیپو فوجی اسکول'' رکھیں۔ ٹیپو ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کے کارنامے ہندوستان کے مسلمانوں نے بہت جلد فراموش کر دینے میں بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں جیسا کہ میں نے خود مشاہدہ کیا ہے اس عالی مرتبت مسلمان سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کو جو بظاہر زندہ ہیں یا اپنے آپ کو زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔''

(سید مظفر برنی ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد سوم صفحہ 51)

مذکورہ خط سے اقبال کی ٹیپو سے جو بے پناہ عقیدت وارادت تھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کا ''جاوید نامہ'' ایک منظوم تمثیلی معراج نامہ ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیا ہے۔ ''جاوید نامہ'' کا وہ حصہ جو ٹیپو سے متعلق ہے، علامہ کے جوہری قلم نے اس حصے کو زندہ جاوید بنا دیا ہے جس میں انہوں نے اپنے پیر و مرشد مولانا جلال الدین رومی کی رہنمائی میں چھ افلاک اور فردوس بریں کی سیر کی۔ رومی آپ کو متعدد افلاک کی سیر کراتے ہیں جو اس مثنوی کا تخلیقی مقصد ہے۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال سلطان ٹیپو کو فردوس بریں میں موجود دکھاتے ہیں۔ یہ بھی ان کی عقیدت کا ایک بڑا پہلو ہے۔ ٹیپو سے خلدِ بریں میں ملاقات ہوتی ہے تو سلطان ٹیپو اقبال سے دریافت کرتے ہیں :

باز گو از ہند و از ہندوستان
آنکہ باکاہش نبرزد بوستان
آنکہ اند مسجدش ہنگامہ مرد
آنکہ اندر دیر او آتش فسرد

183
of 428

89.6KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

آنکہ دی از بہر او خون کردہ ایم
آنکہ یادش را بدل پروردہ ایم
ہندیان منکر از قانون فرنگ
درتگیر و سحر و افسوں فرنگ
روح رایاں گراں آئیں غیر
گر چہ آید از آسمان آئیں غیر

دونوں کے درمیان گفتگو طویل ہے جس کا بیان اس مختصر سے مضمون میں شامل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ اقبال کو سلطان شہید سے جو محبت، ارادت اور عقیدت ہوگئی تھی اس کا اندازہ جاوید نامہ کے اشعار سے تو چلتا ہی ہے۔ جاوید نامہ اور ضرب کلیم میں جو اشعار اقبال نے ٹیپو کی عظمت کے جو اشعار شامل کیے ہیں۔ ان کی تعداد اچھی خاصی ہے جو اس مختصر سے مضمون میں تحریر کرنا مشکل ہے۔

علامہ اقبال فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا ایک تہائی حصہ فارسی میں ضرور ہے لیکن انہوں نے اردو میں بھی سلطان شہید کے حوالے سے جو کچھ لکھا وہ بھی معرکتہ الآرا ہے۔ انہوں نے سلطان شہید کے متعلق اردو میں ایک نظم لکھی جو ٹیپو سلطان کی وصیت کے عنوان سے ان کے مجموعے "ضرب کلیم" میں شامل ہے۔ ان اشعار میں اقبال نے الفاظ کا جو جادو بکھیرا ہے اس کے سحر سے آپ بھی محظوظ ہوں :

تو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول

184
of 428

51.1KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

''ضربِ کلیم'' میں ہی اقبال ٹیپو کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے آخری شعر میں سلطان کی پوری زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا :

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

''وصیت نامہ ٹیپو'' کے نام سے اقبال نے ایک عنوان قائم کر کے ٹیپو سلطان کی وصیت کو اپنی زبان سے ادا کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے اور قوم کی ستم ظریفی ہے کہ ہم اپنے قومی ہیرو کی خدمات کو فراموش کر چکے ہیں۔ اگر ڈاکٹر اقبال نہ ہوتے تو شاید ٹیپو قعرِ گم نامی میں پڑے ہوئے ہوتے۔ اقبال کا قوم و ملت پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ ٹیپو کو زندہ جاوید کر دیا بلکہ مسلمانوں کو پھر سے یاد دلایا کہ ہندستان میں اگر کوئی مسلمان جاں باز سپاہی، محبِ وطن، قومی یک جہتی اور ہندو-مسلم اتحاد کا علم بردار تھا تو وہ یقیناً ٹیپو سلطان کی شخصیت تھی۔ آج جب کہ اردو اکاڈمی جشنِ اقبال منا رہی ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کے اس احسانِ عظیم کو بھی یاد کیا جائے جس نے ٹیپو سلطان کو اپنے اشعار کے ذریعہ امر کر دیا اور ٹیپو کی مثال سامنے رکھ کر پورے مشرق میں خود اور خود اعتمادی، عزتِ نفس، جہاں بینی اور جہاں بانی کا نہ صرف ولولہ پیدا کیا بلکہ ہندستانی مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کیا۔

❖❖❖

185
of 428

88.1KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر (رائے گڑھ، مہاراشٹر)

اقبال کی شاعری میں دیش بھگتی

'اقبال کی شاعری میں حب الوطنی' کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے ہمیں ان کی شاعری کی کل کائنات پر نظر ڈالنا ہوگا۔ 1905ء تک کی ان کی شاعری کا رنگ ڈھنگ الگ تھا۔ یہ رنگ انقلاب 1857ء کے بعد بہت زوردار طریقے سے نمودار ہوا۔ وطن کو غلامی کے طوق سے آزاد کرانے کے جذبے کے تحت حب الوطنی کے ساتھ اصلاح قوم کا نقطہ نظر بھی پنپا۔ اقبال کے یہاں بھی وطن سے محبت کے یہ ترانے جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ حب الوطنی آخر ہے کیا؟ حب الوطنی کا مطلب ہے، ملک میں رہنے والوں کی بہتری کے لیے سوچنا، ان کی خدمت میں ایمان دار رہنا اور ملک کے حالات بہتر بنانے میں جٹنا۔ اقبال نے جب یہ کام اپنے ہاتھوں میں لیا، بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا۔

اقبال بہت اچھے شاعر تھے۔ وہ سمندر تھے۔ گہرے، شانت لیکن اس سمندر میں چھپا ہوا ایک زبردست طوفان تھا۔ انہوں نے ہر موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار

186
of 428

88.1KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

کیا۔ ان کی نظمیں thought provoking موضوعات اور جوشیلا لہجہ لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں آج تک ان کی برابری میں کوئی کھڑا نہیں ہو سکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالبؔ کے بعد اگر کسی شاعر نے اردو شاعری کو اتنا اونچا مقام دلایا ہے تو وہ ہیں اقبالؔ۔

اقبال نے بیسویں صدی کی ابتدا میں اپنی پہلی نظم ایک مشاعرے میں پیش کی تھی۔ اس وقت وہ صرف بائیس سال کے تھے۔ اس عمر میں انھوں نے اس نظم میں مناظرِ فطرت کی عکاسی سے بہت بڑا کام لیا اور وہ ہے، ملک کی خوب صورتی اور وقار کا گن گان کرنا اور اپنے سامع کو ایک سیدھی سادی آزادی کی زندگی کی جانب ترغیب دینا۔ وہ نظم تھی ''ہمالہ''۔ اس نظم کے پہلے مصرعے ہیں:

اے ہمالہ ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اور آخری مصرعے :

ہاں دکھا دے اے تصور ! پھر وہ صبح و شام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

جو علی الاعلان کہتے ہیں کہ اقبال نے کس رجحان اور کس ایک مقصد کے تحت شاعری کی تھی۔ نو جاگرن کا زمانہ تھا۔ 1857ء کی ٹھوکر نے اس ملک کے باسیوں کو نہ صرف یہ کہ دہلا دیا تھا بلکہ ان کے حوصلے بھی پست کر دیے تھے۔ اقبال نے اپنے استاد اور مشہور شاعر داغ کی غزلوں سے جوش اور ولولہ لیا اور اپنی اونچے پائے کی شاعری میں اسے بھر کر اپنے ملک اور قوم کا کھویا ہوا وقار، خود اعتمادی اور عزتِ نفس کی کشش کی بازیافت کی کوشش کی۔ شروع سے ہی وہ شاعری میں مقصدیت کے قایل اور متلاشی تھے۔ وہ مقصد کے بغیر لکھی جانے والی شاعری پر بندھن لگانے کی بات کرتے تھے۔ عام طور پر مقصد کے ساتھ لکھی ہوئی شاعری اکثر پروپیگنڈا بن کر بے دم ہو جاتی ہے لیکن اقبال کی شاعری میں

187
of 428

48.5KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

وہ جادوگری تھی کہ اس قسم کی شاعری کو بھی وہ اتنی اونچائی تک لے جا سکے کہ اپنی زندگی میں ہی وہ لیجینڈ ہو گئے۔ اس جادو کی ایک وجہ تھی ان کا مشاہدہ اور طرز غور و فکر۔ یہ اور بات ہے کہ کئی لوگ ان کی شاعری کے ردیف اور قافیہ پرکھنے اور داد دینے کو اہم سمجھتے رہے لیکن یہ بھول گئے کہ انھوں نے بہت بڑی بڑی باتیں کہی ہیں :

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال جانتے تھے کہ ہندوستان ابتدا سے ہی مختلف تہذیبوں کا گڑھ ہے۔ مشرقی اور مغربی فلسفے کے مطالعے نے انھیں ایسی پختگی دی تھی کہ کئی مذہب کے رہنماؤں جیسے شری رام چندر، گوتم بدھ، گرو نانک، سوامی رام تیرتھ کے اوصاف کو سراہا۔ انھوں نے ان سب کی دل کھول کر تعریف کی اور ان کے ذریعے سماج کو بہادری، وفاداری، پاکیزگی کے ساتھ ولولے سے کام کرتے رہنے کی تحریک دی تھی۔ وہ کسی ایک دھرم ذات کے نہیں پوری انسانیت کے شاعر تھے۔ شری رام چندر جی کے لیے تعریفی اشعار دیکھیے :

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں ، جوشِ محبت میں فرد تھا

مشرقی اور مغربی فلسفے کے مطالعے نے انھوں نے ایسی پختگی دی تھی انسان میں یقین رکھتے تھے اس لیے وہ گوتم بدھ کو ایسے میٹھے پھل کی طرح مانتے تھے جس کی مٹھاس سے خود پیڑ بھی انجان ہے۔ ظاہر ہے بھارت سے زیادہ پردیسوں میں ان کی تعلیم کا مان رکھا گیا۔ دیکھیے کیسی بات کہی ہے انھوں نے۔ وہ بھی اسٹیج پر، مائک پر لوگوں کے درمیان اور پھر اس زمانے میں جب چھوت چھات کی بیماری کو دور کرنے کا کوئی قانون تک عمل میں نہیں آیا تھا۔ بھارت کی ایک بڑی آبادی اچھوت کہلاتی تھی :

188
of 428

62.3KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

انسانی سماج کے اندرون میں جا کر اقبال نے اردو شاعری کو ایک اونچا مقام عطا کیا ہے۔ وہ داغ کے شاگرد تھے اور داغ جوش و ولولے کے شاعر۔ غلامی کے اس دور میں وہ مردہ دلوں میں زندگی بھر رہے تھے۔ یہی ان کا مقصد بھی تھا، یعنی خود احتسابی کے ذریعے عزتِ نفس کی حفاظت کا درس دینا۔ اپنے استاد کی غزلوں کے جوش کو انھوں نے اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے اپنایا ہے۔ غلامی کے اس عہد میں وہ مردہ دلوں میں ولولے بھر رہے تھے۔ یہی ان کا مقصد بھی تھا۔

اقبال کا نقطۂ نظر مثبت تھا۔ نئے زمانے اور مغربی تہذیب سے کیا لیا جائے کیا نہیں، اس پر بھی وہ روشنی ڈالتے ہیں:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

لیکن نئی تہذیب کی خوبیوں کو اخذ کرنے کے وہ ضرور حمایت کرتے ہیں۔

اقبال کے چار شعری مجموعے 'بانگ درا'، 'بالِ جبرائیل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' ہیں۔ یہ بھی گواہ ہیں کہ وہ انسان کا نقطۂ نظر بدلنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگ تب بھی دکھاوے اور بناوٹ میں الجھے ہوئے تھے اور آج اکیسویں صدی کے سائنسی دور میں بھی لوگوں کا حال بدتر ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں سے موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

189
of 428

59.7KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

شاعری اور حب الوطنی ان کی گھٹی میں نہ رہتے تو وہ ایسے ایسے گیت اور شعر نہ لکھ پاتے جو لافانی ہو گئے۔ وہ اپنی بات اس طرح مثال اور تلمیح سے سمجھاتے ہیں کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام سے ان کے بت تراش باپ آذر کا گھر روشن ہوا اسی طرح بھارت میں گوتم بدھ کے بعد روشنی آئی۔ گرونانک کے لیے کہا :

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

سوامی رام تیرتھ کے فلسفے کو کیا خوبی کے ساتھ نظم میں باندھا ہے۔ اس شعر میں تو سوامی جی کا درشن ہی جیسے کھول کر رکھ دیا ہے:

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اقبال حب الوطنی کو اچانک پیدا ہونے والا جذبہ نہیں مانتے۔ ان کے خیال سے یہ جذبہ تو پیدائش سے ہی ہمارے اندر موجود ہے۔ وہ بچوں کی گھٹی میں ساری اچھائیاں اپنی شاعری میں بھر کر پلانا چاہتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اسی طرح ''ترانہ ہندی'' نامی نظم میں انھوں نے وطن دوستی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کا سب سے پیارا گیت بن گیا ہے۔ اس گیت میں

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

پر کچھ عالموں کو اعتراض ہوتا ہے۔ دراصل شاعر کہتا ہے کہ اپنا ملک سب سے پیارا ہوتا ہے اور ہمارے ملک میں قدرت نے اپنا خزانہ لٹا دیا ہے۔ یہاں مختلف ذات اور مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ کوئی ایسا مذہب نہیں جو ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنائے۔ ہم مانتے

190
of 428

59.7KB/s 6:43 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

ہیں ہم ہندی ہیں اور ہمارا ملک ہندوستان ہے۔جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے اقبال سماج اور تہذیب کے پرانے ڈھانچے کو گرا کر اس کی جگہ ایک نیا شوالہ بنانا چاہتے تھے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

شاعر کہتا ہے، دیش کی مٹی کا ذرہ ذرہ دیوتا سمان ہے۔ وہ ایک ایسا شوالہ بنانا چاہتے ہیں جہاں لوگ 'پیت' کے میٹھے منتر گائیں۔زمانۂ قدیم سے ہمارے کبیر اور دوسرے بھگتوں نے دلوں کی دوریاں کم کرنے کا کام کیا ہے کیوں کہ:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

''بانگِ درا'' شعری مجموعے میں جگہ جگہ حب الوطنی اور وطن پرستی کے جذبات ملتے ہیں اور دیش بھکتی کے بہت سے گیتوں کی طرح ان میں بھی جوش دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود اقبال نے جہاں بھی تقلید کرنے لائق خوبیاں دیکھیں، انھیں اپنایا۔انھوں نے گائتری منتر کا ترجمہ کیا اور ''آفتاب'' نام دیا:

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے

یہاں تک کہ گوئٹے کی جرمن نظم "Mohamet's Gesang" کا ترجمہ انھوں نے 'جوئے آب'' کے نام سے کیا۔ اقبال کا دل اتنا بڑا تھا کہ گوئٹے کو پیغمبر جیسا مقام اپنے اس مشہور زمانہ جملے میں دیا۔''نیست پیغمبرو لے دارد کتاب'' یعنی پیغمبر نہیں ہے پھر بھی ایک کتاب رکھتا ہے۔

اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں عمل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں (''چاند اور ستارے'')

191
of 428

48.2KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اقبال کی شاعری میں جیسی رفتار یا تحریک دینے کی قوت ہے اور فلسفے کے گہرے مطالعے نے جس طرح ان کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالا تھا، ویسا انقلابی، سیاسی، سماجی لہجہ ان سے پہلے اور ان کے بعد خال خال ہی ملے گا۔

عورت کے لیے بھی انھوں نے کچھ باتیں صاف صاف کہی ہیں اور کچھ اشاروں کنایوں میں کہی ہیں کیوں کہ، انھوں نے خود کہا ہے کہ لوگ ان پر کوئی نہ کوئی الزام لگاتے رہتے ہیں لیکن عورت کو خود چننا ہوگا کہ اسے گلوبند زیادہ پیارا ہے یا علم:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اُسی کے سوز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اقبال نے بھارت کے پس منظر میں پائے جانے والے مسائل، مزدور، غلام، کسان، زمین دار، صاحب ثروت حضرات اور حاکم کے تصور کو موضوع میں تبدیل کر دیا جسے ان کے وقت کی اور ان کے بعد والی نسل نے برتا اور سوسائٹی میں اردو شاعری کے سبب بڑے انقلاب آئے۔ جدید ترقی پسند شاعری کی بنیاد ڈالنے کا سہرا اقبال کے سر ہی جاتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال اپنے ابتدائی زمانے میں حب الوطنی اور اصلاحِ قوم تک محدود رہے۔ آگے چل کر اور یورپ کے دوروں نے ان کے نقطۂ نظر میں وسعت اور عالم گیریت پیدا کیا۔ یوروپی تہذیب کی خصوصیات اور خامیوں کو پرکھا۔ مغربی اور مشرقی فلسفے کی بنیاد پر عالم و کائنات کے مسائل پر غور و خوض کیا اور اس کے حل ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی:

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اُس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال کی فارسی شاعری اور اس کے تراجم نے انھیں دنیا کے بہت سے ممالک میں مقبولیت عطا کی۔ انھوں نے سر کا خطاب بھی پایا۔ عظیم فلاسفر اور شاعر گوئٹے کی تخلیق

192
of 428

92.7KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

''دلائلِ مغرب'' کے جواب میں ''پیامِ مشرق'' نامی نظم سے انھوں نے بڑا گہرا فلسفیانہ جواب بہت ہی آسان اور پرکشش ڈھنگ سے دیا ہے۔

''جاوید نامہ'' فارسی تخلیق میں وہ بھارت کے فلسفے کو کھنگالتے ہیں۔ اقبال کا رشی منیوں، شیو وغیرہ سے اور بھرتری ہری سے بحث مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ اس مکالمہ میں بھرتری ہری کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ سب سے بڑا خدا مندروں اور مسجدوں سے دور ہے جو عمل اور جدوجہد سے ملتا ہے۔ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح اپنی شاعری سے اقبال نے غلامی اور ملک سے غداری سے نفرت اور اخلاقیت کی ترغیب دینے کی کوشش بھرتری ہری کی زبانی کی ہے۔

اقبال پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے کٹر مذہبی رہنما تھے۔ آگے چل کر اسلامی اسٹیٹ کی ضرورت بھی انھوں نے محسوس کی تھی۔ 'پرکاش پنڈت' اپنی ادارت میں شایع ہونے والی کتاب ''اقبال اور ان کی شاعری'' میں کہتے ہیں، ''اس طرح کے خیالات کا انحصار پوری بھارتی ذات کو بے دار کرنے کے خیال پر رکھی گئی تھی۔ ورنہ اقبال کے نظریات کا خصوصی پہلو انسان اور کائنات کی نسبت کی وہی ازلی مسئلہ رہا ہے، جس پر ہر زمانے کے عظیم فلسفی غور وخوض کرتے رہے ہیں۔ نو جاگرن کے اُس زمانے میں اصلاحِ مذہب کے وسیلے سے بھی ملک کو مکمل آزادی دلانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اقبال بہت بڑے مفکر تھے۔ کچھ مصلحِ قوم ویدانت، رامائن، مہابھارت وغیرہ کے ذریعے تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ اقبال نے بھی مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر ان میں قرآن کی روشنی میں ایک نئی سوچ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے آگے کی شاعری میں ان کے یہاں پوری کائنات کو اپنا وطن ماننے کا تصور دکھائی دیتا ہے۔ آج اقبال کا انسانیت کا یہ تصور کتنا حسبِ حال لگتا ہے کہ عالم گیریت کے اس دور میں جب دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہو چکی ہے، اقبال نے شاہین، مردِ مومن اور خودی وغیرہ کے فلسفے کو عوام تک پہنچایا۔ وہ ملک کے جغرافیائی نقشے کے تصور سے اوپر اٹھ گئے تھے۔ 'جہاں

193
of 428

92.7KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

پیدا ہوئے وہ وطن ہے تو ساری کائنات میرا وطن ہے'، کے تصور نے ان کی فکر پر غلبہ پایا۔ فلسفہ کی فکر میں اصولوں میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش نکلتی رہتی ہے۔ ہندی کے مشہور کوی رام دھاری سنگھ دِنکر اور میتھلی شرن گپت کی سوچ بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

اقبال کے یہاں فرد اور سماج کے سدھار کی کوششیں بھی ہیں۔ جو لوگ انہیں اسلامی شاعر مانتے ہیں، وہ ان کے آدھے فلسفے کو مانتے ہیں:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال پر آج بہت کام ہو رہا ہے۔ ہندی میں وشو ناتھ نرونے ''آدھو نک بھارتیہ چنتن''، رام بابو سکسینہ اور فراق گورکھ پوری کی ''ہندی ساہتیہ کا اتہاس''، انگریزی میں راج موہن گاندھی کی کتاب ''Understanding Muslim Mind'' اس کی چند مثالیں ہیں۔

اپنے زمانے میں علامہ اقبال نے جو افکار زمانے کو دیے، ان کی وجہ سے وہ آج بھی زندہ ہیں کیوں کہ زمانہ بدل گیا ہے لیکن مسائل نہیں بدلے ہیں۔

❖❖❖

194
of 428

48.1KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

شاہ نواز قریشی (لکھنؤ)

علاّمہ اقبالؔ اور ہمارے ادبی رویے

اپنی شاعری کی بنا پر علامہ اقبال کو جو مقام اردو ادب میں حاصل ہوا، اس سے انکار ایک طرح سے کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ چنان چہ اقبالؔ کی اہمیت بلکہ عظمت کا اعتراف تقریباً سبھی ناقدین اور دانش وران ادب نے کیا ہے۔ ان کی عظمت کے سلسلے میں آل احمد سرور نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> ''اقبال کی عظمت یہ ہے کہ ان کے یہاں مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی سرمایے پر نظر بھی ہے اور ماضی کے عرفان کے ساتھ حال کے آشوب کا احساس اور مستقبل کا ایک خواب بھی ہے۔''

(نورالحسن نقوی کی کتاب ''اقبال: شاعر و مفکر'' سے ماخوذ)

علی سردار جعفری نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

''اقبالؔ کے بغیر ہم اپنی شاعری کا تصور تک نہیں کر سکتے۔''

195
of 428

45.9KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

لیکن مشہور و مقبول ترقی پسند شاعر ساحرؔ لدھیانوی نے ان کے اس شعر :

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پر یوں طنز کیا تھا کہ:

رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

اقبال کا مذکورہ شعر ان کی جس نظم سے ماخوذ ہے، اسے اس تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ وہ جارحانہ اور عصبیت زدہ قوم پرستی اور جغرافیائی حد بندیوں کے خلاف تھے اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو ایک برادری مانتے تھے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ بحیثیت انسان دنیا کے تمام لوگ یکساں اور مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اگرچہ اقبال کی نثر کے مداح رہے ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنے مضمون ''نثرِ اقبال کا تنوع'' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''علامہ محمد اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ ان کی بلند پایہ، خوب صورت اور دل نشیں شاعری میں ایسی کشش ہے کہ اس کا قاری یا سامع ''سبحان اللہ'' اور ''واہ واہ'' کہتے ہوئے اس کی داد دینے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔''

آگے چل کر اسی مضمون میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''علامہ اقبال کی شاعری اردو کی ساڑھے تین اور فارسی کی ساڑھے پانچ یعنی کل نو کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کی اردو اور انگریزی نثر کی کتابوں کی تعداد پندرہ بنتی ہے، جن میں علم الاقتصاد، انگریزی خطبات، پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو مضامین اور متفرق تحریروں کا ایک مجموعہ، انگریزی مضامین اور خطبات و بیانات کا ایک مجموعہ شامل ہیں۔ بہت سی غیر مدون نگارشات اس کے علاوہ ہیں۔ غرِ اقبال کی یہ مقدار ان کی شاعری سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ فقط مقدار کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل چیز تو معیار ہے۔ اگر علامہ کی نثر کا فکر و فن کے اعتبار سے مطالعہ کیا جائے اور اس کی جانچ پرکھ کر کے اس کی تعین

196
of 428

77.1KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

قدر کی جائے تو بھی مایوسی ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ نثر اقبال ان کے سوانح شخصیت، افکار و تصورات، ان کے ذوق جمال، ان کے دینی و سیاسی تفکر اور "شخص اور شاعر" کے بہت سے پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ فکر اقبال کے متعدد عنوانات کے بارے میں جس قدر تفصیل ان کی نثر میں ملتی ہے، وہ شاعری میں موجود نہیں۔"

ہاشمی صاحب یہ اعتراف تو کرتے ہیں کہ اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ چنان چہ جب وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں تو ان کی نثر کو وہ اہمیت اگر نہیں دی گئی تو اس میں شکایت کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ فکر اقبال کے سلسلے میں جس قدر تفصیل ان کی نثر میں ملتی ہے، وہ شاعری میں نہیں ملتی اور مل بھی نہیں سکتی ہے۔ نورالحسن نقوی نے اپنی کتاب..... "اقبال: شاعر و مفکر" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"جتنے قارئین اور ناقدین اقبال کو میسر آئے، وہ شاید آج تک اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے فکر و فن پر بے شمار کتابیں موجود ہیں اور برابر ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

یہاں اقبال کی نثر کی اہمیت سے انکار مقصود نہیں ہے۔ ان کی نثر کا بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے اور اس پر کام بھی ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اگر شاعر نہ ہوتے صرف نثر نگار ہوتے تو کیا انہیں اتنے قارئین اور ناقدین ملتے، جتنے ان کی شاعری کو ملے۔ ویسے بھی علمی و فکری نوعیت کے مضامین کے قارئین کا دائرہ بہت محدود ہوا کرتا ہے۔

جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے، اس کے حوالے سے ہمارے جو ادبی رویے رہے ہیں۔ وہ بڑے ستم ظریفانہ ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حلقے نے انہیں صرف مسلمانوں کا شاعر سمجھ لیا۔ انہیں شاعر اسلام اور مفکر اسلام کا درجہ دے دیا گیا جب کہ انہوں نے رام چندر پر بھی نظم کہی جس میں انہیں امام ہند قرار دیا گیا ہے۔ گرونانک پر بھی انہوں نے نظم کہی۔ دوسری جانب ترقی پسندوں نے انہیں تقریباً اشتراکی سمجھ لیا۔

197
of 428

50.3KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

اقبال کے اس طرح کے اشعار اس کا سبب ہیں:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

.....

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کی لینن سے متعلق نظم خاص طور سے اس کا سبب بنی۔ جس کے ان اشعار کو ترقی پسندوں نے خوب اجاگر کیا کہ:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے اپنے دل کی بات ڈرامائی انداز میں لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں کہلوا دی۔ لیکن اس بنا پر انہیں اشتراکی نہیں قرار دیا جا سکتا کیوں کہ خدا پر ان کا یقین اس نظم میں بھی نمایاں ہے۔

اقبال لکھنؤ کے نہیں تھے۔ وہ سیال کوٹ (پنجاب) کے تھے۔ چناں چہ ان کی شاعری میں لکھنؤ کی زبان کی نزاکتیں تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ پنجاب کے لوگوں اور لکھنؤ والوں کی زبان میں یکسانیت نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعری زبان دانی نہیں ہے۔ محمود ہاشمی (مرحوم) نے بہت پہلے لکھنؤ ہی کے ایک ادبی جلسے میں کہا تھا کہ شاعر اور ادیب کا ماہر لسانیات یا بہت بڑا زبان داں ہونا ضروری نہیں ہے۔ زبان پر اسے بس اتنی دسترس ہونا چاہیے کہ وہ اپنی بات، اپنا مافی الضمیر موثر انداز میں بیان کر سکے۔ مگر لکھنؤ والوں نے زبان کی صحت اور اس کے حسن پر ہمیشہ اتنا زور دیا کہ

198
of 428

47.2KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

زبان ہی زبان رہ گئی۔ Contents ثانوی چیز بن کر رہ گئے۔

اقبال کی لکھنؤ آمد اور میر انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید سے ان کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی نے ''رباعیات رشید لکھنوی اور احوالِ پیری'' میں لکھا ہے کہ:

''علامہ اقبال لکھنؤ کی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ ایک دن سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ تانگے میں پیارے صاحب رشید کے گھر پہنچ کر اپنی معروف غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

ع تجھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

اقبال کہتے ہیں رشید صاحب بالکل خاموش غزل سنتے رہے اور کسی شعر پر داد و تحسین نہ دی بلکہ غزل کے اختتام پر صرف یہ سوال کیا کہ کیا یہ آپ کی غزل اردو کی غزل ہے۔ علامہ اقبال دوستوں میں اس واقعے کو ہنس ہنس کر بیان کرتے تھے کیوں کہ یہ فارسی آمیزش کی زبان پیارے صاحب کی نظر میں اردو غزل کے لہجے، رچاؤ اور مزاج کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس واقعے کو ''غزلِ اردو کی شعری روایت'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے مضامین و خیالات چوں کہ تازہ اور اپنے پیش رو اور معاصر، دونوں قسم کے شاعروں سے الگ ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں کی زبان و اسلوب کو اوروں کی غزل سے الگ ہونا چاہیے تھا۔ جو لوگ اس زبان میں غرابت اور اجنبیت محسوس کرتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے خود کو اقبال کے افکار و خیالات سے مانوس و ہم آہنگ بنائیں، ورنہ غزل ہی کیا، اقبال کی پوری شاعری ان کی نظر میں نامانوس و اجنبی ٹھہرے گی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال ہی کا بیان کردہ ایک لطیفہ سنانے کو جی چاہتا ہے۔ علامہ کا بیان ہے کہ جب میں لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید میاں زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی، جس

199
of 428

5.60KB/s 6:44 47%
Allama Iqbal : Hayat-o- Search
Allama Iqbal : Ha...

میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں، چنان چہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں، میں نے اپنی چند نظمیں سنائیں۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب و انشراح اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھنویں تنتیں اور پھیل جاتی تھیں، کبھی آنکھیں یک بارگی کھلتیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا کہ آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی لیکن جو کچھ عرض کیا، آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ انہوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا، ہاں صاحب سنا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اردو ہم نے آج تک نہ پڑھی ہے نہ سنی ہے حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔"

("رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری" مرتبہ: ڈاکٹر تقی عابدی ص 46-47)

یہاں یہ عرض کرنا برمحل ہوگا کہ بڑے بڑے زبان داں بڑے فن کار نہیں ہو سکے۔ وہ صحت زباں اور الفاظ کی نزاکت و لطافت پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے رہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جتنی اہمیت زبان و اسلوب اور طرز اظہار کی ہوتی ہے۔ اتنی ہی اہمیت Contents کی بھی ہوتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ زبان داں جہاں تھے، وہیں رہ گئے اور اقبال کی اہمیت کو ایک عالم نے تسلیم کیا۔ اس طرح وہ عالمی شہرت و مقبولیت کے حامل شاعر کی حیثیت سے ادب کی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ بن گئے۔

❖❖❖

200
of 428

ڈاکٹر دبیر احمد (کولکاتا)

اقبال کی شاعری میں فلسفۂ خودی کا تصور

اقبال ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جسے قدرت نے تحریر و تقریر کی قوت بخشی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان میں اقبال جیسا فلسفی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ تقریباً 8 دہائیاں گذرنے کے باوجود وہ ہماری سانسوں میں اور گفتگو میں زندہ ہیں۔ دراصل اقبال زندگی کا سب سے بڑا اور اہم شاعر ہے جس کی شاعری میں خیالات اور تخیلات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ جس طرح اقبال کی زندگی متحرک تھی اسی طرح اس کی شاعری میں بھی جوش، شدت اور نمو موجود ہے شرط یہ ہے کہ اس کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے ہمارے پاس نظر ہو۔ اس کی شاعری دراصل فلسفیانہ خیالات ہیں لیکن وہ فلسفہ نہیں جس کے معنی محدود ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ فلسفہ جس کا منتہائے نظر عقلی موشگافیوں سے زیادہ عقل سلیم کے ذریعہ کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا دوسرے معنی میں وہ فلسفہ جس کا مقصد یقیناً زندگی کی ترجمانی ہو۔ خود اقبال کے اشعار اس بات کے گواہ بنتے ہیں:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

دراصل اقبال کی شاعری پیغام انسانیت ہے اور اس پیغام انسانیت میں فلسفہ کی بنیاد خودی کا تصور ہے:

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر!
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پر نیاں و حریر

اقبال کی شاعری میں تصور خودی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس عناصر کو سمجھیں جس کے ذریعہ اقبال جمادات، نباتات اور حیوانات کی منازل کو طے کرتا ہوا انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے اور پھر دھیرے دھیرے ترقی کے زینے طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ یعنی کہا جا سکتا ہے کہ انسان مجموعہ ہے حیوانیت اور ملکیت کا۔ خودی کی تربیت دراصل ہوتی ہے انسانی زندگی کے ذریعہ جو اس کا سب سے بڑا اور اہم نصب العین ہے لیکن جب انسان اپنے محور سے دور ہو جاتا ہے تو حیوانیت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ چند اشعار بطور حوالہ پیش کر رہا ہوں:

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!
اس دور میں بھی مرد خدا کو ہے میسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی

اقبال کا فلسفہ خودی جس کے لیے انہوں نے مولانا رومی سے روشنی حاصل کی

ہے اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں تخلقوا با خلاق اللہ یعنی خودی ایک ایسی چیز ہے جس کا تصور یقیناً اللہ کے رسول نے نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کو عملاً کیا بھی۔ انہوں نے رنگ و نسل میں امتیاز ہی نہیں کیا بلکہ رنگ و نسل نیز قبائل کے ناپاک بتوں کو ریزہ ریزہ کر کے ایک نہایت جامع تصور انسانیت کا پیش کیا۔ ظاہر ہے اقبال اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے جس میں آہ و بکا کی صدائیں محسوس کی جا سکتی تھیں وہ اس صدمے سے دل برداشتہ تھے۔ انسانیت کو اخوت و محبت کے ذریعہ ایک نئی منزل پر دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔ بطور حوالہ اشعار پیش کر رہا ہوں :

دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم
اہل سجادہ ہیں یا اہل سیاست ہیں امام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں باقی رہتی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

اقبال کے نزدیک خودی کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ خودی صرف افراد ہی میں نہیں بلکہ اقوام میں بھی پائی جاتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہر قوم ایک مخصوص خودی کی قائل ہوتی ہے۔ بلکہ خودی کی تشکیل اور نشو و نما ذرا وسیع تناظر میں دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تربیت پوری کائنات کرتی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے انسان جو اسی کائنات کا ایک فرد ہے لہٰذا اسے بھی اس کام کو بحسن و خوبی انجام دینا چاہیے۔ اقبال جیسے سچے فن کار نے اسلام کی خودی کو اپنے شعر میں اس طرح پیش کیا ہے :

روح اسلام کی ہے نور خودی ، نار خودی
زندگانی کے لیے نار خودی نور و حضور!
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصل نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور

اہل نظر جانتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب انسانیت غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی

تھی ۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی وجہ سے انسانی خصائص دم توڑ دیتی ہے اور انسان حیوانوں کی طرح اپنی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتا ہے پھر دیکھتے ہی دیکھتے انسان حیوان بن جاتا ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ غلامی نے خودی کو نقصان پہنچایا ہے۔ جب اس نقصان کی طرف علامہ کی نظر جاتی ہے تو ان کا دل تڑپنے لگتا ہے جس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں :

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اقبال مسلمانوں کو مقتدی کی حیثیت سے نہیں بلکہ امام کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے وہ اس بات سے پریشان خاطر رہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کا ماضی اتنا شان دار تھا آخر ان کا حال اتنا افسوس ناک کیوں ہے؟ اقبال کا یہ خیال بھی کسی راز سے کم تر نہیں کہ عمل کے ذریعہ انسان اور کائنات یقیناً ارتقا کی بلندیوں کی طرف گام زن ہے۔ لہٰذا شاعر خود سوال کرتا ہے ارمغان حجاز میں کہ :

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اقبال نے قوموں کی تباہی کے اسباب، تعلیم اور قومی فلاح و بہبود، فرد اور جماعت کا باہمی تعلق، غلامی، افلاس کے منفی اثرات اور تسخیر فطرت جیسے نکات پر غور و فکر کرتے ہوئے خودی پر روشنی ڈالی ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ مذکورہ نکات اقبال کے فکر و نظر کے محور

رہے ہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہی وہ نکات ہیں جن پر علامہ نے مسلسل غور و فکر کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کے فکری رویے متعین ہوتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں اقبال کے مضامین ''علم الاقتصاد'' اور ''قومی زندگی'' ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں مسلمانوں کے حالات، مذہبی تنازعات، تمدنی زبوں حالی اور افلاس پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''یہ بڑا نازک وقت ہے اور سوائے اس کے کہ تمام قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ کرے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دنیا میں کوئی بڑا کام سعی بلیغ کے بغیر نہیں ہوا، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔''

قوم کی تقدیر کیسے بدل سکتی ہے یہ ایک سوالیہ نشان ہے کیوں کہ وہی اقوام اپنی تقدیر بدل سکتی ہیں جو خود اپنی ذاتی اصلاح کریں۔ اقبال کے دل و دماغ میں ہندوستانی اقوام کے لیے بالعموم اور مسلمان قوم کے لیے بالخصوص ایک درد تھا جس کے تئیں انہوں نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار بارہا کیا ہے۔ اقبال کے بعض اشعار اس بات کے گواہ ہیں کہ انہوں نے مشرق کی حالت بدلنے، مشرقیوں کی زندگی میں انقلاب لانے نیز مسلمان قوم کی راہبری کے لیے ہی شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔ عبدالقادر کے نام اپنی ایک نظم میں اظہار خیال یوں کرتے ہیں :

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ :

''دنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح

کی طرف توجہ نہ کریں"۔ (مقالات اقبال ص 53)

شاعر مشرق علامہ اقبال ایک حقیقت شناس مفکر و دانا تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے اچھی طرح باخبر تھے۔ وہ ہر وقت اس خیال میں غرق رہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ کس طرح حل کیا جا سکے۔ اپنے ایک مضمون The Muslim Cemmnuity : A Soical Study میں جو مجلہ تحقیق لاہور کے جلد 3 شمارہ 1 میں شائع ہوا، کے صفحہ 22 میں لکھا ہے کہ:

"اگر قومی تسلسل حیات ہمارا مقصود ہے تو ہمیں سیرت کا ایسا نمونہ تیار کرنا چاہیے جو بہر قیمت اپنی سیرت میں استقلال رکھتا ہے اور جب کہ دوسرے نمونوں کے محاسن کو بلا تامل اختیار (جذب و قبول) کرتے ہوئے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی سے وہ تمام (عناصر) خارج کر دیتا ہے جو اس کی عزیز روایات اور اداروں سے مخاصمت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلم قوم کے گہرے مشاہدے سے اس محور و مرکز کا انکشاف ہوتا ہے جس پر قوم کے اخلاقی تجربے کے مختلف خطوط اتصال آمادہ ہیں۔"

اہل نظر اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری اور اس کے نظام فکر میں خودی کو جو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کا ذکر اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ خودی مجموعہ ہے حیات، مقصد، عمل اور شعور کا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے خودی کو کبھی بھی عام مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ وسیع تناظر میں پیش کرتے ہوئے خودی کو دو سطحوں میں پیش کیا ہے اور وہ دو سطحیں ہیں "امر" اور "خلق"۔ "امر" لامحدود ہے جب کہ خلق محدود۔ اقبال کی کائنات شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہم پر یہ روشن ہوگا۔ 1914ء سے 1918ء تک انہوں نے خودی کا تصور مرتب کر لیا تھا۔ یہی وہ نظام فکر ہے جس سے انسانی زندگی نیز کائنات کے مسائل کے حل کی کاوش اقبال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کیوں کہ انہیں اس بات کا کامل یقین تھا کہ کائنات میں خودی کا ظہور دراصل فطرت الٰہی کا خاصہ ہے اور اس خودی کی مختلف شکلیں ابھرتی ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں :

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریٰ و حور

اقبال کا فلسفہ حیات خودی ہے جو ان کی شاعری اور فکر و نظر کا محور ہے۔ اس فلسفے میں ہم انسان کی حیثیت کیا ہے یا انسانی زندگی کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے جواب کو تلاش کرتے ہیں جس طرح قدیم یونانیوں نے انسان اور کائنات کے وجود کو سرے سے انکار کرتے ہوئے اسے دھوکہ کہا ہے اور جب اسلام کا ظہور ہوا تو اس نے اس خیال پر مہر تصدیق لگادی۔ بیش تر شعرا نے بھی دنیا میں دل لگانے کو غلط قرار دیا ہے۔ اردو شاعری کی آبرو میر تقی میر کا شعر یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ :

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

غالب نے انسانی وجود کے اثبات کا اشارہ اپنی شاعری میں کیا ہے :

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

مذکورہ اشعار کی روشنی میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے وجدانی طور پر جو محسوس کیا اسے بیان کر دیا ہے جب کہ اقبال نے انہیں خیالات کو فلسفۂ حیات میں پیش کیا ہے اور اسی فلسفۂ حیات میں اقبال احساسِ ذاتِ خداوندی کا ادراک محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کا خائر مطالعہ اقبال نے قیامِ یورپ کے درمیان کیا تھا۔ بالخصوص فارسی شاعری جو ایران میں فروغ پا رہی تھی اس نے ایک بیماری کی شکل اختیار کر لی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بیماری ساری قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالی اور اکبر اپنی شاعرانہ تخیل کی بنیاد پر مسلمانوں کے اندر بالخصوص خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے اسی نظریے پر اقبال نے قوم مسلم کے زوال کا سبب ڈھونڈا اور خودی کا احساس دلا کر قوم مسلم میں تازہ قوتیں پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال اپنی شاعری میں خودی کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کرتے جسے تکبر یا غرور کا نام دیا جا سکے بلکہ خودی کا مفہوم اقبال کے ہاں غیرت مند کے ہے تا کہ انسان اپنی دنیا آپ پیدا کر سکے۔ اشعار پیش کر رہا ہوں :

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بے داریِ کائنات
زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی
ستم اس کے موجوں کی ہستی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پزیر

انسان کی ساری کامیابی و کامرانی کا دارو مدار خودی میں پوشیدہ ہے۔ اسی خودی کی بدولت انسانوں نے بدی پر فتح حاصل کیا ہے۔ اقبال کی زبان میں خودی کی تعریف سنیے :

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

.....

خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پر نیاں و حریر

اقبال نے خودی کو زندگی کا مرکز تصور کرتے ہوئے کہا ہے کہ خودی سے دوری ملت کی موت ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ خودی کو اپنی زندگی کا خاص مرکز تسلیم کریں جس کا اظہار یوں کیا ہے :

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

اقبال کی نگاہ میں خودی سچے مومن کی شان ہے۔ اس سے مسلمانوں کی صفات کا پتہ چلتا ہے۔ مسلمان اپنے گفتار اور کردار کی وجہ سے شناخت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ غفاری، قدوسی اور جبروت ایسے عناصر ہیں جس کے مجموعہ کا نام مسلمان ہے۔ اس طرح کے بے شمار اشعار اقبال کے مجموعہ کلام میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ اقبال نے پیغامِ خودی کو اپنی شاعری کا محور بنا کر اردو شاعری میں اس نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ بطور نمونہ اشعار پیش کر رہا ہوں :

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال ایک ایسے شاعر کا نام ہے جن کے خیالات خودی کی تعریف میں بکھرے ہوئے ہیں۔ فلسفۂ عجم میں اقبال نے خودی کا واضح اشارہ کیا ہے نیز ''اسرارِ خودی'' کا

دیباچہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اقبال نے دنیا کی تاریخ کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور انجذاب کے بعد فلسفۂ خودی کی تشکیل کی تھی۔ ''اسرارِ خودی'' کے دیباچہ میں انہوں نے وحدت الوجود کے عقیدے کے پیش نظر خودی اور خدا کے ان تصورات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جو برسوں جنوبی ایشیا میں مروج تھے۔ خودی کے سلسلے میں علامہ کے وہ اشعار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں جس کے غائر مطالعہ سے ہم پر روشن ہوگا کہ خودی کیسے کیسے عمل کرتی ہے:

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
جس بندۂ خود بیں کی خودی ہوگئی بے دار
شمشیر کی مانند ہے برندہ و براق

''اسرارِ خودی'' میں علامہ نے خودی کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کی تشکیل، عناصرِ ترکیبی، ماخذ اور امکانات پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ''اسرارِ خودی'' کے مطابق اس دنیا کا ظہور خودی کی نمود ہے اور خودی کی بے داری ہی اس کی تخلیق کا سبب ہے۔ انسانی زندگی میں نت نئے مقاصد جنم لیتے رہتے ہیں جو ہماری زندگی کے آثار و نقوش کو روشن رکھتے ہیں۔ مقاصد کی تخلیق دراصل خودی کا نور ہے۔ ایک ایسا نور جو ہماری زندگی کو منور رکھتا ہے جس کی طرف اقبال کا نظریہ اس طرح ہے کہ:

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاک ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر

خودی کی تابندگی یا پائندگی کیا ہے؟ تخلیقِ آرزو ہے۔ آرزو کیا ہے؟ کہا جا سکتا ہے

کہ تمنا جب شدت اختیار کرتی ہے تو آرزو بن جاتی ہے اور آرزو جب ناکام ہوتی ہے تو حسرت بن جاتی ہے۔ کیوں کہ آرزو کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ آرزو ایک مسلسل عمل کا مظہر ہے۔ جو کبھی پوری نہیں ہوتی۔ اقبال نے آرزو کو ایک اصطلاح کی شکل میں نہیں بلکہ فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش انسانی وتیرہ ہے۔ اقبال کی زبان میں خوب سے خوب تر کی تلاش اور حسین سے حسین شے کے لیے انسان کے اندر تڑپ کا پایا جانا کچھ اس طرح ہے :

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
پنداں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر، ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

شوق آرزو کو خودی کی منزل کہا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ہم اس چیز کی تلاش و جستجو میں بھٹکتے رہتے ہیں جہاں اگر خودی کا مسافر پہنچنا چاہے تو پہنچ سکتا ہے اقبال کہتے ہیں:

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

اطاعت، ضبط، نفس اور نیابت الٰہی کے مجموعہ کو خودی کہتے ہیں یعنی خودی کا مفہوم اگر ہم تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ذاتی اغراض و مفادات پر ملت کے اغراض و مفادات کو ترجیح دینا چاہیے۔ ایسا کرنے سے انسان کی خودی مجروح نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے مزید تقویت ملتی ہے۔ اس لیے فرد کو چاہیے کہ خودی کی حفاظت خود کرے تاکہ وہ

ترقی کی منزلوں تک پہنچ سکے اور خدا کی توجہ کا مرکز بن سکے :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

.....

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

غرض کہ اقبال کا عجز و انکسار ان کی بلند اخلاقی کا بین ثبوت ہے۔ آج لوگ اقبال کے فلسفہ کو اپنے جلو میں نئے معنی لیے ہوئے لفظوں کو استعمال کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ شاعری کو سائنس کی سطح پر کبھی بھی پرکھا نہیں جا سکتا اور نہ ہم اسے منطقی استدلال کے سہارے سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے ایسا کرتے ہوئے اقبال پر رجعت پسند فاسسٹ اور پیام بر کا لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کی یا ان کے نثری معانی سے بحیثیت شاعر اقبال کی قدر و قیمت متعین کرنا چاہا۔ ایسا کرتے ہوئے اقبال کی شاعری موضوع بحث نہیں بنی بلکہ ان کا فلسفہ، پیام، تصوف یا دوسری زبان کے شعرا اور ادبا کے ساتھ ان کا تقابلی جائزہ لیا اور اقبال کی شعری خوبیوں اور خامیوں کو پس پشت ڈال دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کا تعلق مندر کے اس پجاری کی طرح ہرگز نہیں ہے جو اپنے دیوتا پر صبح و شام عقیدت کے پھول چڑھایا کرتا ہے۔ اقبال نام ہے ایک ایسے شاعر کا جس نے تشبیہ کی ندرت اور استعارے کے نظام کی مدد سے اپنی شاعری میں ایک کیفیت، موسیقی اور آہنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال اتنی سی بات تو پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اقبال کی شاعری میں کوئی بھی فلسفہ ہو معمولی یا غیر معمولی وہ ہماری محسوسات کا جز بن جاتے ہیں اور یہی وہ محسوسات ہیں جو اقبال کی شاعری کو معراج عطا کرتی ہیں۔

❖❖❖

ڈاکٹر محمد شکیل اختر (نئی دہلی)

ریڈیائی تحریروں میں فکر اقبال کی عکاسی

علامہ اقبال کی رحلت ایشائی ادب اور تہذیب کی تاریخ میں ایک بڑا سانحہ تھا۔ اس خبر سے برصغیر میں ایک صف ماتم بچھ گیا اور ہر ایک نے ان کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ علامہ اقبال کی ساٹھ سالہ زندگی انھارویں اور انیسویں صدی دونوں پر محیط ہے۔ یہ دور عالمی تاریخ اور روشن خیالی کا ایک اہم دور ہے۔ پوری دنیا میں ادب، تاریخ، سائنس اور مواصلات میں نئے نئے تجربے اور ایجادات ہو رہے تھے۔ صنعتی انقلاب نے ان ایجادات اور تجربے میں ایک نیا رنگ اور آہنگ بھر دیا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں تبدیلی آئی اور دیکھتے دیکھتے دنیا نے چاند پر کمندیں ڈالنے سے لے کر سائبر اسپیس تک کا سفر کر لیا۔ ان تمام تر تجربات اور ترقیات میں ترسیل کی ترقی ایک ناگزیر حقیقت تھی اور انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دنیا ایک اور انقلاب سے دوچار ہوئی اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں نشریات کا آغاز ہوا اور پہلی بار دور دراز

لوگوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ دنیا کی یہ تمام ترقی اور تبدل علامہ اقبال کی نظروں میں تھی کیوں کہ وہ ایک دانائے راز تھے۔ وہ قدرت کے راز سے اچھی طرح واقف تھے اور دنیا کے لب و رخسار کو سنوارنے میں اہم رول ادا کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اس دور کے سیاسی نظام سے وہ غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں علامہ اقبال کی شاعری جب مقبولیت کے عروج پر تھی تو انگریزی سامراجیت کے خلاف تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔ ان تمام سرگرمیوں کے درمیان ہندوستان میں تجرباتی نشریات کا آغاز ہوا اور علامہ نشریات میں ہونے والے ترقیات سے بھی خوب واقف تھے۔ تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی مطبوعہ ریڈیو ٹاک 12 اکتوبر 1929ء کی ہے جسے ملا واحدی نے لکھا تھا لیکن اس سے قبل اردو نشریات کا آغاز ہو چکا تھا۔ خواجہ عبدالمجید، مولوی عبدالرحمان، پنڈت دتاتریہ کیفی اور بے خود دہلوی اردو نشریات سے وابستہ ہو چکے تھے لیکن اس پورے عرصے میں کہیں بھی علامہ اقبال کا نام نظر نہیں آتا۔ علامہ کے فکر و فن پر ریڈیو سے پروگرام نشر کرنا تو دور کی بات مجموعی طور پر علامہ کے کسی ریڈیو ٹاک یا مباحثے میں شرکت کے اشارے بھی نہیں ملتے۔ علامہ اقبال کی سردست ایک ریڈیو ٹاک کا حوالہ ملتا ہے جسے انھوں نے پہلی جنوری 1938ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے پڑھا تھا۔ نئے سال کی آمد پر اقبال کی اس ریڈیو ٹاک کے متعلق چنداں اختلاف بھی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اقبال نے سال نو کی اسکرپٹ ریڈیو کو بھیجی تھی کیوں کہ ان دنوں ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور اس کے ٹھیک دو ماہ اکیس دن بعد وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ آج یہ ایک غور طلب امر ہے کہ علامہ کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا ادبی گروہ بندی انہیں اس طاقت ور میڈیم سے دور رکھنا چاہتی تھی یا اقبال کی بے نیاز شخصیت نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اقبال کے خطوط میں بھی اس کے اشارے نہیں ملتے۔

تاہم ہندوستان میں ابتدائی نشریات کے گیسو سنوارنے میں سید احمد بخاری اور ذوالفقار بخاری نے اہم کردار ادا کیے ہیں۔ یہ دونوں بھائی 1936ء میں آل انڈیا ریڈیو

سے وابستہ ہو گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا ہر طرف شہرہ تھا۔ یہ دونوں اردو والے تھے لیکن نہ جانے وہ کون سی مجبوری تھی کہ علامہ کو ریڈیو پروگرام میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ حالاں کہ اس دور کے تمام اہم ادیبوں اور شاعروں کو چن چن کر بخاری برادران نے ریڈیو میں رکھا۔ اس دور میں اقبال کی شخصیت ایک متنوع شخصیت تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، فلسفی بھی، مفکر بھی اور ماہر معاشیات بھی۔ اس کے باوجود ارباب ریڈیو نے ان سے صرف نظر کیا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ آج ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کی پوری زندگی پیہم رواں دواں زندگی کی مثال ہے۔ اس دور میں دلّی، لاہور، پیشاور اور لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آ چکا تھا لیکن ان چاروں ریڈیو اسٹیشن کی نشریاتی سرگرمیوں میں علامہ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ یہ ہماری بدتوفیقی تھی کہ ہم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس دور میں ریڈیو شمالی ہندوستان میں کافی مقبول تھا اور اردو ادیبوں کی ایک کہکشاں اس سے وابستہ تھی۔ کس کا نام لوں کس کو چھوڑ دوں۔ فیض، ن۔م۔ راشد، دین محمد تاثیر، منٹو، آغا اشرف، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ فہرست بہت طویل ہے۔ سبھوں نے اپنے مقدور کے مطابق اس میڈیم کی آب یاری کی۔ فیض کو تو دنیا ترقی پسند شاعر کے بطور جانتی ہے لیکن انہوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے اور ناکس بھی لکھے اور دوسرے حضرات ریڈیو کے لیے لکھتے رہے لیکن ان میں شمولیت نہ تھی تو صرف اقبال کی۔ آیئے ان حالات کا جائزہ لیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ یہ جائزہ میرے ذاتی مفروضے پر مبنی ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں نشریات کا آغاز دو کمپنیوں کے ذریعہ 1927ء میں ہو گیا تھا اور باقاعدہ منظم نشریات کا آغاز 1936ء میں ہوا جب اس ادارے کا نام بدل کر آل انڈیا ریڈیو رکھا گیا۔ 1936ء ایک لینڈ مارک ہے ہندوستان کی نشریات میں۔ اسی سال سید احمد بخاری اور ذوالفقار بخاری بھی ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں کا تعلق پیشاور اور لاہور سے تھا۔ اسی لاہور کی فضا میں اقبال بھی سانس لے رہے تھے اور آج بھی وہیں پیوند خاک ہیں لیکن پطرس اور ذوالفقار دونوں کی نظریں ان پر نہیں

پڑتی ہیں۔ حالاں کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اقبال بلندیوں کے معراج پر تھے اور کوئی بھی اردو والا ان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا۔

اس دور کا ایک خوش گوار نکتہ 1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہے۔ اس کی پہلی مجلس لکھنؤ میں ہوئی تھی جہاں آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اس تحریک نے ہمارے ادیبوں کو ادب برائے زندگی کا تصور دے کر ادبی مقاصد سے روشناس کرایا۔ وہیں اس تحریک سے وابستہ افراد روسی انقلاب اور روسی فکر سے حد درجہ متاثر تھے۔ گویا یہ تحریک روس ہی کی دین تھی جس کے زیر اثر کمیونزم کی تحریک پھیلی۔ یہاں ایسا احساس ہوتا ہے کہ اقبال اور ترقی پسند ادیبوں کے درمیان نظریاتی کش مکش ضرور ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ 1936ء میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے فوراً بعد اس کے اردو پروگراموں پر ترقی پسند ادیبوں کا تسلسل ہو گیا۔ ان کی ترجیحات میں شامل تھا کہ اس نئے میڈیم کے ذریعہ کس نوع کے ادب کی تشہیر ہوگی اور یہ سلسلہ 1977ء تک جاری رہا۔ اس تصویر کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ اقبال کے انتقال پر آل انڈیا ریڈیو سے خبریں تو ضرور نشر ہوئیں لیکن ان پر کوئی خصوصی پروگرام یا Tribute کا پروگرام نشر نہیں کیا گیا۔ آواز کے کسی بھی شمارے میں اقبال سے متعلق اس نوع کے پروگراموں کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس کی ابتدا 21 اپریل 1938ء کو مرزا محمد سعید کی ایک ٹاک بعنوان ''اقبال'' کی نشریے سے ہوئی۔ گویا 1936ء سے لے کر 1938ء کے درمیانی مدت میں اقبال کی ایک ٹاک اور اقبال پر ایک ٹاک براڈ کاسٹ ہوئی۔ یہ وہی مرزا سعید ہیں جو گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے شاگرد تھے اور انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اقبال کو نظمیں پڑھتے دیکھا تھا اور سنا تھا۔ اس ریڈیو ٹاک میں انہوں نے انجمن حمایت الاسلام لاہور میں اقبال کے نظم پڑھنے کا ایک منظر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال نے ہال میں نظم ترنم سے پڑھی جو سناٹا وجد کرتا۔ نظم کے خاتمے پر بہت سے لوگوں نے جی کھول کر داد دی اور نذیر احمد صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں نے میر انیس

اور مرزا دبیر کو بھی مرثیہ پڑھتے سنا ہے لیکن ان کی مرثیہ خوانی سے وہ کیفیت میرے دل
میں پیدا نہیں ہوئی جو اس وقت اس نوجوان شاعر کی اس دردانگیز نظم سے پیدا ہوئی ہے۔"

(بحوالہ اقبال مرزا محمد سعید مشمولہ ساقی جون 1938ء ص 175)

اقبال کی رحلت پر یہ تعزیتی تقریر انتہائی معلوماتی اور متاثر کرنے والی ہے اور لکھنے والے کا ایک ایک لفظ اقبال کی محبت سے سرشار و فگار ہے لیکن ریڈیو کی دنیا کا اپنا تجاہل عارفانہ ہے۔ حالاں کہ اس دور میں ٹاک کے علاوہ ڈرامے اور فیچر بھی ریڈیو سے نشر ہو رہے تھے اور ان سب کی سرپرستی ذوالفقار بخاری کر رہے تھے لیکن علامہ پر اس نوع کے کسی پروگرام کا اشاریہ نہیں ملتا۔ اس وقت ہندوستانی نشریات دو متوازی خطوط پر چل رہی تھی۔ شمالی ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کی نشریات تھی اور جنوب میں دکن ریڈیو نے فضاؤں میں دستک دی تھی لیکن یہاں سے بھی اقبال کو کسی طرح کی خراج تحسین یا ان پر مربوط پروگرام نشر کیے جانے کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اقبال کے تئیں ہماری اردو نشریات کا یہ رویہ تھا۔ اب ہم یہاں جائزہ لیں گے کہ اقبال سے متعلق جو تحریریں نشر کی گئیں ان میں فکر اقبال کی عکاسی کس حد تک ہوئی ہے۔ اقبال پر ریڈیو ٹاک اور مباحثے کا سلسلہ 1940ء میں شروع ہوا۔ انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس نے 1929ء میں ایک سلسلہ شروع کیا تھا "کیا خوب آدمی تھا"۔ اس سلسلے کے تحت اردو کے مشاہیر پر ریڈیو ٹاک نشر کی گئی۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے بند ہوتا رہا اور پھر شروع ہوتا رہا۔ 1939ء میں یہ سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا جس کے تحت ممتاز حسین نے "علامہ اقبال" کے عنوان سے ایک ٹاک 5 فروری 1940ء کو پڑھی۔ یہ اقبال پر ریڈیو کی پہلی ٹاک تھی۔ اس ٹاک میں انھوں نے علامہ کی شخصیت کا غیر معمولی نقشہ کھینچا ہے اور عام زندگی میں علامہ کا لباس کیسا ہوتا تھا اور وہ کس طرح کے لوگوں سے ملتے تھے اور اس سلسلے میں چند واقعات بھی بیان کیے ہیں تاہم ان کی شاعری اور فکر پر ایک سطر بھی نہیں ہے۔

دوسری طرف حیدرآباد دکن کے اشرف حسین عابدی نے دکن ریڈیو سے ایک ٹاک

''اقبال فردوس میں تھے میں نے دیکھا'' پڑھی۔ اس ناک میں انھوں نے اقبال کو جنت میں دکھایا ہے جہاں پہلے سے عربی اور فارسی کے شعرا موجود ہیں اور جب فرشتے انہیں بتاتے ہیں کہ کوئی اقبال نام کا شاعر بھی یہاں آ رہا ہے تو سعدی، حافظ سمیت تمام لوگ بے چین ہو جاتے ہیں اور ہر شخص ان سے ملنے کا متمنی ہے۔ اس ناک کے چند ابتدائی جملے دیکھیے :

''برسات کی رات تھی۔ چھم چھم مینہ برس رہا تھا۔ کوندا لپک لپک کر عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا۔ میں بانگ درا پڑھ رہا تھا۔ فردوس بریں اپنی خوب صورت اور روح پرور آغوش میں مولانا رومی، حافظ شیرازی، حالی، فردوسی، طوسی، اسد اللہ خاں غالب، حضرت عمر خیام حضرت شیخ سعدی کو لیے ہوئے تھا۔ یہ سب کے سب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں فرشتے نے اطلاع دی کہ ہم اس فردوس میں ایک انسان کو لائے ہیں جو ہر انسان اور خدا سے شکوہ کرنے والا تھا۔ اس کے اٹھ جانے سے ہندوستان کے طول و عرض میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ مولانا روم نے اس فرشتے سے فرمایا۔ اے فرشتے اس شخص کے پاس لے کر چل تا کہ میں اسے دیکھوں۔ غرض مولانا بہشت کے دوسرے حصے میں آئے جہاں اقبال مقیم تھے۔ اقبال نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم ہی ہندوستان کے اقبال ہو۔ کیا شکوہ اور جواب شکوہ جس کا آسمانوں پر چرچا ہے تم ہی نے لکھا ہے کہ کیا اب بھی شاعری کا وہ رنگ باقی ہے جیسا کہ ہمارے زمانے میں تھا۔''

(بحوالہ ''سب رس'' مئی 1940ء ص 76)

اس ریڈیو ناک میں بھی اقبال کے فکر و فن پر کوئی گفتگو نہیں تھی بلکہ ایک ہلکی پھلکی ناک تھی جس میں تصوراتی طور پر اقبال کی ملاقات فارسی شعرا سے فردوس بریں میں کرایا گیا ہے۔ دل کش اسلوب کی وجہ سے یہ ایک اچھی ناک ہے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو اور دکن ریڈیو کی مشترکہ تاریخ میں اقبال پر عبدالقیوم خاں باقی کے ایک خطابیہ نشر

کیے جانے کا حوالہ معین الدین امر کی کتاب ''حیدر آبادی مصنفین کے ریڈیائی ڈرامے'' میں ملتا ہے۔ انہوں نے دکن ریڈیو کے لیے یہ غنائیہ لکھا تھا۔ ان کا غنائیہ ''اقبال'' اردو نشریات کی تاریخ میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس پورے غنائیہ کو رسالہ جامعہ نے اگست اور ستمبر 1941ء کے شمارے میں قسط وار شائع کیا۔ غنائیہ کی ابتدا سے کم عبدالقیوم خاں باقی اس کی سراحت کرتے ہوئے لکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''یہ غنائیہ فکر اور خیال کا سفر ہے جو کلام اقبال کی روشنی میں بارگاہ تجلی تک کیا گیا ہے۔ اس میں، میں نے اقبال کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام دکھانے کی کوشش کی ہے اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کو دیکھنے اور دکھانے کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں میں نے ان میں سے وہی پہلو لیا ہے جسے میں نے سب پر حاوی اور اہم سمجھا۔ یہ غلط نہیں کہ فکر اقبال کی گہرائیوں تک پہنچنا دشوار ہے۔ یہ شاید توفیق ازلی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائیہ لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس سعی دشوار پسند پر رائے زنی ہوں گی لیکن اقدام اولین کی دقتوں کی سعی سے قطع نظر اگر اس میں ناظر کو شاعر مشرق کا پیغام نظر آجائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا۔

(بحوالہ ''رسالہ جامعہ'' اگست 1941ء، ص 79)

عبدالقیوم خاں باقی نے اقبال کی فکر کو ریڈیو کے اس پر اثر ہیت میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس غنائیہ میں کل نو مناظر ہیں جیسے پہلا منظر میلاد آسمانی کا ہے جہاں روح غالب، روح حالی، گوئٹے کی روح، حافظ، عراقی، شوپنہار اور نطشے کی روحیں آپس میں مکالمہ کرتی ہیں۔ جنت میں یہ سب روحیں اپنے خیالات کو پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ وہیں غالب اپنے بلند خیالات اور تخیل سے مسرور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نور ایوان تصور، میری یزداں نگہی، برق طوفان تجلی، مری پرواز خیال، آج آشفتہ ہوئے گیسوئے شب گون فراق، آج بے تاب ہوا شاہد رنگین وصال۔ دوسرا منظر کوہ ہمالیہ کا ہے۔ اس میں غنائیہ نگار نے ہمالیہ کی فطری خوب صورتی کا منظر پیش کیا ہے۔

اس کا ابتدائیہ ملاحظہ کیجیے۔ (کوہ ہمالیہ کی سر بہ فلک چوٹیاں کوہر اور بادلوں کا ایک پرشکوہ نقاب ڈالے ہوئی ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت عمیق وادیوں میں جھولتے ہیں۔ کوہر، بادل، برف اپنا اپنا حال دل بیان کرتے ہیں :

اس نیلگوں فضا میں سردی جمی ہوئی ہے
یا چتر آسماں کو جھالر لگی ہوئی ہے
ایک وحی زندگی ہے رنگیں نزول میرا
شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا

اس حصے میں غنائیہ نگار نے ہمالیہ کی فطری خوب صورتی کو چودہ اشعار میں پیش کیا ہے اور اس منظر کے آخر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں پر فضائے آسمانی سے یہ نغمہ گونجتا ہے :

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تیسرا منظر نغمہ کائنات کا ہے جس میں عالم ناسوت، ستارے، چاند، خورشید، فضائے آسمانی، رضوان، فردوس، دو جہاں، وقت، ساقی، ملائک، جبریل اور سروش کے ذریعے کائنات کے نغمے کو چھیڑا گیا ہے اس منظر میں صرف دو مقام پر بال جبریل سے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ ستارے کہتے ہیں :

کس کی شوخی غم دل کی آہ بن کے رہی
کس کی روح ہماری نگاہ بن کے رہی
ہمارے آگے بھی پہنچا خیال حسن پرست
شعاع منزل جاں خضر راہ بن کے رہی

چاند کہتا ہے :

لے رہا تھا میری ہستی کا سکوں انگڑائیاں
سوز خاموشی میں جلتی تھی میری تنہائیاں
میرے غاروں میں اداسی تھی عدم آباد کی
میرے کہساروں میں وحشت تھی دلِ برباد کی

چوتھے منظر میں روح اقبال کو مسجد قرطبہ میں دکھایا گیا ہے جہاں ہسپانوی فلک پر چاند مسجد قرطبہ کے مینار سے کہتا ہے :

موجِ ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے
رنگِ عالم میں میری منزل سے نکل کر دیکھے

اس کے بعد مینار اور مسجد قرطبہ اپنی اپنی کیفیت اقبال کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اقبال جواباً کہتے ہیں :

کافرِ ہندی ہوں دیکھ میرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

اس منظر کا ایک خوب صورت موڑ یہ ہے کہ زندگی اقبال کے سامنے آتی ہے اور لونگ فیلو کی نظم ''نغمۂ حیات'' سنانے کی فرمائش کرتی ہے۔ زندگی مسکراتی ہے اور کہتی ہے کہ لونگ فیلو کی نظم یاد نہیں ایک اور نظم سنیے۔ لڑکے کورس میں گاتے ہیں:

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اس کے بعد غنائیہ کا تھوڑا سا حصہ ماضی کے عظمت اسلام کو پیش کرتا ہے۔ اس

میں مکہ، مدینہ، قسطنطنیہ، بغداد، دمشق، شام، فلسطین اپنی اپنی بپتا سناتے ہیں۔ ان سب کا جواب ہندوستان دیتا ہے :

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

پانچواں منظر میں ابلیس کی مضطرب روح کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر، حضرتِ خضر، پھول، صبح، کرن، سمندر، موج، دریا، شمع اور جگنو کو کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور اقبال بھی ان کے ساتھ شامل ہیں اور ان کے خیالات سن رہے ہیں اور آخر میں اقبال خوش الحانی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

ساتواں منظر ایک خانقاہ کا ہے۔ یہاں اقبال کی روح خضر راہ کی رہنمائی میں سفر کر رہی ہے۔ اسے راستے میں کالج، دفاتر اور خانقاہ ملتی ہیں۔ خانقاہ کے کنگرے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور روحِ اقبال کا استقبال یوں کرتا ہے :

اے گلستانِ عشق کے راہی خوش آمدی
اے پیکرِ خوش نگاہی خوش آمدی
گلشن میں آمد آمد فصلِ بہار ہے
عالم تمام رحمتِ پروردگار ہے
ہنگامۂ حیات سے خاموش ہے فضا
مستیِ جاں سے مے کدہ بردوش ہے فضا

پرندے کا یہ گیت سن کر شاعر کی روح محو ہو جاتی ہے اور شاعر کہتا ہے:

اے مطربِ خیال نغمہ سنائے جا
اس منزلِ سکوں کا ابھی گیت گائے جا

اس کے بعد شاعر مستقبل، عشق، خودی، یقین اور عمل ایک ساتھ مل کر پڑھتے ہیں کہ:

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں اور مکاں اور بھی ہیں

غنائیہ اقبال کا آٹھواں منظر وادیٔ ظلمات ہے۔ اس میں کردار کے طور پر آدھی رات، روح، چشمہ، باغ، کوہ پیکر پرندہ، پہاڑ کو آپس میں مکالمہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ نواں اور آخری منظر کافی طویل ہے جس میں طوفانِ تجلی کو دکھایا گیا ہے۔ اس میں جانور، راوی، فرشتہ، پھول، مینار، بلوریں گنبد اور حورِ آسمانی کے درمیان مکالمہ کرایا گیا ہے۔

اس ایک گھنٹے کے غنائیہ میں اقبال کی خودی اور انسانِ کامل کے تصور کو مختلف انداز اور آواز سے سجایا اور پیش کیا گیا ہے۔ یہ اقبال پر تادمِ تحریر پہلا غنائیہ ہے جس میں عبدالقیوم خاں باقی نے اپنے شعری جوہر خوب دکھائے ہیں اور اسے شعری التزام اور کلامِ اقبال سے مرصع کیا ہے۔ غنائیہ اب ریڈیو میں ایک زوال آمادہ صنف ہے۔ اب اس کے لکھنے والے خال خال رہ گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی اور رفعت سروش کے نام قابلِ ذکر رہے ہیں۔ یادش بخیر سلام مچھلی شہری نے ''زیب النساء'' کے نام سے ایک گھنٹے کا غنائیہ لکھا تھا جس کی ریکارڈنگ آج بھی اردو سروس میں محفوظ ہے۔

ریڈیو سے اقبال کے فکر و فلسفے کی تفہیم کی ایک اور کوشش 1943ء میں ہوئی۔ اس دور میں ریڈیو نے مباحثے کا ایک نیا سلسلہ ''پسند اپنی اپنی'' شروع کی جس کی دوسری قسط میں اقبال کی مشہورِ زمانہ نظموں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' پر اس دور کے اکابرین اور ناقدین نے اپنی آرا کا اظہار کیا۔ ان میں فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، سعید انصاری، مولانا ماجد دریابادی اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی شامل تھے۔ اول الذکر چار شخصیات نے ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان خیالات پر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اظہارِ خیال کیا۔ رسالہ ''آواز'' 22 جولائی 1943ء کے شمارے میں اس

مباحثے کو شائع کیا گیا۔ کئی صفحات پر مشتمل یہ ریڈیو مباحثہ کئی معنوں میں اہم ہے۔ اس نصف گھنٹے کے پروگرام میں اقبال کی شاعری اور بالخصوص ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان محرکات کا جائزہ بھی لیا گیا جس کے تحت اقبال نے یہ طویل نظمیں لکھیں۔ اس ضمن میں فراق گورکھ پوری کہتے ہیں :

''شکوہ اور جواب شکوہ دونوں نظمیں ہمیں کئی طرح سے متاثر کرتی ہیں۔ ان نظموں کی آواز اردو شاعری کی اہم آواز تھی۔ نئی اور اہم۔ مسدس کی تکنیک پر شاعر کو پورا عبور ہے۔ ان نظموں کی بھرپور آواز ان کی رچی ہوئی مردانگی یعنی Cultured Masculinity نے شاعرانہ اسلوب پر چھتا ہوا منتر، ایک جیتا جاگتا جادو بنا دیا۔ یہ نظمیں شاعر کے عقیدت، خودداری اور ملی احساس سے تھرتھرا اور تلملا رہی ہیں:

عقل کو سرد کر دیا روح کو جگا دیا

''شکوہ'' میں شاعر نے خدا کو مخاطب کیا ہے اور گزشتہ اسلامی کارناموں کی یاد تازہ کر دی ہے اور ''جواب شکوہ'' میں خدا نے مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دو سامی یعنی Semitic جذبہ کارفرما ہے جس کے زیر اثر کچھ تو میں اپنے آپ کو خدا کی منتخب قوم The chosen people of the world کا تصور پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں کی فکریات سے دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔''

(''آواز'' 22 جولائی 1943ء ص 1 تا 3)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا کہنا تھا کہ:

''جو دنیا خوگر تھی حمد و ثنا کی، شکر و مناجات کی آخر ایک بار وہ گلہ و شکوہ پر کھلی یا یوں کہیے کہ کھلوائی گئی۔ آقا کا کرم جب خود ناز برداری پر آمادہ ہو جائے تو کون بندہ ہے جو نیاز کی فرش زمین کو چھوڑ کر ناز کی فضا میں اڑنے لگے۔ عبدیت کی دنیا میں سنتے ہیں کہ گریۂ یعقوبی کے ساتھ ایک منزل تبسم سلیمانی بھی تو آتی ہے۔ اقبال کے شکوہ میں بندہ اپنے خالق سے روٹھ کر کہتا ہے کہ وہ بیگانوں پر، باغیوں پر، سرکشوں پر تو لطف و نوازش کی یہ بارشیں اور ہم اہل توحید

گی یہ حال زار۔ کیا یہی ہماری وفا کیشی کا صلہ ہے۔ یہی ہماری توحید پرستی کا انعام ہے۔"

("آواز" 22 جولائی 1943ء، ص 1 تا 3)

اس مذاکرے میں تینوں شرکا نے اقبال کو اپنے طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن اس مذاکرے میں پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی کے تبصرے میں نقادوں کی رائے سے اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ بلا جھجک یہ کہتے ہیں کہ :

"پروفیسر فراق، مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر مجنوں اقبال کی شاعری اور شہرت کی اصل بنیاد "شکوہ" کو قرار دیتے ہیں۔ یہ رائے واقعات کے خلاف ہے۔ اقبال شکوے کی تصنیف سے قبل اپنی وقعت اردو دنیا میں منوا چکے تھے۔ فراق کہتے ہیں کہ ان کی نظموں کی آواز ہماری شاعری کی آواز ہے۔ دونوں نظمیں ہمیں کئی طریقوں سے متاثر کرتی ہیں۔ ان کی بھرپور آواز اور چھپی ہوئی مردانگی یا تذکرے بلند شاعرانہ اسلوب بیان کو ایک چلتا ہوا منتر ایک جیتا جاگتا جادو بتایا ہے۔ عبدالماجد ان نظموں کی ادبی اہمیت کی جانچ نہ کر سکے کہا تو صرف اتنا کہا کہ عوام اپنے جذبات شکوہ میں زیادہ پاتے ہیں اس لیے پست مذاق طبقے کو شکوہ آج بھی زیادہ پسند ہے۔ میں حیران ہوں کہ ان الفاظ کو ہجو ملیح کہوں یا کیا۔ مولانا جواب شکوہ کی سطح شکوہ سے زیادہ بلند ہے۔"

(بحوالہ "پسند اپنی اپنی 2" شکوہ جواب شکوہ "آواز" 22 جولائی 1940ء)

اس طرح بڑی بے باکی سے پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے ان ناقدین کے آرا سے اختلاف کیا اور کہیں اتفاق۔ ریڈیو کے مباحثہ پروگراموں میں اس نوع کی تنقید یا تبصرہ شاذ ہی نظر آتا ہے۔ یوں 1943ء تک اقبال سے متعلق پروگراموں کی گاہے گاہے تفصیل ملتی ہے لیکن 1947ء میں یکسر منظر نامہ بدل جاتا ہے اور ایک طویل مدت تک ریڈیو کی لہروں پر اقبالیات کے پروگرام معدوم ہو گئے۔

تقسیم ہند سے برصغیر میں جو جانی و مالی نقصان ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اسی طرح زبان، ادب اور تہذیب کے درمیان میں ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ اردو زبان کو غیر ملکی

زبان گردانا گیا۔ ریڈیو کی یہ کلیدی زبان آزادی کے بعد ریڈیو کے منظر نامے پر اقلیتی زبان بن گئی۔ اردو کے پروگراموں میں تخفیف کی گئی لیکن ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ ان نامساعد حالات میں ریڈیو ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سے اردو میں خبریں اور پروگراموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اقبال کے تئیں عمومی طور پر اکثریتی طبقے میں غلط فہمیاں راہ پا گئیں جس کی وجہ سے اقبال پر سخت تنقیدیں ہوئیں لیکن آہستہ آہستہ منظر نامے میں تبدیلی آئی اور جوں جوں اقبال کے کلام کا مطالعہ اور شیڈ آتا رہا عوام میں ان کا اعتبار قائم ہوتا گیا۔ آزادی کے بعد شدومد کے ساتھ اقبال کے نظریوں کی تشہیر اور سنجیدگی سے تحقیقی کام کرنے والوں میں پروفیسر عبدالحق کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے 1965ء میں اقبال پر پی ایچ ڈی کی۔ آزاد ہندوستان میں یہ اقبال پر پہلی پی ایچ ڈی تھی اور آج تک وہ مسلسل اقبالیات کے سبز زاروں پر رواں دواں ہیں۔ ایک طویل مدت کے بعد ہندوستان کی فضاؤں میں ایک بار پھر فکر اقبال کی آواز گونجی۔ حکومت نے دلی میں اردو مجلس اور اردو سروس قائم کیے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان کے قیام کا کیا مقصد تھا لیکن ایک مثبت تبدیلی کے اشارے ملنے لگے اور دونوں اسٹیشنوں سے اردو کے پروگرام نشر کیے جانے لگے اور اقبال کی آہستہ آہستہ اس میں شمولیت ہونے لگی۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس کے Fixed Point Chart شیڈول اور روزانہ کی کیو شیٹ میں اس کے ہلکے ہلکے اشارے ملتے ہیں۔ آزادی کے 30 برس بعد برصغیر کی فضاؤں میں ایک بار پھر اقبال کا نغمہ گونجا۔ مشہور زمانہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نے 21 اپریل 1976ء کو شمیم حنفی کا تحریر کردہ فیچر ''کارِ جہاں دراز ہے'' نشر کیا جس میں اس زمانے کے ریڈیو کی اہم آوازوں نے حصہ لیا۔ تین راوی اور ایک روایہ کے ذریعہ اقبال کے خیالات اور فکر کا جائزہ لیا گیا۔ اس فیچر کی موسیقی حفیظ احمد خاں نے ترتیب دی تھی۔ اس فیچر میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی تفہیم پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور کہیں ڈرامائی کہیں نیم ڈرامائی انداز کے مکالموں اور موسیقی سے اس کی وضاحت کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس

کے چند ابتدائی مکالمے سنیے:

راوی (ڈرامائی لہجے میں) کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر، کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر، کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر (یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی جاتی ہے اور پس منظر سے آواز آتی ہے) جانے والا واپس نہیں آئے گا۔ کتنی طویل منزلوں کا سفر اسے تمام کرنا ہے۔ یہ سفر اس کے وجود کا حاصل بھی ہے۔ اس کی پہچان اور اس کا مقدر بھی۔ وہ چلتا رہے گا چلتا رہے گا۔ چلتا رہے گا۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

اس انتظار کی کیا حد ہوگی کون بتائے گا۔ ایک منزل کے بعد دوسری منزل۔ ایک راستے سے نمودار ہوتا ہوا دوسرا راستہ اور وہ یوں ہی چلتا جائے گا اور اب تک کی جولان گاہ پھیلی ہوئی ہے۔"

(بحوالہ کارِ جہاں دراز ہے شمیم حنفی بنثریہ اردو سروس)

فلسفہ خودی کا ذکر کرتے ہوئے فیچر میں شمیم حنفی نے ایک راوی کی مدد سے اس کی تفہیم کی کوشش کی ہے:

"تو نے رات بنائی میں نے چراغ بنائے، تو نے مٹی بنائی میں نے اسے پیالوں میں ڈھال دیا، تو نے بیاباں اور کھیت بنائے اور چٹانیں بنائیں، میں نے خیاباں، گل زار اور باغ بنائے۔ اس کی خودی نے ساری کائنات کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ خودی نے ہی اسے بڑھنے اور پنپنے کی توفیق بخشی۔ اس کی وجود کی حرکت اس کا عمل، اس کی خودی کا اظہار ہے۔ یہی تصور اقبال کی تصورِ حیات کی اساس ہے۔"

(بحوالہ "کارِ جہاں دراز ہے" شمیم حنفی بنثریہ اردو سروس)

اس طرح تیس منٹ کے اس فیچر میں اقبال کے تصورِ مردِ مومن کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال کا مردِ مومن اپنا راستہ جانتا ہے۔ اس کا ہر قدم تعمیر اور ترقی خیر اور نیکی کی راہ میں اٹھتا ہے۔ اس کا سفر یہی اس کی منزل ہے۔ یہ سفر جاری رہے گا خیر اور نیکی کا۔ یہ نور بھی وقت کے افق کو یوں ہی روشن کرتا رہے گا۔

سنتوور 20 سکنڈ

یہ سفر ختم نہ ہوگا۔ اقبال نے جس آدم کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ وہ ایک نیا آدم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے اور تعمیر کا ہر لمحہ اس کی تکمیل کی طرف ایک قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی دمادم صدائے کن فیکون

وہ صدائے کن فیکون ابھی ختم نہیں ہوئی اور کبھی نہ ختم ہوگی کیوں کہ جیسے جیسے اقبال کا مرد مومن اپنے آپ کو پہچانتا جائے گا۔ اپنی خودی کا اظہار کرتا جائے گا۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا کبھی نہیں ....."

(اردو سروس کی ایک نشریہ)

یوں شمیم حنفی نے اس فیچر میں خودی، مردِ مومن اور عظمت آدم سے متعلق اقبال کے تصورات اور افکار سے سامعین کو مؤثر انداز میں واقف کرایا۔

اس نشریے کے ایک برس بعد پورے ہندوستان اور پاکستان میں اقبال کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ اس وقت اقبال سے متعلق ہندوستان میں مطلع اتنا صاف ہو چکا تھا کہ حکومت نے بھی جشن اقبال منانے کا فیصلہ کیا اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اقبال پر پروگرام نشر کیے گئے۔ اس موقع پر رسالہ آواز نے آل انڈیا ریڈیو کی نشریوں پر مبنی اقبال نمبر دسمبر 1977ء میں شائع کیا جس میں اردو کے سرکردہ ادیبوں کے اقبال سے متعلق 12 ریڈیو ٹاکس شامل ہیں لیکن کسی بھی فیچر، ڈرامے اور مباحثے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں پہلی ریڈیو ٹاک آل احمد سرور کی ہے۔ "اقبال کے استعارے" کے

عنوان سے سرور صاحب کی یہ ٹاک 15 نومبر 1977ء کی صبح 8 بج کر 45 منٹ پر نشر ہوئی۔ دس منٹ کی اس ٹاک میں آل احمد سرور نے اقبال کی شاعری میں استعمال کیے گئے استعاروں کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''بانگ درا کی پہلی نظم ہمالہ سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے فن میں تشبیہ و استعارے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آگے چل کر اسی سے رمز و ایما اور علامت کے استعمال کے لیے زمین ہموار ہوتی ہے۔ بانگ درا میں تشبیہات و استعارات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' میں رمز و علامات ہیں۔ ''بانگ درا'' کے پہلے دور کی نظم ہے۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہیں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہے
ہے دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کر دیکھتا ہے۔''

(اردو سروس کی ایک نشریہ)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

''اقبال کی تشبیہ میں جو رندی ملتی ہے وہ فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ہے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

اسی کو ترقی دے کر انہوں نے خضر راہ میں پیکر جہاں پیما خضر کی شخصیت ایک مصرع میں بیان کر دی ہے جو شعر نہیں اعجاز ہے:

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

اس پوری ریڈیو ٹاک میں آل احمد سرور نے اقبال کی نظمیں ''بزم انجم''، ''والدہ مرحومہ کی یاد میں''، ''مسجد قرطبہ''، ''بال جبریل'' اور ''ساقی نامہ'' کی نظموں کے حوالے سے تشبیہات کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ اقبال نے اس سے اپنی شاعری کو کیسے مزین

کیا ہے اور کیا معنی و مفاہیم دیے ہیں اس پر بھی عملی بحث کی ہے۔''

(اردو مرثیوں کی ایک تشریح)

اسی دور میں اردو کے نامور محقق پروفیسر تنویر احمد علوی نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو مجلس سے ایک تقریر بعنوان ''نیا شوالہ اقبال کی ایک نظم'' پڑھی۔ دس منٹ کی اس ریڈیو ٹاک میں انھوں نے ہندوستان کی عظیم تر مذہبی روایات اور رزمیہ ادب سے متعلق ہندوستانی برہمنوں کے رول کا ذکر کیا ہے اور بتایا کہ حسبا اور نسبا اقبال ایک کشمیری برہمن تھے اور انھیں اس پر ناز تھا:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز ست

(بحوالہ ''نیا شوالہ اقبال کی ایک نظم'' ''آواز'' یکم ستمبر 1977ء ص 4)

دوسرے حصے میں انھوں نے اقبال کی وطن کے ذرے ذرے سے محبت کو آشکار کیا ہے اور بتایا کہ کس طرح وہ ''نیا شوالہ'' کے ذریعہ ایک پر امن معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ پروفیسر تنویر احمد علوی نے مزید لکھا ہے کہ:

''اقبال ایک شاعر ہی نہیں تھے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے ایک بالغ نظر نقاد بھی تھے۔ وہ نئے ہندوستان کو ایک مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کا ایک ایسا تصور دینا چاہتے تھے جو قوس قزح کے آفاقی دائرے کی طرح رنگا رنگ اور ہمہ گیر ہو اور جس میں قومی اشتراک اور ہم آہنگی کے ان فطری اصولوں کو باقی رکھا جائے کہ مختلف تہذیبی وحدتیں اور ان سے وابستہ قوم اپنے ذہن اور ضمیر کی آزادی کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک بڑے تہذیبی نقشے اور تمدنی حلقے میں سمٹ آئیں اور روایتی سطح پر مذہب و ملت کا فرق اس بڑے مقصد کی راہ میں حائل نہ ہو۔ نیا شوالہ اپنے مقصد نظر کے اعتبار سے اقبال کے ان ہی افکار کا ایک خوب صورت عکس پیش کرتا ہے۔''

(بحوالہ ''نیا شوالہ اقبال کی ایک نظم'' ''آواز'' یکم ستمبر 1977ء ص 4)

پوری ریڈیو ٹاک ہندوستان میں عدل، مساوات اور بھائی چارے کی تحریکات کے حوالے سے پر ہے اور پوری نظم کو خالص ہندوستانی مذاہب کی فکر کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ٹاک کا اختتامیہ ملاحظہ کریں:

''عہد وسطیٰ میں جس تحریک نے اخلاقی اور تہذیبی طور پر ہی تحریکات عمل سے آشنا کیا اسے بھگتی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے زاویے کئی اعتبار سے قدیم ہندومت کی سادگی، بودھ دھرم کی دوستی اور اسلام کے قانون عدل و مساوات سے مل جاتے ہیں۔ اقبال نے برصغیر میں تہذیبی اتحاد اور ذہنی اشتراک کی تحریک کو تاریخ کے اس پس منظر میں دیکھا ہے اور اس کے پیغام اتحاد سمی اشتراک کو نئے ہندوستان کی تقدیر کہا ہے:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
بھارت کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے''

اس طرح ریڈیائی تحریروں میں اقبال کے فکر کی عکاسی کی جاتی رہی اور نہ صرف عکاسی کی گئی بلکہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کی ایک نشریہ میں ہندوستانی مفکر اربندو گھوش اور اقبال کے خیالات کا موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ گزشتہ پچاس سالہ اردو نشریات کی تاریخ میں اقبال اور اربندو پر یہ پہلی ریڈیو ٹاک ہے جہاں دونوں مفکرین کے مشترکہ ذہنی رویے اور افکار کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر نے اسے تحریر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اقبال اور اربندو دونوں کے سامنے مغرب کا چیلنج تھا۔ دونوں کا مقصد اس چیلنج کا ذہنی سطح پر اس طرح سامنا کرنا تھا کہ ان کے ذہنی رویے سے انفرادی اور اجتماعی عمل کا لائحہ مرتب ہو سکے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اربندو نے تکمیل یوگا کا نظام مرتب کیا..... اربندو اور اقبال دونوں سائنسی انکشافات کی روشنی میں حرکی تحریکات کا تصور پیش کرتے ہیں۔ دونوں کا فکری رویہ ارتقائی ہے۔ مگر میکانیکی نہیں تخلیقی دونوں ارتقا کے اس عمل میں نفس مطلق کی کارفرمائی دیکھتے ہیں جو تخلیقی حرکی اور مقصدی قوت ہے۔ دونوں انفرادی انا کے

استحکام اور بقا کو انسان کی روحانی نشو ونما کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ار بندو کہتے ہیں کہ
جب قطرہ سمندر میں شامل ہوتا ہے تو فنا نہیں ہوتا بلکہ سمندر اس میں خود داخل ہو جاتا ہے۔
اقبال بھی استحکام خودی کی تائید میں نفی خودی کے بجائے ثبات خودی پر زور دیتے ہیں۔
دونوں میں فرق یہ ہے کہ آر بندو کا مقصد سراسر روحانی ہے جب کہ اقبال اسلامی آئیڈیل
کے مطابق روحانی اور مادی مقاصد کو ایک دوسرے کا لازمہ سمجھتے ہیں۔"

(بحوالہ "اقبال اور ار بندو" وحید اختر "آواز" دسمبر 1977ء ص 5-6)

مذکورہ ریڈیو ٹاکس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس، آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو مجلس، لکھنؤ، جالندھر اور سرینگر کے اسٹیشنوں سے اقبال پر ریڈیو ٹاکس اور فیچروں کا سلسلہ جاری ہے لیکن تمام اسٹیشنوں سے تفصیلات کا حاصل کرنا مشکل ہے۔ 1987ء میں رسالہ آواز بند ہونے کی وجہ سے نشریات کی ادبی سرگرمیوں سے متعلق جانکاری حاصل کرنا مشکل امر ہو گیا اور یہ بھی ممکن نہیں کہ تمام اردو نشریات کو مونیٹر کیا جائے۔ تاہم جہاں تک ذاتی کاوشوں، رسالہ "آواز" اور دوسرے رسالوں کی ورق گردانی سے جو تفصیلات ملی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال پر ٹاکس اور فیچر براڈ کاسٹ کیے گئے ہیں لیکن اب تک اقبال پر کسی ریڈیو ڈرامہ کا سراغ نہیں ملا۔ اردو سروس جو کبھی برصغیر کی مایہ ناز نشریات سمجھی جاتی تھی وہاں بھی میں نے تقریباً 16 برس کی ملازمت کے دوران کبھی اقبال پر کسی ٹاک سیریز، روبرو کے تحت اقبال پر مباحثہ نہیں دیکھا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کافی غور وخوض کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اردو نشریات پر ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی بالادستی کی وجہ سے اقبال پر خاطر خواہ اور توجہ مرکوز پروگرام ریڈیو سے نشر نہیں کیے گئے۔

مزید برآں نقوش آگاہی کے تحت بال جبریل پر پروفیسر محمد ذاکر کی ٹاک، اقبال کا شعری آہنگ، فکر اقبال میں عظمت ہند، اقبال پیش رو غالب، اقبال کا شعری آہنگ، اقبال اور عظمت آدم، اقبال کے فکر وشعر کا ارتباط، اقبال کی فکری سرگزشت کا تیسرا دور

اور شارحین اقبال جیسے موضوعات پر پروفیسر عبدالحق کی تحریریں اپنی مخصوص انفرادیت رکھتی ہیں۔ وہ اقبالیات کے موضوع پر اب تک 12 ریڈیو ٹاکس نشر کر چکے ہے۔ اقبال کے کلام میں نئی تہذیب کی عورت کا تصور: صبا شمیم، اقبال اور فلاحی معاشرے کا تصور: پروفیسر منیر عالم وغیرہ کی ریڈیو ٹاک اقبال کی شاعری میں مختلف فکری آہنگ کو سامعین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے عنوان سے مولوی فیاض الدین بہزاد دکن نظامی نے حیدرآباد سے یہ ٹاک پڑھی جس میں دونوں شخصیات کے فکری اختلافات اور رواداری کو دکھایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر سے شیخ عبداللہ نے اقبال پر ایک ٹاک پڑھی تھی جس کی ریکارڈنگ وہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بشیر احمد نحوی کا تحریر کردہ ٹاک اقبال کی شاعری میں خاندانِ نبوت کا ذکر بھی اہم ہے۔ مرزا ادیب اردو کے اہم ادیب تھے اور ریڈیو پاکستان سے دس برس تک وابستہ رہے۔ انھوں نے ملازمت کے دوران تاریخی موضوعات کو ریڈیو ڈرامے کا موضوع بنایا۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''شیشہ و سنگ'' میں اقبال کی نظموں، ذوق و شوق، مسجد قرطبہ اور ماں کے خواب پر مبنی ڈرامے شامل ہے۔

آج پورے ہندوستان میں کمیونٹی ریڈیو کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جن میں چند ریڈیو اسٹیشن ایسے ہیں جہاں سے اردو زبان و ادب پر بھی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ریڈیو جامعہ ایف ایم 90.4 ہے۔ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اپنا ریڈیو چینل ہے جہاں سے مختلف نوع کے ادبی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ان پروگرموں میں اقبال کی شمولیت بھی ہے کیوں کہ خطۂ اہداف میں سامعین اقبال کو پسند کرتے ہیں۔ یوم اقبال کے موقع پر ریڈیو جامعہ سے ایک مباحثہ ''فکر اقبال اور عالمی امن'' کے موضوع پر نشر کیا گیا جس میں پروفیسر عبدالحق، پرفیسر توقیر احمد خاں اور ذاکر حسین نے شرکت کی۔ ان تینوں شخصیات نے اقبال کے کلام میں امن عالم کی تلاش کی اور مدلل گفتگو کی جسے سامعین

نے بہت پسند کیا اور تادم تحریر دس بار مکرر نشر ہو چکی ہے۔

ریڈیو پاکستان سے اقبالیات سے متعلق نشریوں کی تفصیلات سر دست دستیاب نہیں ہو سکیں۔ ریڈیو پاکستان ہر برس یوم وفات اقبال کے موقع پر مزار اقبال سے راست نشریوں کا اہتمام کرتی ہے۔ آزادی کے بعد ذوالفقار بخاری ریڈیو پاکستان کے سربراہ مقرر ہوئے اور ''سرگزشت'' میں ریڈیو پاکستان کے اقبالیات کے پروگرام پر ماتم بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اب کس سے گلہ کیا جائے کہ اقبال کی قبر کے مجاوروں نے ریڈیو پاکستان کے پروگراموں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید ان کے ذہن میں اقبال کو عوام تک پہنچانے کی کوئی اور ترکیب ہو لیکن آج تک وہ اس ترکیب پر عمل نہ کرنے کے سبب بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کا بس چلے تو شہر شہر منادی کرا دیں کہ اگر کوئی شخص بلبلِ شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اقبال کا کلام گائے گا تو اسے سرمہ کھلایا جائے گا۔''

(بحوالہ ''سرگزشت'' ص 205-204)

اس تحقیقی مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اقبال کے تئیں ریڈیو میں ایک غیر سنجیدہ رویہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔

❖❖❖

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام (ملتان، پاکستان)

علامہ اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کی مراسلت

('اقبال بنام شاد' کے تناظر میں)

ارسطو نے انسان کو معاشرتی حیوان کہا ہے۔ اس کے نزدیک تنہائی میں زندگی گزارنے والا جانور ہوسکتا ہے یا دیوتا۔ بعض اوقات انسان اپنے کسی شدید جذبے کے زیرِ اثر اپنے گرد تنہائی کا ایک ایسا ہالہ بن لیتا ہے جس میں نہ تو کسی اور کو داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے اور نہ خود اس سے باہر نکلنے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنے گرد کھینچے ہوئے حصار میں ہی زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن یہ اس کی فطرت نہیں بلکہ خود اختیاری امر ہے۔ انسان معاشرے میں رہنا چاہتا ہے اور میل جول اس کی فطرت ثانیہ ہے۔

انسان کی فطرت کے کئی پہلو ہیں ان میں سے ایک پہلو مکتوب نگاری بھی ہے۔ خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ اس ملاقات کی روایت صدیوں پر محیط ہے۔ ہزاروں سالوں سے انسان اپنے خیالات اور جذبات کی ترسیل کے لیے مختلف طریقے استعمال

کرتا رہا ہے۔ مختلف فنون کی ایجادات کا باعث بھی انسان کا یہی جذبہ بنا ہے۔ مکتوب نگاری کی ایجاد بھی اسی جذبے کی مرہون منت ہوئی۔ خطوط سے ایک انسان کے دوسرے انسان سے باہمی روابط اور تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ خطوط سے انسان کے مزاج، عادات، خیالات، نظریات، اور افکار کا پتا ہی نہیں چلتا بلکہ اس کے ذریعے انسان کی ذہنی حالت اور تبدیل ہوتی ہوئی ذہنی صورت حال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

خطوط بالعموم ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر خط اہمیت کا حامل نہیں ہوتا لیکن جو شخصیات علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی حوالے سے اہمیت حاصل کر لیتی ہیں ان کے خطوط انھی حوالوں سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط کے ذریعے ان کے خیالات، جذبات، افکار اور ذہنی تغیرات کا پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے عہد کی ادبی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی صورت حال کو سمجھنے اور پرکھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

غالب، رجب علی بیگ سرور، واجد علی شاہ اختر، غلام غوث بے خبر، سرسید، حالی، شبلی، آزاد، امیر مینائی، داغ دہلوی، شاد عظیم آبادی، عبدالحق، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سید سلیمان ندوی، جوش ملیح آبادی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، فیض احمد فیض اور ن۔م۔ راشد کے علاوہ بیسیوں ادیبوں کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں ایک اہم نام اقبال کا بھی ہے۔ اقبال نے اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب، مداحوں، دانش وروں، علما اور ادبا کو سینکڑوں کی تعداد میں خطوط لکھے۔ اقبال کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں ایک مجموعہ ''اقبال بنام شاد'' بھی ہے۔

اقبال کی زندگی میں ان کے بہت سے معاصرین نے ان کے خطوط جمع کرنے شروع کر دیے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ خطوط کی اشاعت کے خواہش مند تھے۔ خان محمد نیاز الدین نے اس خواہش کا اظہار کیا تو اقبال نے اسے پسند نہیں کیا۔ اقبال کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنے خطوط بے تکلفانہ تحریر کیے ہیں۔ اس لیے ان کی اشاعت بہتر نہ ہوگی اگر انھیں شائع کرنا بھی ہو تو اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔[1] اقبال کی زندگی میں

ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا البتہ ان کے انتقال کے چند سال بعد ہی سید محی الدین قادری زور نے ''شاد اقبال'' کے نام سے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے خطوط کو شائع کر دیا۔[2] اس مجموعے میں اقبال کے 49 اور شاد کے 52 خطوط شامل تھے۔ خطوط سے پہلے تیس صفحات کا ایک بھرپور مقدمہ ہے جس میں اقبال اور شاد کی ملاقاتوں اور تعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ زور نے اقبال اور شاد کے خطوط کو تاریخی ترتیب سے درج کیا ہے۔ پہلے اقبال اور پھر شاد کا خط درج کیا ہے۔ خطوط کے اندراج کے اس طریقے سے اقبال کے ذہنی رویوں اور خیالات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ (اس سے قبل یہ مضمون 1940ء میں مجلہ عثمانیہ کے مہاراجہ نمبر ''اقبال اور شاد کی مراسلت'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔) یہ کتاب 40+176=216 صفحات پر مشتمل ہے۔ زور نے مقدمے کے بعد شاد اور اقبال کی تصاویر اور دونوں کے ایک ایک خط کا عکسی نمونہ بھی درج کیا ہے۔ اس کے بعد خطوط کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ 1916ء، دوسرا 1917ء، تیسرا 1918ء، چوتھا 1919ء، پانچواں 1922ء، چھٹا 1923ء اور ساتواں 1924-27ء میں لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ زور نے یہ خطوط مہاراجہ کشن پرشاد کی وفات سے دو تین سال قبل اشاعت کی غرض سے حاصل کر لیے تھے۔[3] خطوط کا یہ مجموعہ سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو شمارہ-86 کے طور پر شائع ہوا۔ اس مجموعہ مکاتیب کو اقبال کے خطوط کے حوالے سے اولیت کا اعزاز حاصل ہے۔ ''شاد اقبال'' کی اشاعت کے بعد یکے بعد دیگرے اقبال کے مکاتیب کے مجموعے شائع ہونے شروع ہو گئے۔ ان مجموعوں میں ''اقبال کے خطوط جناح کے نام'' 1942ء، ''اقبال نامہ'' جلد اول 1945ء، جلد دوم 1951ء، ''مکاتیب اقبال بنام محمد نیاز الدین خان مرحوم'' 1954ء، ''اقبال'' 1956ء، ''مکتوباتِ اقبال بنام نذیر نیازی'' 1957ء، ''انوارِ اقبال'' 1967ء، '' Letters and writings of Iqbal'' 1967ء، ''مکاتیب اقبال بنام گرامی'' 1969ء اہمیت کے حامل ہیں۔ اقبال کے تمام مکاتیب کو مظفر حسین برنی نے اکٹھا کر کے ''کلیاتِ مکاتیب اقبال''

کے نام سے شائع کر دیا۔ پہلی جلد میں 1918ء تک، دوسری جلد میں 1928ء تک، تیسری جلد میں 1934ء تک، چوتھی جلد میں 1938ء تک اور پانچویں جلد میں انگریزی خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔[4]

سید محی الدین قادری زور کے مرتبہ مجموعہ مکاتیب ''شاد اقبال'' میں شامل خطوط کو شیخ عبداللہ نے ''اقبال نامہ حصہ دوم'' میں شامل کیا۔[5] جون 1986ء میں محمد عبداللہ قریشی نے اقبال اور شاد کے تمام دستیاب خطوط اکٹھے کر کے سنین وار ''اقبال بنام شاد'' کے نام سے شائع کر دیے۔ اس مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت تحریر ہے ''اقبال بنام شاد اس مجموعے میں 'شاد-اقبال' والی مراسلت بھی شامل ہے۔'' یہ کتاب پہلی بار بزم اقبال لاہور سے جون 1986ء میں 1100 کی تعداد میں شائع ہوئی۔ آغاز میں محمد عبداللہ قریشی نے 58 صفحات کا ضخیم مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں شاد کے حالاتِ زندگی، علمی و ادبی مشاغل، شاد اور اقبال کے تعلقات اور اقبال کے حیدرآباد سے تعلق پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے خطوط سنین وار درج کیے ہیں۔ ہر خط کے بعد وضاحت طلب مقامات کے حواشی و تعلیقات درج کیے ہیں۔ اس مجموعہ میں اقبال کے 99 خطوط اور شاد کے 54 خطوط شامل ہیں۔ شاد کے خطوط میں تعلیقات درج نہیں البتہ حاشیے میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ شاد کے خط کے جواب میں اقبال نے کون سا خط تحریر کیا۔ اس طرح شاد اور اقبال دونوں کے خطوط کو ایک ساتھ مطالعہ کرنے سے بہت سے وضاحت طلب نکات کی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان خطوط کی ترتیب اقبال کے خطوط کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ اس لیے شاد کے بعض خطوط کے سنین کی تقدیم و تاخیر میں فرق آ گیا ہے۔

اس سے قبل محمد عبداللہ قریشی ''صحیفہ'' کے ''اقبال نمبر'' حصہ اول شمارہ 65، اکتوبر 1973ء میں زور کے مرتبہ خطوط کو ''نوادرِ اقبال (اقبال کے پچاس غیر مطبوعہ خطوط)'' کے عنوان سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر چکے تھے۔ عبداللہ قریشی کے قائم کردہ عنوان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا ان خطوط کی دریافت کا سہرا محمد عبداللہ قریشی کے سر

بندھتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خطوط 33 سال پیش تر سید محی الدین قادری زور شائع کر چکے تھے۔ عبداللہ قریشی کے تحریر کردہ مقدمے کا آغاز بھی اس جملے سے ہوتا ہے:

> ''اقبال کے غیر مطبوعہ خط پیش کرنے سے پہلے مکتوب الیہ کے بارے میں بتانا ضروری ہے کہ یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد کو دکن تو جانتا ہی تھا، برطانوی ہند میں بھی ان کی شہرت کچھ کم نہ تھی۔''[6]

مذکورہ بالا عنوان اور سطور میں بھی حقائق سے پردہ پوشی کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے خطوط پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔ حالاں کہ اس مضمون سے کہیں پہلے سید محی الدین قادری زور ''شاد اقبال'' کے نام سے ان خطوط کو شائع کر چکے تھے۔ اگرچہ محمد عبداللہ قریشی نے اس مضمون کے آخری صفحات میں نشان دہی کی ہے کہ ''علامہ اقبال اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کی مراسلت 1942ء میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے ''شاد اقبال'' نے نام سے شائع کی تھی۔ اس مجموعے میں اقبال کے 49 خطوط اور شاد کے 52 خطوط شامل تھے۔[7] لیکن مضمون کے عنوان اور ابتدائی سطور میں وہ اس حقیقت پر لاعلمی کا پردہ ڈال گئے۔ انھوں نے آخری صفحات میں نشان دہی تو کی لیکن ابہام پھر بھی برقرار رکھا۔ انھیں چاہیے تھا کہ واضح اور دوٹوک انداز میں وہ یہ بتاتے کہ یہ وہی خطوط ہیں جنھیں زور پہلے شائع کر چکے ہیں۔ عبداللہ قریشی کو یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ انھوں نے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت لی بھی ہے یا نہیں۔ مزید یہ کہ انھیں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانا چاہیے تھا کہ انھوں نے صرف مقدمہ تحریر کیا ہے اور خطوط میں موجود وضاحت طلب مقامات کے اندھیروں کو تعلیقات کی روشنی سے منور کرنے کی کوشش کی ہے۔ فقط یہی ان کا حصہ ہے۔ انھی خطوط کو محمد عبداللہ قریشی نے اقبال اور شاد کے مزید حاصل شدہ خطوط کے ساتھ ''اقبال بنام شاد'' میں شائع کر دیا۔ اس کتاب کے سرورق پر صرف یہ تحریر کیا کہ اس میں ''شاد اقبال والی مراسلت بھی شامل ہے''۔ سرورق کے عنوان سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ''شاد اقبال'' کی مراسلت سے کیا

مراد ہے۔ محمد عبداللہ قریشی نے صحیفہ میں شامل مضمون میں صرف اقبال کے خطوط شائع کیے تھے اور اس کتاب (اقبال بنام شاد) میں اقبال اور شاد کے وہ تمام خطوط بھی شامل کر دیے جو محی الدین قادری زور کی مرتبہ ''شاد اقبال'' میں شامل تھے۔ بغیر اجازت کسی دوسرے کے مال پر ہاتھ صاف کرنا تحقیقی بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کو چاہیے تھا کہ وہ واضح اور دوٹوک انداز میں نشان دہی کرتے کہ محی الدین قادری زور کے مرتبہ خطوط کو اقبال کے خطوط کی اشاعت کے حوالے سے اولیت حاصل ہے۔ محی الدین قادری زور نے ''شاد اقبال'' میں اقبال کے جو خطوط درج کیے ہیں، ان کے علاوہ خطوط کا حصول اور ان کی اشاعت محمد عبداللہ قریشی کا کارنامہ ہے۔ زور نے ''شاد اقبال'' شائع کرنے سے پیشتر کافی کوشش کی تھی کہ اقبال کے بقیہ خطوط بھی دستیاب ہو جائیں لیکن انھیں ناکامی ہوئی۔ شاد کے نام ہزاروں خطوط میں سے باقی خطوط کو تلاش کرنا کافی وقت طلب کام تھا۔ اس جوئے شیر کو کھودنے کا کام عبداللہ قریشی نے کیا۔ اس کے باوجود اقبال کے خطوط کی پہلی اشاعت زور کے ہاتھوں ہوئی۔ محمد عبداللہ قریشی کو عطاء اللہ مرتب 'اقبال نامہ' کی تقلید کرتے ہوئے ان خطوط کی اشاعت کی زور سے اجازت بھی لینی چاہیے تھی۔ شیخ عطاء اللہ نے ''اقبال نامہ'' حصہ دوم شائع کیا تو اس میں شاد کے نام اقبال کے خطوط بھی شائع کیے لیکن اس سے پیش تر انھوں نے یہ عبارت نقل کی ہے:

> ''اقبال کے خطوط کے اولین مجموعہ کی اشاعت کا شرف و فخر جناب محی الدین صاحب قادری پروفیسر ادب اردو جامعہ عثمانیہ کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ انھوں نے 'اقبال نامہ' یعنی پیش نظر مجموعہ کی جلد اول کی اشاعت سے قبل 'شاد اقبال' کے نام سے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد (حیدرآباد) کی باہمی خط و کتابت جو متعدد اعتبارات سے اہم ہے، شائع کر دی ہے۔ میں جملہ عقیدت مندان اقبال کی طرف سے ان کی خدمت میں دلی تشکر کا ہدیہ پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے 'شاد اقبال' کے اس انتخاب کی 'اقبال نامہ

حصہ دوم میں شمولیت کی بخوشی اجازت مرحمت فرمائی۔ قارئین کرام اور دوست داران اقبال 'شاد اقبال' کے مطالعہ سے اقبال سے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں۔"[8]

اگرچہ عبداللہ قریشی نے ان خطوط کو احتیاط سے نقل کیا ہے لیکن بعض مقامات پر پروف کی اغلاط راہ پا گئی ہیں۔ تین مقامات پر ان سے اقبال کے خطوط کی تاریخوں کے درج کرنے میں بھی تسامح ہوا ہے جس سے محققین اقبال کو بعض نتائج اخذ کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اقبال پر درج غلط سنین کی وجہ سے محققین اقبال کو بعض نتائج کے استخراج میں دھوکہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عبداللہ قریشی نے ایک خط کی تاریخ یکم اکتوبر 1914ء درج کی ہے۔ جب کہ یہی خط 'شاد اقبال' ص 3 پر یکم نومبر 1916ء کے تحت درج ہوا ہے۔ درست تاریخ بھی 'شاد اقبال' میں درج تاریخ ہی ہے کیوں کہ عبداللہ قریشی کے مذکورہ خط سے پہلے 2 ستمبر 1916ء کا اور مذکورہ بالا خط کے بعد 31 اکتوبر 1916ء کا خط درج ہوا ہے۔ 1916ء کے سال کے خطوط میں 1914ء کا خط درج نہیں ہو سکتا۔ اس لیے عبداللہ قریشی کی درج تاریخ درست نہیں۔ اسی طرح ص 202 پر ایک خط کی تاریخ 22 فروری 1917ء درج ہے جب کہ زور نے 'شاد اقبال' ص 29 پر اسی خط کی تاریخ 23 فروری 1917ء درج کی ہے۔ 'اقبال بنام شاد' ص 239 پر ایک خط کی تاریخ 29 دسمبر 1917ء درج ہوئی ہے جب کہ 'شاد اقبال' ص 69 پر اسی خط کی تاریخ 19 دسمبر 2017ء درج ہے۔ ان اغلاط سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خطوط کو مرتب کرتے ہوئے زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ عبداللہ قریشی نے کسی مقام پر یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے 'شاد اقبال' والی مراسلت کو اصل خطوط سے نقل کیا ہے یا 'شاد اقبال' سے۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ انھوں نے اصل خطوط نہیں دیکھے بلکہ 'شاد اقبال' سے خطوط نقل کیے ہیں اور خطوط نقل کرنے میں تسامحات سے دامن نہ بچا سکے۔ ''اقبال بنام شاد'' کے متن کا ''شاد اقبال'' کے متن سے موازنہ کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر کتاب میں بعض متنی اغلاط بھی راہ پا گئی ہیں۔ اسی طرح جب ''اقبال بنام شاد''

کا موازنہ شیخ عطاء اللہ کے ''اقبال نامہ'' میں موجود اقبال کے خطوط سے کیا گیا تو ان میں متنی اغلاط مذکورہ تصنیف سے زیادہ نظر آئیں۔ ''اقبال نامہ'' کا اولین ایڈیشن پیشِ نظر نہیں اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اغلاط اقبال اکیڈمی کی مرتبہ ''اقبال نامہ'' میں راہ پا گئی ہیں کہ اس کے نقل کرنے میں شیخ عطاء اللہ سے تسامح ہوا۔

دکن کئی سو سال تک علم، ادب اور تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ دکن کی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں سلاطینِ بہمنیہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے پونے دو سو سال (1350ء-1525ء) حکومت کی۔ بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جس میں گول کنڈہ اور بیجاپور وہ سلطنتیں تھیں جنھوں نے اردو زبان، ادب، مذہب اور تاریخ کے حوالے سے گراں قدر کارنامے سرانجام دیے۔ گول کنڈہ کے سلاطین قطب شاہی اور بیجاپور کے سلاطین عادل شاہ کہلاتے تھے۔ قطب شاہ اور عادل شاہ شعر و ادب سے دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے دکن کو فتح کر کے اپنی قلم رو میں شامل کر لیا لیکن جیسے ہی عالم گیر کا انتقال ہوا تو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح دکن نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حیدرآباد مشرقی تہذیب و اقدار کا سب سے بڑا مرکز بن کر ابھرا۔ وہاں کے لوگوں کا طرزِ معاشرت ہی مشرقی نہ تھا بلکہ ان کا اندازِ فکر اور فلسفۂ زیست بھی مشرقی تھا۔[9] بیسویں صدی میں حیدرآباد دوسری ریاستوں کی مانند قرونِ وسطیٰ کے عہد زریں کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ برطانوی ہند میں جو سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکیں اٹھتی تھیں ان کی گونج حیدرآباد میں بھی سنائی دیتی تھی۔[10] مملکت حیدرآباد پر خاندانِ آصفی کا پرچم 235 سال تک اپنی شان و شوکت سے لہراتا رہا۔ اس دوران دس حکمران تخت نشین ہوئے۔ دس کے دس نظام کہلائے مگر آصف کے خطاب سے صرف سات مخاطب ہوئے۔ آخری حکمران میر عثمان علی خان تھے۔ انھیں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے سلطان العلوم کا خطاب بھی دیا گیا۔ میر عثمان علی خان شاعر بھی تھے اور عثمان تخلص کرتے تھے۔ شاہانِ دکن کا طویل ترین دورِ حکومت نظامِ نہم میر محبوب علی خان کا

چھیالیس برس پر محیط تھا۔ انھیں نظام اول آصف جاہ اول کے بعد سب سے زیادہ احترام اور عقیدت سے یاد کیا جاتا تھا۔ آخری حکمران میر عثمان علی خان حیدرآباد کی علمی، ادبی، معاشرتی، معاشی، صنعتی اور زرعی زندگی میں انقلاب بھی لائے۔ تخت نشینی کے بعد نواب سالار جنگ کو مدارالمہام بنایا مگر پھر جلد ہی انھیں سبک دوش کر دیا۔ باب حکومت کے قیام کے بعد انتظامیہ کا سربراہ صدر اعظم کہلانے لگا۔ کئی شخصیتیں صدر اعظم ہوئیں۔ سرامام علی، سرفریدوں الملک، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، نواب آف چھتاری، سرمرزا اسماعیل اور میر لائق علی اس عہدے پر سرفراز رہے۔[11]

علامہ اقبال کو دکن سے بڑی الفت تھی۔ وہ حیدرآباد کو اسلامی ریاست تصور کرتے تھے اور نظام کی بھی عزت کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے دو مرتبہ حیدرآباد دکن کا سفر کیا تھا۔ پہلی بار مارچ 1910ء میں اور دوسری بار جنوری 1929ء میں۔ پہلے سفر کے وقت سر اکبر حیدری نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ اس سفر کی یادگار نظمیں 'شکریہ' اور 'گورستانِ شاہی' ہیں۔ دوسری مرتبہ انیس سال بعد 1929ء میں حیدرآباد گئے۔ اس مرتبہ اہلِ مدراس نے اسلامیات پر لیکچرز کے لیے انھیں مدعو کیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طلبا کی انجمنوں نے انھیں حیدرآباد آنے کی دعوت دی چنان چہ اقبال مدراس سے واپسی پر حیدرآباد گئے اور وہاں 15 تا 17 جنوری 1929ء کو فلسفۂ اسلام پر تین لیکچر دیے۔[12] اس موقع پر ان کی ملاقات نظام حیدرآباد سے بھی ہوئی۔ نظر حیدرآبادی نے اس موقع کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال نے نظام کی خدمت میں فارسی اشعار بھی سنائے تھے جو ان ہی کے لیے کہے گئے تھے۔[13] تحسین سروری نے نظر حیدرآبادی کے اس بیان کو درست قرار نہیں دیا۔[14] علامہ اقبال حیدرآباد کی خدمت کے لیے ہمیشہ آرزومند رہے لیکن انھیں کبھی اس کا موقع نہ ملا۔ کئی بار افواہیں اڑیں کہ اقبال حیدرآباد کے چیف جسٹس مقرر ہو گئے ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے ہیں لیکن یہ افواہیں کبھی حقیقت کا روپ نہ بن سکیں اور اقبال یہ حسرت دل میں لیے دنیا سے

کوچ کر گئے ۔ حیدر آباد کے لوگوں کو بھی علامہ اقبال کی ذات اور شاعری سے والہانہ محبت تھی ۔ بالِ جبریل کے جتنے نسخے وہاں فروخت ہوئے کسی شہر میں فروخت نہ ہوئے ہوں گے۔[16]

حیدر آباد میں اقبال کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کی تعداد کا تو اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیوں کہ ان کی تعداد ہزاروں میں تھی البتہ حیدر آباد کی مشہور اور معروف ہستیوں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد، سر اکبر حیدری، مولوی عبدالحق، مسز سروجنی نائیڈو، بہادر یار جنگ، ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ، نصیر الدین ہاشمی، مسز صغرا ہمایوں، پروفیسر الیاس برنی، تمکین کاظمی اور تصدق حسین تاج اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان سے اقبال کا تعلق رہا۔ ان کے نام اقبال کے خطوط بھی اقبال کے مکتوبات میں موجود ہیں ۔

مہاراجہ کشن پرشاد حیدر آباد کی مقبول ترین شخصیت تھے ۔ ہندوؤں میں ہندو، مسلمانوں میں مسلمان، شاعر، صوفی، سخی، ادب دوست، علم نواز، ملک و مالک کے وفادار اور مغل تہذیب کا آخری نمونہ۔ عوام میں سخی داتا اور بچوں والے داتا مشہور تھے۔[16] مہاراجہ کشن پرشاد آصف جاہی حکومت کے وزیر اعظم تھے ۔ وہ کم و بیش گیارہ سال حیدر آباد کی وزارت پر فائز رہے ۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر اور ممتاز نثر نگار بھی تھے ۔ شادؔ تخلص کرتے تھے ۔ انھوں نے چھوٹی بڑی کم و بیش 76 کتابیں تصنیف کیں ۔ ان کی اہم تصانیف میں 'لطائف بے نظیر'، 'باغ بہار عجیب'، 'سرمایۂ سعادت'، 'ارض الرمل'، 'فسانۂ شہدا'، 'بزم عشاق'، 'باغ شاد'، 'گلشن تاریخ'، 'روضہ شریف'، 'نذر شاد'، 'نسیم سحر'، 'صبح امید'، 'سیر پنجاب'، 'شکار شیر شاہی'، 'سپاس نامہ'، 'مطلع خورشید'، 'سفر دو ہفتہ'، 'ارمغان وزارت'، 'جام جہاں نما'، 'مخزن القوافی'، 'بیاض شاد'، 'مجموعہ مناجات'، 'مثنوی سرِ وجود'، 'مثنوی آئینۂ وحدت وجود'، 'مخزن القوافی'، 'رقعاتِ شاد'، 'ترانۂ شاد'، 'نسیم سحر'، 'شگوفۂ بہار'، 'باغ شاد'، 'نغمۂ شاد'، 'رباعیات شاد'، 'خدمات شاد'، 'نورِ چشم'، 'قومی لیڈر'، 'ماتم حسین' اور 'دینِ حسین' نمایاں اہمیت کی حامل ہیں ۔[17] ان کی سرپرستی میں 'تزک عثمانیہ'، 'دبدبۂ آصفی' اور 'محبوب الکلام' رسائل

بھی نکلتے تھے۔ دونوں رسائل مہاراجہ اپنے ذاتی خرچ سے نکالتے تھے۔ مزاج کے اعتبار سے وہ ایک صوفی تھے جو بیسیوں شعرا، ادبا، علما اور دانش وروں کے سرپرست بھی تھے۔ ان کی نشست گاہ معروف اور غیر معروف واعظوں، خطابوں، مصوروں، علم موسیقی کے ماہروں اور نجومیوں سے بھری رہتی تھی وہیں ہمیں اردو اور فارسی ادب کی بہت سی تاریخی شخصیتیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً اردو کے نثر نگاروں میں سرشار، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی، عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، پنڈت دتاتریہ کیفی، نیاز فتح پوری، فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار سے ذاتی مراسم تھے۔ اردو شاعروں میں داغ دہلوی، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، نظم طباطبائی، ظہیر دہلوی اور ماہر القادری وغیرہ کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں۔ تاہم اقبال سے شاد کے مراسم کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اقبال ان کے بعض اہم معاملات میں رازداں اور مشیر بھی ہیں اور ادب و شعر کے سلسلے میں رہنما اور استاد بھی۔[18]

مہاراجہ کشن پرشاد سے اقبال کی پہلی ملاقات مارچ 1910ء میں ہوئی۔[19] باہمی خطوط کا آغاز یکم اکتوبر 1913ء سے ہوتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد سے اقبال کا تقریباً دو دہائی سے زائد عرصے پر مشتمل خط و کتابت اور ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ آغاز میں تعلقات کی نوعیت خاص نہ تھی لیکن رفتہ رفتہ ان تعلقات میں رسوخ آتا گیا۔ دونوں کے تعلقات اور مراسم اتنے گہرے ہو گئے کہ زور کو لکھنا پڑا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی اور صداقت و محبت کا یہی جوش دونوں کے درمیان آخر تک رہا۔"[20] دونوں فریق ایک دوسرے کو باقاعدگی سے خطوط لکھتے رہے۔ ان کے یہ خطوط ایک طرف ادبی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں تو دوسری طرف ان خطوط سے اقبال اور شاد کے نجی معمولات اور معلومات کا پتا بھی چلتا ہے۔ ان خطوط میں اقبال ایک نیاز مند یا عقیدت مند کے طور پر ہی سامنے نہیں آتے بلکہ ایک دوست، استاد، شاعر، باپ، عاشق اور سیاسی فہم و فراست رکھنے والے شخص کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔

ان تمام حیثیتوں میں سب سے اہم حیثیت ایک ایسے انسان کی ہے جو دردمند اور حساس دل رکھتا ہے۔ وہ شاد کے ذاتی اور نجی معاملات میں شریک بھی ہے اور انھیں اپنے معاملات میں شریک کار کرنے میں بھی کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

جس طرح اقبال شاد کو اپنے نجی معاملات میں شریک کرتے ہیں اسی طرح شاد بھی اپنے خطوط میں اقبال سے اپنے نجی معاملات بے تکلف زیر بحث لاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حیدرآباد کی سیاست اور اس میں اپنی حیثیت بھی بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کی سادگی اور اقبال سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"اگرچہ میں جس قدر مختار رہوں اس سے زیادہ مجبور ہوں۔ جس قدر آزاد ہوں اس سے زیادہ پابند۔ جس قدر بلند ہوں اس سے زیادہ پست۔" (ص 294)

"ہائے افسوس! یہ وردی والے جو صبغۃ اللہ کہلاتے ہیں اپنے رنگ سے کیوں بے رنگ ہو جاتے ہیں۔" (ص 298)

"پیارے اقبال! جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ کہنا نہیں چاہتا اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا۔" (ص 382)

"پیارے اقبال! یہاں کی انقلابی رفتار اور تغیر پذیر طرز عمل امرا کو پامال کر رہی ہے۔ اس قدر گھبرا گیا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ بلدہ کو خیرباد کہہ کر سفر کروں مگر پابندیاں مانع ہیں۔" (ص 362)

مہاراجہ کشن پرشاد کے علامہ اقبال سے تعلقات کی نوعیت دوستانہ، مشفقانہ اور مربیانہ تھی۔ مہاراجہ کے نام خطوط میں اقبال ایک بشری صفات کے حامل شخص کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط کی بعض عبارتوں سے گمان گزرتا ہے کہ اقبال ان کے سامنے زانوئے طلب تہہ کیے رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں۔ وہ لوگ جو حیدرآباد کی تہذیبی زندگی اور ان کے مظاہر سے واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ اقبال کا رویہ عقیدت اور نیازمندی کا ہے، غلامی کا نہیں۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو مہاراجہ کے اقبال کے نام خطوط اس

کی تائید کرتے۔ مہاراجہ اقبال کو بھائی ذیر اقبال، پیارا اقبال، دوست اور بھیا کے ناموں سے یاد کرتے رہے اور خود کو فقیر شاد لکھتے رہے۔[21]

اقبال کی دلی خواہش تھی کہ ان کی ملازمت کا سلسلہ حیدرآباد میں ہو جائے۔ اس کے لیے ان کے رابطے حیدرآباد کی کئی شخصیات سے رہے۔ ان شخصیات میں شاد اور سر اکبر حیدری معروف نام ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ زور وہ مہاراجہ کشن پرشاد پر دیتے رہے۔ اقبال، شاد کے نام خطوط میں بار بار اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی حیدرآباد مستقل آمد کا کوئی وسیلہ بن جائے۔ اس کے لیے وہ بار بار شاد کو خطوط میں یاد دہانی کرواتے ہیں۔ ذیل کی چند عبارتیں ملاحظہ کیجیے:

"دل میں یہ ضرور ہے کہ اگر خدا کی نگاہِ انتخاب نے مجھے حیدرآباد کے لیے چنا ہے تو اتفاق سے یہ انتخاب میری مرضی کے بھی عین مطابق ہے۔ گویا بہ الفاظِ دیگر بندہ و آقا کی رضا اس معاملے میں کلی طور پر ایک ہے۔" (ص 223)

"میرا جذبِ دل تو بوڑھا ہو گیا ہے۔ آپ کا جذبہ تو بفضلہ ابھی جوان ہے اور ہمیشہ رہے گا پھر کیوں اقبال کو وہاں نہیں کھینچ لیا جاتا؟" (ص 241)

"میرے مقدر کے دانوں کی آپ کو تلاش ہے تو ممکن ہے مل جائیں اگرچہ بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سرکار مدارالمہام ہوتے تو اس قدر جستجو گوارا کرنے کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ اگر زمانے نے مجھے آپ کے آستانے پر لا ڈالا تو میری عین سعادت مندی ہے۔ اس وقت دوستانہ و نیازمندانہ مہر و وفا کا ثبوت دے سکوں گا۔ (ص 244)

"بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر کیا کروں آپ کو دکن نہیں چھوڑتا تو مجھے پنجاب کی زنجیر سے آزادی نہیں ملتی بہر حال جس حال میں ہوں خوش ہوں۔ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے نہیں مانگتا۔ وقت خود بخود مساعدت کرے گا اور مشیت تقدیر میں جو کچھ پوشیدہ ہے اسے آشکار کر دے گا۔ انتظار میں بھی ایک لطف ہے۔" (ص 148)

"دل تو ملاقات کے لیے تڑپتا ہے مگر حالات پر نہ شاد کو قدرت ہے نہ اقبال کو۔ امور کے

فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں۔ زمین پر محض ان کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ دیکھیں اس امر کے فیصلے کا اشتہار کب ہوتا ہے۔" (ص 248)

مندرجہ بالا اقتباسات میں موجود سطور سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اقبال بڑی شدت سے خواہش رکھتے تھے کہ حیدرآباد میں ان کی ملازمت کا وسیلہ بن جائے لیکن بسیار کوشش کے باوجود انھیں حیدرآباد میں مستقل ملازمت کا کوئی باوقار موقع دستیاب نہ ہو سکا۔ عطیہ فیضی کو جب اقبال کی ان کوششوں کا علم ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئیں۔ انھوں نے اقبال کو وہاں کی ملازمت حاصل کرنے سے سختی سے روکا تھا۔ [22]

ایک مرتبہ حیدرآباد ہائی کورٹ میں چیف جج کی خالی اسامی کے لیے نظام حیدرآباد کے پاس نام پیش ہوئے۔ ان میں ایک نام اقبال کا بھی تھا۔ اقبال کو علم ہوا تو انھوں نے مہاراجہ کو ایک تفصیلی خط تحریر کیا جس میں انھوں نے اپنا علمی تعارف تحریر کیا اور مہاراجہ سے سفارش کی بھی درخواست کی۔ ان کا بیان ہے:

"ایک عریضہ اس سے پہلے بھی ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ امید ہے کہ پہنچ کر ملاحظہ عالی سے گزرا ہوگا۔ مخبر کن سے معلوم ہوا ہے کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کی جج کے لیے چند نام حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں ایک نام خاکسار کا بھی ہے۔ اس خیال سے کہ میرا نام اور ناموں کے ساتھ پیش ہوا ہے اور یہ ایک قسم کا مقابلہ ہے۔ چند امور آپ کے گوش گزار کرنا ضروری خیال ہے۔ جن کا علم ممکن ہے سرکار کو نہ ہو۔ ممکن ہے کہ حضور نظام ان امور سے متعلق سرکار سے استفسار فرمائیں۔

اس جگہ کے لیے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ میں نے اس فن میں ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمرج) جرمنی (میونخ) (کی) یونیورسٹیوں کے پاس کیے ہیں۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے 18 ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے آفر بھی کی

مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صحیح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ چیف جسٹس ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں۔ چنانچہ 18 ماہ تک اسی پر عمل درآمد ہوتا رہا مگر اس عہدے کے لیے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے، غالباً عربی دانی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس کے متعلق یہ امر سرکار کے گوش کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحانات میں میں پنجاب میں اول رہا ہوں۔ انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ واپسی پر پنجاب اورینٹل آباد یونیورسٹی کے ایم۔اے۔ کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی۔اے۔ کی فارسی کا ایک پرچہ اور ایم۔اے۔ فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ میں علم اقتصاد، تاریخ اور انگریزی بی۔اے۔ اور ایم۔اے۔ کی جماعتوں کو پڑھائی ہے اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔ علم الاقتصاد پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔ انگریزی میں چھوٹی موٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفۂ ایران پر بھی لکھا ہے جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بہ زبان انگریزی زیر تصنیف ہے جس کے لیے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بہ شرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں جیسی کہ امام سرخسی کی 'مبسوط' ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی۔''

(ص 225-227)

یہ اقبال کا وہ خط ہے جس میں انھوں نے اپنی علمی زندگی اور کارگزاریوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسے اقبال کا تعلیمی تعارف (CV) سے بھی موسوم کر سکتے

ہیں۔اس خط میں اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کو اپنا علمی تعارف ہی نہیں کروایا بلکہ اپنا حق دوستی بھی طلب کیا ہے۔اقبال کو یہ معلوم تھا کہ جب ان کی عرضی نظام حیدرآباد کے پاس پیش ہوگی تو وہ مہاراجہ سے ضرور مشاورت کریں گے۔اس لیے اقبال نے مہاراجہ کو اپنا مکمل علمی تعارف لکھ بھیجا تا کہ ان کے ذہن نشین رہے اور موقع کی مناسبت سے وہ اسے نظام کے گوش گزار بھی کر سکیں۔مزید یہ کہ اس خط سے اقبال کی علمی و ادبی زندگی کے حوالے سے اہم معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔یہ خط اقبال کی علمی زندگی کے حوالے سے بنیادی معلومات بھی فراہم کرتا ہے۔ایک طرف اقبال حیدرآباد جانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے تو دوسری طرف قضاوقدر کا فیصلہ ان کی خواہش کے برخلاف آرہا تھا۔اقبال اپنی شہرت اور حیدرآباد کے عمائدین سے تعلقات کے باوجود حیدرآباد کیوں نہ جا سکے اس حوالے سے نظر حیدرآبادی اپنی تالیف ''اقبال اور حیدرآباد'' میں لکھتے ہیں:

> ''قیاس یہ کہتا ہے کہ باخبر اور ہوش مند انگریز جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ ہوتے تھے اور جس نے حیدرآباد میں وقار الملک، محسن الملک، نظر علی خان، عبدالحلیم شرر اور آخر میں بھی امام کو ٹکنے نہ دیا تھا۔وہ حیدرآباد میں اقبال جیسے ''نظر'' کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔چنان چہ یہی وجہ ہے کہ حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدرآبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدرآباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔ 23

مذکورہ بالا بیان اقبال کے حیدرآباد آمد میں بنیادی رکاوٹ پر روشنی ڈالتا ہے۔ البتہ مذکورہ بالا بیان میں نظر حیدرآبادی کا یہ بیان محل نظر ہے کہ نظام حیدرآباد کی بھی خواہش تھی کہ اقبال حیدرآباد میں مستقل قیام کریں۔اہلِ حیدرآباد اور اقبال کے بھی خواہوں کی خواہش تھی کہ وہ حیدرآباد میں آئیں اور ان کی ملازمت کا بھی وسیلہ بن جائے لیکن نظام حیدرآباد کی کبھی خواہش نہیں رہی کہ اقبال مستقل طور پر تو کجا عارضی طور پر بھی حیدرآباد آکر رہائش پذیر ہوں۔

اس حوالے سے محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں :

''مہاراجہ سرکشن پرشاد اپنی پرخلوص محبت، عقیدت اور ہم دردی کی بنا پر دل سے چاہتے تھے کہ اقبال ان کے قریب آجائیں اور ریاست میں انھیں کسی معزز عہدے پر فائز کر دیا جائے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی کونسل کی مخالفت اور ملکی اور غیر ملکی مصلحت کی موجودگی میں اقبال کو اس میں کبھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اول تو حکومتی سطح پر اقبال کی قدر دانی کے لیے حالات پوری طرح سازگار نہیں تھے۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال آزاد خیال اور حریت پسند تھے انگریزی ملوکیت اور انگریزی تہذیب کی خرابیوں پر نہایت تلخ تنقید کیا کرتے تھے۔ دکن کے حکمران جو برطانیہ کی دوستی اور وفاداری کا دم بھرتے تھے، اسے انگریز کی نہیں اپنی مخالفت سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اقبال کی سرپرستی کرنے سے کہیں ان پر کوئی آفت نہ آجائے۔ چنان چہ 1932ء میں نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کو بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی سفارش کی تو نواب مہدی یار جنگ صدر المہام سیاسیات حیدر آباد دکن کی یہ رائے اس موقع پر قطعی اور حتمی صورت اختیار کر گئی کہ اقبال کی مالی امداد کے تعلق سے معذوری کا اظہار کر دیا جائے۔ چنان چہ نظام نے اسی پر عمل کیا۔ مزید یہ کہ جب 1929ء میں اقبال نے جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر حیدر آباد کا دورہ کیا اور تین لیکچر دیے مہاراجہ سرکشن پرشاد نے مخالفتوں کے باوجود اپنے اختیارات سے انھیں سرکاری مہمان کی حیثیت سے سب سے اچھی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا اور ٹاؤن ہال لیکچروں کے لیے استعمال کرنے کی اجازت دی تو اس کی حیدر آباد کی سرکار انتظامیہ نے مخالفت بھی کی تھی اور اس حوالے سے مسائل بھی پیدا کیے تھے۔ خود نظام حیدر آباد نے دبے لفظوں میں ''بلاوسٹ'' گیسٹ ہاؤس میں اقبال کے ٹھہرائے جانے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔'' [24]

عبداللہ قریشی ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال آزاد خیال اور حریت پسند تھے اور انگریزی ملوکیت

اور انگریزی تہذیب کی خرابیوں پر نہایت سخت چینی کیا کرتے تھے۔ دکن کے حکمران جو برطانیہ کی دوستی اور وفاداری کا دم بھرتے تھے، اسے انگریز کی نہیں اپنی مخالفت سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ اقبال کی سرپرستی کرنے سے کہیں ان پر کوئی آفت ہی نہ آجائے۔ چنان چہ 1932ء میں نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے اقبال کی مالی امداد کی تحریک چلا کر میر عثمان علی خاں کو بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کی سفارش کی تو نواب مہدی یار جنگ صدر المہام سیاسیات حیدر آباد دکن کی یہ رائے اس موقع پر قطعی اور حتمی صورت اختیار کر گئی کہ اقبال کی مالی امداد کے تعلق سے معذوری کا اظہار کر دیا جائے۔ چنان چہ نظام نے اسی پر عمل کیا۔" 25

حیدر آباد کی سرزمین عجیب قسم کی سرزمین تھی۔ یہاں ان لوگوں کے لیے راستے کھلے رہتے تھے جو اپنے خیالات اور طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیتے تھے کہ ان کی حیدر آباد میں آمد نہ انگریزوں کے مفاد کے لیے خطرہ ہوگی اور نہ نظام حیدر آباد کے لیے مشکلات کا باعث۔ ایسے اشخاص کے لیے نظام کے دل کے ساتھ تجوریوں کے در بھی وا رہتے تھے لیکن جن لوگوں کے بارے میں نظام یا عمائدینِ ریاست دل صاف نہ رکھتے تھے ان کے قدم حیدر آباد میں نہ ٹک سکے۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

"حیدر آباد کی سرزمین طالع آزماؤں کو اکثر راس آتی تھی۔ جو جاتا تھا فیض یاب ہوتا تھا۔ ملازمت، وظیفہ یا نقد روپیہ کچھ نہ کچھ ضرور ہاتھ آجاتا تھا لیکن قسمت کی محرومی دیکھیے کہ بعض لوگوں کو دکن کے بحرِ سخاوت سے شبنم کے چند قطرے ہی ملے۔ اقبال بھی ان میں سے ایک تھے۔" 26

چوں کہ اقبال انگریزوں کی نظر میں قابلِ اعتبار نہیں تھے اسی وجہ سے ان کے خطوط کھول کر پڑھے جاتے ہوں گے اور ان کے لوگوں سے تعلقات کی بھی نگرانی کی جاتی ہو گی۔ یہ بات مہاراجہ کشن پرشاد کے علم میں بھی ہوگی۔ اسی لیے جب اقبال نے اپنے ایک خط میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا تو مہاراجہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے

انھیں آئندہ ایسا نہ کرنے کی تنبیہ کی۔ مہاراجہ کے خط کے جواب میں اقبال لکھتے ہیں:

''میرے عریضے کا کچھ حصہ پولیٹکل رنگ میں رنگین تھا تو اس میں تردد کی کوئی بات نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ اقبال کبھی پولیٹیشین نہیں بنے گا۔ وہ تو ایک راز کی بات تھی جس کا حل جانا تھا۔ بہر حال آپ کا اصول بہتر ہے یعنی سکوت۔'' (ص 138)

اقبال کے حیدر آباد آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ نظام حیدر آباد تھے۔ اقبال چاہتے تھے کہ کسی طرح نظام کو یہ باور کروا دیا جائے کہ اقبال کی حیدر آباد آمد ان کے لیے مسائل کا باعث نہ ہوگی۔ اس کے لیے انھیں خاص موقع کی تلاش تھی۔ جب یہ موقع دستیاب نہ ہو سکا تو انھوں نے شاد کو خط لکھا کہ:

''اس عریضے میں ایک تکلیف دیتا ہوں۔ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں سے جو آپ کے تعلقات تھے، ان کو تمام دنیا جانتی ہے۔ آپ کو ان کے بہت سے حالات معلوم ہوں گے۔ میری یہ خواہش ہے کہ ان کے عدل و انصاف کے متعلق کوئی نہایت دلچسپ اور معنی خیز واقعہ جس کو بطور حکایت کے لکھ سکتے ہوں، بیان فرمایئے۔ میں اسے ایک خاص غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں جو ایک وقت پر آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

(ص 152)

مندرجہ بالا خط میں ''خاص غرض کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں'' سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس واقعے کو نظام حیدر آباد کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے تا کہ ان کا راستہ حیدر آباد آنے کے لیے ہموار ہو سکے۔

غالب نے کہا تھا 'غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا'۔ انسان اس دنیا میں کسی نہ کسی غم میں ضرور مبتلا رہتا ہے۔ اقبال کے ساتھ بھی اسی قسم کے مسائل اور غم لگے رہے۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ ان غموں سے چھٹکارا پا سکیں لیکن یہ غم ان کا پیچھا کہاں چھوڑتے۔ اقبال کو بھی غم روزگار نے ساری عمر پریشان ہی رکھا۔ ان کی تمام عمر ان ہی غموں سے نبھا کرتے ہی گزری۔ شاد کے نام اکثر خطوط میں وہ اسی غم کا رونا روتے نظر

آتے ہیں۔ کہیں وہ ملازمت کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ذاتی زندگی کی مشکلات سے پردہ اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ آفتاب کو کسی پیر کامل کی مریدی میں دینے کی خواہش میں پریشان نظر آتے ہیں تو کہیں اسرارِ خودی کے اسرار و رموز سمجھاتے اور مخالفین کے جوابات دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں بھائی کی ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ کرتے اور سفارش کرتے نظر آتے ہیں۔ دوسروں کے لیے سفارشی رقعے تحریر کرتے ہوئے تو کہیں خود کو سفارش کے لیے پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاد کے نام اکثر خطوط میں اقبال ان ہی الجھنوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اقبال کے خطوط سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

''قانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکلے ''دل و دماغ'' دونوں کام کرنا چاہتے ہیں مگر ''پیٹ'' کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تار اپنے اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کش مکش کی حالت ہے۔'' (ص 115)

''آج کل شعر و شاعری کا شغل بھی کم ہے۔ ''بھائی گدھا'' یعنی پیٹ دم بھر کے لیے مہلت نہیں دیتا۔ لاؤ چارا لاؤ چارا۔ (ص 83)

''کئی مرتبہ ارادہ کرتا ہوں کہ پنجاب سے چند روز کے لیے نکل کر دکن کی سیر کروں مگر دکان داری کی زنجیریں پاؤں میں ہیں۔ دو چار روز کے لیے باہر نکلنے میں بھی اندیشہ ہے تو کجا پندرہ روز، بیس روز یا ہمیشہ۔'' (ص 152)

بعض اوقات اقبال اس دنیاداری اور معاشرتی علائق سے اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ جی میں آتا ہے کہ وہ یہ سب پابندیاں چھوڑ کر کسی ایسی جگہ نکل جائیں جہاں یہ معاشرتی پابندیاں ان کی زندگی میں حائل نہ ہوں مگر پھر وہی پابندیاں سدِ راہ بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں:

''آپ سے ملنے کو دل بھی چاہتا ہے مگر کیا کروں، پا بہ زنجیر ہوں۔ چند روز کے لیے بھی لاہور چھوڑنا محال۔ کسی وقت اسی قسم کے مواقع کی وجہ سے اتنا گھبراتا ہوں کہ بے اختیار

موجودہ پیشے کی قیود کو توڑ تاڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں مگر وہی مثل ہے: چہ خورد بامداد فرزندم"

(ص 163)

اقبال کے بڑے بھائی جن کی وہ والد کی طرح عزت کیا کرتے تھے۔ انھیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھجوانا بھی ان کی ہی وجہ سے ممکن ہوا۔ شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی، محسن اور ہم درد تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اقبال ان کی ملازمت کے بندوبست کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

"انھوں نے چیف انجینئر صاحب حیدر آباد اور میر کرامت اللہ خان صاحب سپرنٹنڈنٹ انجینئر کی خدمت میں درخواست ملازمت بھیجی ہے۔ میں نے ان کی فرمائش پر ہر قسم کی سفارش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اس بارے میں آپ اپنا اثر ان کے لیے استعمال کریں تو میں نہایت ممنون و مشکور ہوں گا۔ مسٹر حیدری کو بھی میں نے ایک عریضہ اسی غرض سے لکھا ہے۔" (ص 180)

اس خط میں اقبال اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی سفارش ہی نہیں کرتے، مہاراجہ کشن پرشاد سے حق دوستی بھی طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مندرجہ بالا عبارت میں "ہر قسم کی سفارش کرنے کا وعدہ" کے الفاظ میں اقبال کی کوششوں کی سمت کے تعین میں مدد ملتی ہے اور ماضی کے قرض چکانے کی یقین دہانی بھی۔[27] اقبال نے شیخ عطا محمد کے علاوہ مولانا عبداللہ عمادی، مولوی سید ابراہیم[28] اور شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی[29] کے لیے بھی شاد کو سفارش نامے تحریر کیے۔

آج کے عہد میں جب علم کاروبار بن چکا ہو۔ کتاب کی اشاعت مشکل ہو اور پبلشر کتاب کی اشاعت سے پہلے صاحبِ کتاب سے مالی معاونت کا طلب گار ہو تو زمانہ قدیم کے حوالے سے یہ کس طرح خوش گمانی کی جا سکتی ہے کہ اس وقت کتاب چھپوانا آسان کام ہوگا۔ اردو کے بڑے بڑے ادیب اپنی علمی کارگزاریوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے رہتے

تھے لیکن ان کی اشاعت کا انتظام نہ ہو پاتا تھا۔ انیسویں صدی کے بڑے بڑے ادیبوں کی علمی فتوحات کی اشاعت کا انتظام نہ ہو پاتا، اگر ان ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت میں حیدرآباد، رام پور اور بھوپال جیسی ریاستوں کے نوابوں نے تعاون نہ کیا ہوتا۔ اقبال کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''اسرارِ خودی'' کو اقبال نے اپنے ذاتی پیسے خرچ کر کے چھپوایا تھا۔ اس کتاب کو خوب صورت انداز میں چھپوانے کے لیے جتنے پیسے درکار تھے اتنے کی اقبال استطاعت نہیں رکھتے تھے یا ممکن ہے وہ اس کتاب کے دوسرے حصے کے لیے مہاراجہ سے مالی معاونت کے طلب گار ہوں جس کی درخواست وہ براہِ راست نہ کرنا چاہتے ہوں۔ ذیل کا بیان دیکھیے:

> ''اسرارِ خودی کی ایک کاپی ارسال خدمت کرتا ہوں۔ مجھے اس کتاب کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کی چھپائی وغیرہ کچھ دل کش نہیں مگر اس خیال سے کہ میں زیادہ روپیہ اس کی اشاعت پر خرچ کرنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ میری مجبوری کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اس جرات کو معاف کریں گے۔ (ص 140-141)

ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال انگریزی اصطلاحوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا کمال اور صلاحیت رکھتے تھے۔ اگر وہ اردو زبان اور اس کی لسانی جہتوں پر کام کرتے تو وہ ایک یادگار کام ہوتا۔ مولوی عبدالحق نے انھیں اصطلاحاتِ علمیہ کے تراجم کی ایک فہرست ارسال کی تھی کہ وہ ان تراجم پر تنقید کریں تاکہ تصحیح کے بعد ان تراجم کو شائع کیا جا سکے۔[30] یہ اصطلاحات ان خطوط میں کثیر تعداد میں تو نظر نہیں آتیں تاہم جہاں کہیں بھی نظر آتی ہیں ان سے اقبال کی اردو زبان پر دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''شخصی عنصر'' سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں مصنف کے ذاتی حالات و اکتسابِ فیوض کا اشارہ ہے یا ذکر ہے۔ میں نے یہ لفظ خود وضع کیا تھا۔ اردو زبان میں مروج نہیں ہے۔

انگریزی میں اس مطلب کو اصطلاح Personal Element سے واضح کرتے ہیں۔"

(ص 117)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"آج آٹھ دن سے مارشل لا یعنی قانون عسکری یہاں جاری ہے۔" (ص 251)

مہاراجہ کے نام لکھے گئے اقبال کے اکثر خطوط بے تکلفانہ تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں ادبی چاشنی نہیں لیکن بعض مقامات پر اقبال کے اسلوب کی خوب صورتی کو دیکھتے ہوئے داد دینی پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب ادبی انداز اختیار کر جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاعرانہ وسائل کو اپنی نثر میں استعمال کر رہے ہوں۔

"گو ہجوم ظلمی میں امید کی کمر شکستہ ہے تاہم جو کچھ بھی ہو سکے گا کروں گا۔" (ص 141)

"دونوں اشعار خوب ہیں۔ واللہ قبائے وزارت کے نیچے شاعری و درویشی، سپہ گری اور خدا جانے کیا کیا کمالات آپ نے چھپائے رکھے۔" (ص 75)

اگر اقبال اور شاد کے اسلوب کا موازنہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاد کا اسلوب اقبال کے اسلوب سے کہیں زیادہ علمی اور ادبی ہے۔ اقبال بے تکلفانہ لکھتے ہیں جس کی وجہ سے اقبال کی نثر میں وہ شعریت پیدا نہیں ہو سکی جو شاد کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ دو مثالیں دیکھیے:

"الغرض کل صوفیائے کرام کو انھوں نے کفر کی رسی میں لپیٹا ہے۔" (ص 328)

"اگست کو آج سے سات دن اور ستمبر کو ایک مہینہ سات دن باقی ہیں۔ میں آج ہی سے آپ کے انتظار کا احرام باندھتا ہوں۔" (ص 322)

اگرچہ مذکورہ بالا سطور میں اقبال اور شاد کی تحریروں سے مختصر جملے درج کیے گئے ہیں لیکن دونوں کے خطوط میں یہ تناسب ایک اور پانچ کا یا اس سے بھی زیادہ ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے ساتھ اقبال کا نیاز مندی کے علاوہ استادی کا رشتہ بھی تھا۔ اقبال وقتاً فوقتاً شاد کے کلام پر اصلاح دیتے رہتے تھے چوں کہ شاد خود اردو اور فارسی کے

شاعر تھے، اس لیے شاد کے نام اقبال کے خطوں میں اردو اور فارسی اشعار نظر آتے ہیں۔ دراصل اقبال شاد کے کلام پر اصلاحیں دیا کرتے تھے۔ اقبال کی خواہش تھی کہ ان کے حیدرآباد میں آنے کا بندوبست ہو جائے تو پھر وہ اپنی صلاحیتیں پورے طور پر شاد کی خدمت میں صرف کر سکتے ہیں:

"باقی رہی اقبال کی بیرسٹری یا اور کوئی ہنر جو اس بے ہنر میں ہے، وہ سب آپ کی خدمت کے لیے وقف ہے۔ اگر یہ بندۂ ناچیز وہاں قیام پذیر ہو گیا اور حالات زمانہ نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اقبال شاد کے کام آئے گا۔ (ص 238)

مندرجہ بالا عبارت میں اقبال نے واضح انداز میں تو نہیں لیکن بین السطور یہ لکھا ہے کہ اگر ان کا حیدرآباد میں ملازمت کا انتظام ہو جائے تو سیاسی اور ادبی دونوں معاملات میں آپ سے بھرپور تعاون کر سکتا ہوں۔ شاد کو 30 جون 1917ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"نوازش نامہ مل گیا ہے۔ فارسی مثنوی یا قصیدہ لکھا گیا ہے۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ چوں کہ سرکار نے ترمیم و تنسیخ کے لیے ارشاد فرمایا تھا، اس واسطے کسی کسی جگہ ترمیم کی جرات کی ہے۔ حوالات کے خیال سے وجوہ ترمیم نہیں لکھے۔ سرکار پر خود بخود روشن ہو جائے گا۔ چند اشعار کے گرد لکیر کھینچ دی ہے۔ ان کی اشاعت میرے خیال میں مناسب نہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ 'بردار تواں گفت و پسر نتواں گفت' اور کچھ اس وجہ سے کہ آپ کی شان صداقت اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ آپ اپنی صفائی کے گواہ پیش کریں۔ اہل نظر کو یہ اشعار کھٹکیں گے۔ آئندہ سرکار کو اختیار ہے کہ ان کی اشاعت ہو یا نہ ہو۔ یہ اشعار صفحہ دس گیارہ پر ہیں۔ سرکار کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے تشریح کے طور پر چند اشعار اس قصیدے کی پشت پر لکھ دیے ہیں۔ آخر کے شعر میں ایک مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جس کی تشریح اسی جگہ کر دی ہے۔" (ص 230-231)

شاد کے نام اقبال کے بہت سے خطوط دستیاب نہیں ہو سکے۔ ممکن ہے انھیں تلف بھی کر دیا گیا ہو تا کہ بعض معاملات تاریخ کا حصہ نہ بن پائیں۔ اگر وہ خطوط دستیاب ہو

جائیں تو بہت سے اسرار سے مزید پردہ اٹھ سکتا ہے۔ شاد اردو اور فارسی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ غالباً انھوں نے اقبال سے اس خواہش کا اظہار کیا ہوگا کہ وہ شاعری کے لیے نئے اور عمدہ خیالات سے انھیں وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہا کریں تاکہ وہ ان خیالات کو اپنی شاعری کا حصہ بنا سکیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ شاد کے نام اکثر خطوط میں اردو اور فارسی کے اشعار اور مصرعوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ مذکورہ موقف کی تائید میں 11 مارچ 1915ء کے خط کی یہ سطور ملاحظہ کیجیے:

''کل میر رضی دانش کا ایک شعر پڑھا تھا۔ تجھ لطف نہیں آتا۔ آپ کو بھی سناتا ہوں۔ اس پر غزل لکھیے:

زساقی بادہ می گیرم بپائے تاک می ریزم
ندارم فکر خود میخانہ را آباد می سازم

(ص 120)

دو خطوں کی مزید عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

''کل سے مومن استرآبادی کا یہ شعر پڑھ رہا ہوں۔ یقین جانیے کہ سینکڑوں دفعہ پڑھ چکا ہوں۔

اے کہ گوئی عشق را درمیان ہجراں کردہ اند
کاش می گفتی کہ ہجراں را چہ درماں کردہ اند

(ص 133)

کیا دل کش اور معنی خیز شعر کسی ایرانی شاعر کا ہے۔

بزمے کہ درآں سفرہ کشد جلوۂ دیدار
کوئیں غبارے ست کہ از بال مگس ریخت

(ص 225)

مندرجہ بالا اشعار بھی غالباً اقبال نے اسی لیے تحریر کیے ہیں کہ شاد ان پر غزل کہہ

سکیں۔ فی الوقت شاد کا سارا کلام پیشِ نظر نہیں اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ انھوں نے ان اشعار پر غزلیں کہیں یا نہیں۔

بعض اوقات انسان کی ذہنی حالت پر انقباض کا ایسا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ نیا اور اچھوتا خیال تو کجا اچھا خیال بھی ذہن کے دریچوں سے گزر نہیں پاتا۔ ایسی صورت حال ہر شاعر اور ادیب پر طاری ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال اقبال پر بھی کئی مرتبہ طاری ہوئی۔ انھوں نے اس کا ایک حل یہ نکالا تھا کہ وہ کسی اچھے شعر کو تلاش کریں اور ان سے لطف لیں تا کہ ان پر طاری کیفیت کو ختم کیا جا سکے۔ ایک خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔

> ''میں نے عرصہ سے کوئی شعر نہیں کہا۔ فارسی کا کوئی نہایت شگفتہ مصرع لکھیے۔ شدید قبض کی حالت مبدل بہ بسط و انشراح ہو جائے۔''[31]

مندرجہ بالا اشعار بھی ممکن ہے شاد کی ایسی کیفیات کے حل کے لیے پیش ہوئے ہوں۔

علامہ اقبال کے ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو لٹریچر کی روایت پر گہری نظر رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ آنے والا وقت دکنی لٹریچر کی دریافت اور ایڈیٹنگ کا ہوگا اسی لیے وہ مہاراجہ کشن پرشاد پر زور دیتے ہیں کہ وہ دکنی لٹریچر کی ایڈیٹنگ کا کام کریں۔ وہ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں موجود دکنی لٹریچر کے حوالے سے آرا اور کام سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لیے وہ بار بار مہاراجہ سے درخواست کرتے رہتے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ مہاراجہ اہلِ اقتدار میں سے تھے اس لیے قلمی مسودات تک رسائی اور ان سے استفادہ ان کے لیے ناممکن نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آج کل سرکار کو فرصت ہے اور مہمات امورِ سلطنت سے سبک دوشی حاصل ہے۔ اگر طبیعت راغب ہو تو مرزا بیدل کا دیوان ایڈٹ کر ڈالیے۔ حیدر آباد کے کتب خانوں میں اس کے کامل نسخے ضرور موجود ہوں گے۔ فارسی میں آپ کی دست رس قابلِ رشک ہے۔

اگر یہ کام زیادہ توجہ اور محنت چاہتا ہو تو اس سے سہل تر کام بھی ہے۔ وہ یہ کہ ولی سے پہلے کے دکنی شعرا کا کلام شائع ہونا چاہیے مثلاً سلطان قطب شاہ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے دیوان کا ایک نسخہ سرکار کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اردو لٹریچر پر یہ ایک بہت بڑا احسان ہوگا اور مولانا آزاد مرحوم کی تحقیق میں اضافہ۔" (ص 157)

"ولی دکنی سے پہلے کے اردو شعرا کو ایڈٹ کرنا نہایت مفید ہوگا اور اردو لٹریچر ہمیشہ کے لیے آپ کا زیر بار احسان رہے گا۔" (ص 159)

اگرچہ مہاراجہ اقبال کے مشوروں پر عمل نہ کر سکے لیکن آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ دکنی لٹریچر پر کام وقت کی ضرورت بھی تھا اور اہم بھی۔ اسی وجہ سے محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، نصیرالدین ہاشمی اور دوسرے دکنی محققین نے دکنی لٹریچر کو قعرِ گم نامی سے نکال کر عوام سے روشناس کروایا۔

اقبال کے خطوط میں ان کی گھریلو زندگی سے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اقبال اپنے بڑے بیٹے آفتاب کے حوالے سے ساری عمر پریشان رہے۔ آفتاب کی خودسری اور دوسری حرکتوں کی وجہ سے انھیں ایک پل چین نہ آتا تھا۔ شاد کے نام ایک خط میں بھی وہ آفتاب کے حوالے سے پریشان نظر آتے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ اسے کہیں مرید کروادوں یا شادی کر دوں تاکہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔[32] ان خطوط میں اقبال کی بیوی کے انتقال اور دوسری بیوی سے بیٹے کے پیدا ہونے کی خبر بھی ملتی ہے۔[33] 11 نومبر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی والدہ کا انتقال 9 نومبر کو ہوا تھا۔[34] اقبال کے اسفار، حالات، سیاسی خیالات، پیش گوئیاں، اس طرح کی خبروں سے اقبال کی زندگی سے متعلق مستند معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔

سلطنت آصفیہ میں شعرا کی سرپرستی سلاطین آصفیہ ہی نہیں کر رہے تھے، امرا، وزرا اور عمائدینِ سلطنت بھی اس میں پیش پیش تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں حیدرآباد میں اورنگ آباد، برہان پور اور شمالی ہند سے آئے ہوئے شعرا کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا تھا

جس کی وجہ سے شعر و سخن کا ماحول خاصا گرم ہو گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں نئے شعرا کو اپنی جگہ بنانے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چنان چہ اس عہد میں شعرا کے لیے کسی ایک صنف کا سہارا ہی کافی نہ تھا۔ کئی کئی اصناف میں تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کو آزمایا جاتا تھا۔ اس طرح سلاطین آصفیہ کے مزاج کو دیکھتے ہوئے شعرا تاریخ گوئی میں اپنے فن کے نمونے پیش کر رہے تھے اور قابل قدر شعرا کی صف کو محدود کر رہے تھے۔ اس عہد کے تاریخ گو شعرا میں میر شمس الدین فیض، عزیز اللہ ہمرنگ، شیخ خواجہ غلام احمد، احمد علی عصر، منشی عبدالصمد صمد، قادر حسین نسق، میر کاظم علی خان شعلہ، غلام محی الدین خان متین، یعقوب علی یعقوب، موسیٰ رضا رضا، نوازش علی خان شیدا، عبدالکریم والہ، محمد فیاض الدین خان فیاض، عزیز یار جنگ ولا، کریم، شور، سیف، مرزا عزیز بیگ عزیز، نظام الدین احمد نظام، عبدالرحمن خان ساجد، شاہ فیض اللہ تحمل، میر مصطفےٰ علی اسد، خواجہ سمیع اللہ نام، مرزا رسول بیگ کرم، خواجہ بدیع اللہ قیس، محمد مظفر الدین خان مزاج، محشری اور امیر مینائی وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔ داغ کو بھی اپنی جگہ بنانے میں کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بیسویں صدی میں بھی صورتِ حال اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اقبال کو بھی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی کہ وہ اس فن میں اپنی مشق کو بہتر بنائیں اور اس فن میں اپنی صلاحیت کا اظہار بھی کریں چنان چہ شاد کے نام خطوط میں اقبال نے اس فن کے اظہار کے راستے تلاش کیے اور بین السطور یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ خود بھی تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور مادۂ تاریخ نکالنے اور اس فن کے مختلف مظاہر پر قدرت رکھتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خواجہ حسن نظامی نے آپ کا نام 'بخاری شاد' رکھا تھا۔ آپ کے مناسب حال ہے مگر میں آپ کو 'جلال بخاری' کہتا ہوں کہ 'کشن پرشاد' کا ہم عدد ہے۔'' (ص 132)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ خدائے قادر و قیوم نے 'کشن پرشاد' کو ذوالمنن'

کا ہم عہد کیا ہے۔ اقبال پر بھی نظرِ عنایت رہے اور اوقاتِ خاص میں اس شرمندۂ عنبی کو
یاد رکھا جائے۔" (ص 198)

اول الذکر خط میں اقبال نے کشن پرشاد اور جلال بخاری کے اعداد میں یکسانیت تلاش کر کے ایک نکتہ پیدا کیا ہے۔ دونوں کے اعداد 877 بنتے ہیں۔ دوسرے خط میں بھی 'کشن پرشاد' اور 'ذوالمنن' کے اعداد میں یکسانیت تلاش کر کے مدعا پیش کیا ہے۔ اسی طرح انھیں کسی اخبار سے یہ اطلاع ملی کی شاد کو دوبارہ وزیرِ اعظم کے عہدے پر تقرر ہو گیا ہے۔ انھوں نے بغیر کسی سے تصدیق کیے اس واقعے کا یہ قطعہ تاریخ لکھ کر بھیج دیا:

صدرِ اعظم گشت شاد نکتہ سنج
ناوکِ او دشمناں را سینہ سفت
سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں
جانِ سلطاں سرکشن پرشاد گفت

۱۳۳۱ھ (ص 269)

1915ء میں اقبال کی فارسی مثنوی 'اسرارِ خودی' شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں اقبال نے حافظ شیرازی کے اندازِ فکر کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور اسے گوسفند کہتے ہوئے 'حافظِ صہبا گسار' سے ہوشیار رہنے اور 'محفلِ حافظ' سے بے نیاز رہنے کی تلقین کی تھی۔ اس مثنوی میں اقبال نے 'چشمِ حافظ' کو 'غارت گرِ شہر' بھی کہا تھا۔ اسی طرح اس مثنوی کے دیباچے میں بھی سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ حافظ شیرازی کو ہندوستان کا صوفی طبقہ بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اقبال کے ان خیالات کی وجہ سے کئی مشائخ اور اربابِ ذوق اقبال سے ناراض ہو گئے اور مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا۔ اقبال نے مثنوی کی دوسری اشاعت میں قابلِ اعتراض اشعار اور مواد کو مثنوی سے خارج کر کے اس بحث کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔[35] شاد کے نام خطوط میں اقبال نے بڑی تفصیل سے خودی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے گویا یہ خطوط

نہیں مختصر مقالے ہیں۔ ان خطوط میں اقبال نے جس تفصیل سے خودی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اتنا شاید کسی اور کے نام خطوط میں نہیں کیا۔ ان خطوط سے اقبال کے تصورِ خودی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اقبال کے تصورات پیش کرنے کے محرکات پر بھی۔ چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

''یہ مثنوی جس کا نام 'اسرارِ خودی' ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، میں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور میں حیران ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہیں آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیوں کہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے۔ مگر ع ''من صدائے شاعرِ فرداستم'' اور

ناامید ستم ز یارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

نہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے ان کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

(ص 164-163)

''خواجہ حسن نظامی صاحب نے تنقید حافظ کی وجہ سے اس مثنوی کو مخالف تصوف سمجھا ہے اور اسی مفروضے پر ان کے مضامین کا دارومدار ہے، جن میں مجھے انھوں نے دشمن تصوف

کہہ کر بدنام کیا ہے۔ ان کو تصوف کے لٹریچر کی واقفیت نہیں اور جس تصوف پر وہ قائم ہیں، اس کا میں مخالف نہیں۔ ہاں اس کے بعض مسائل کو میں صحیح تسلیم نہیں کرتا اور جس مسئلے میں میں نے اختلاف کیا ہے، مجھ سے پہلے ہزاروں صوفی اس سے اختلاف کر چکے ہیں۔ خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور غالباً پیدا بھی نہ ہوگا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ کیفیت قوائے حیات کی کمزوری ناتواں کرنے والی ہے۔

میں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی گزشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اصحا کو اپنے اپنے مریض کا اصلی مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے، اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے، جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا۔ جس نکتۂ خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں، وہ نکتۂ خیال صدیوں کے مضعف مگر حسین و جمیل ادبیات سے مستحکم ہو چکا ہے اور اب حالاتِ حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نکتۂ خیال میں اصلاح کی جائے۔

باقی رہا خواجہ حافظ کا صوفی ہونا، سو خواہ وہ صوفی ہوں، خواہ محض شاعر، ہر دو اعتبار سے ان کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ اور صحیح اندازہ علم الحیات کے اعتبار سے ہونا چاہیے بلکہ ہر شاعر و صوفی و نبی و مصلح کی قدر و قیمت اسی معیار سے جانچی جانی چاہیے اور جو اس معیار پر پورا اترے اس کو اسی وقت دستور العمل بنانا چاہیے۔" (ص 160-159)

"جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ قوت حیات کو ضعیف و ناتواں کرنے والی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت دو طرح سے دیے جا سکتے ہیں۔ فلسفیانہ اور شاعرانہ، مقدم الذکر قسم کا ثبوت اس مثنوی میں کوئی نہیں کیوں کہ کتاب نظم ہے اور نظم میں فلسفیانہ ثبوت پیش نہیں کیے جا سکتے۔ اگر یہی مضمون نثر میں لکھا جاتا تو وہ تمام ثبوت لکھے جاتے۔ شاعرانہ ثبوت منطقی اعتبار سے ضروری نہیں کہ صحیح ہوں۔ تاہم

اس نکتۂ خیال سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ مثنوی میں جا بجا موجود ہے۔ آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ مسئلہ نہایت دقیق اور گہرا ہے اور چوں کہ اس کا تعلق انسان کی موجودہ اور مابعد الموت کی زندگی سے ہے، اس واسطے ہر ایک آدمی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا ضرور ہے۔ میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ نتیجہ بیشتر اقوام مشرق کے موجودہ مذاق اور میلان طبیعت کے خلاف ہے لیکن مشرق قدیم کے حکما اس سے نا آشنا نہیں ہیں اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفۂ مغرب سے متاثر ہوا ہوں۔ اگرچہ میں کوئی غیر معمولی ذہانت و فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں، تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کسی قدر زیادہ رکھتا ہوں۔ جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عام لوگ جو دنیا کی دماغی اور علمی تاریخ سے پورے واقف نہیں، تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔ اعتراض کرنا دوسری بات ہے۔" (ص 167-168)

اقبال کی نجی جذباتی زندگی پر لکھنے والوں نے تقریباً تمام مواد ان خطوط سے حاصل کیا ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی، سینے شیل اور ویگیناسٹ کو تحریر کیے لیکن قارئین کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی کہ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خطوط میں بھی ایسا مواد موجود ہے جن سے اقبال کی نجی زندگی، ذہنی و جذباتی کیفیت کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مہاراجہ کے نام خطوط میں صنفِ لطیف کے حوالے سے اقبال کے خیالات بھی خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں تو اقبال شاد کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وضع داری کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وضع داری بے تکلفی میں تبدیل ہو گئی لیکن اس میں شاد کی طرف سے پہل ہوئی ہوگی۔ دونوں کے درمیان وضع احتیاط کا پردہ شاد کے سفرِ پنجاب کے دوران اٹھا ہوگا۔ اس سفر میں شاد نے لاہور میں ایک ہفتہ قیام کیا تھا۔ شاد کا یہ قیام جولائی 1913ء میں ہوا۔ شاد 17 جولائی کو لاہور پہنچے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران انھوں

نے بیسیوں لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اقبال سے بھی ملاقاتیں دلچسپ رہیں۔ ان ملاقاتوں نے اقبال کے حوالے سے شاد کو کافی متاثر کیا ہوگا۔ اقبال شاد کو آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر بھی لے گئے تھے اور شاد جب لاہور سے پانی پت کے لیے روانہ ہوئے تو ایک طبیب بھی ان کے ہمراہ کر دیا تھا اس سے بھی شاد کافی متاثر ہوئے ہوں گے۔[36]

اقبال اور شاد کے خطوط میں بعض اوقات مبہم اور غیر واضح جملے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو سیاسی ہیں لیکن بعض جملے ایسے بھی ہیں جو جنسی حوالوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بین السطور کی گئیں باتیں اور مبہم جملوں کے نقوش اقبال اور شاد کے خلوتوں سے متعلق خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال اقبال اور شاد کے خطوط سے دونوں کی نجی اور جذباتی حالات کے علاوہ نفسی کیفیتوں کا انکشاف بھی ہوتا ہے لیکن آلِ احمد سرور کا بیان اس کے برعکس ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ان (خطوط) سے اقبال کی مشرقیت وضع داری، محبت، اہل اللہ سے عقیدت اور روحانیت ظاہر ہوتی ہے اور اگر کوئی صرف ان خطوط ہی کو دیکھے تو وہ اقبال کی شخصیت کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو سکے گا۔ اقبال بزرگوں کا ادب کرتے تھے۔ وہ خود درویشی، فقر، قلندری اور سادگی کے دلدادہ تھے۔ شاد صوفی تھے بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ ان کا احترام کرنا اس وجہ سے مناسب تھا کہ وہ احترام کے آداب سے واقف تھے مگر اقبال نے شاد کو اس سے زیادہ کچھ اور نہ دیا اور غالباً اس سے زیادہ کے شاد مستحق بھی نہ تھے۔ اس لیے یہ خط اقبال کی پوری شخصیت کو سمجھنے کے لیے زیادہ مفید نہیں۔"[37]

ذیل میں اقبال کی جس شخصیت کے نقوش پیش کیے جائیں گے ان سے آلِ احمد سرور غالباً ناواقف نظر آتے ہیں۔

اقبال شاعر کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن پرست تھے اور حسن کے شیدائی بھی۔ حسن کی کیفیات خواہ انھیں حسین وادیوں میں نظر آئے۔

> "یہ معلوم نہیں آپ نے کبھی کشمیر کی سیر کی ہے یا نہیں۔ میں نے محض اس کے نزدیک

کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہر قدم پر قدرت کی دلفریبیاں نظر آتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سرکار وہاں کی سیر کریں تو شیخی مذہب کو چھوڑ کر ضرور شش امامی ہو جائیں۔"[38]

یا صنفِ لطیف میں :

"رسول اکرم فرماتے ہیں: مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں: نماز، خوشبو اور عورت۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کہ نبی کریم نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز۔"

وہ اس کا بے محابا اظہار کرتے ہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران نسوانی حسن نے ان کے دل میں جو آگ لگائی تھی وہ وطن واپسی کے بعد شعلۂ جوالہ بن چکی تھی۔ روکھی پھیکی خانگی زندگی نے اس پر جلتی کے تیل کا کام کیا۔ عائلی زندگی انھیں گلے کا طوق اور پاؤں کی بیڑی نظر آنے لگی جسے نہ اتارا جا سکتا تھا نہ توڑا جا سکتا تھا۔ معاشرتی رکاوٹیں اس آزادی میں رکاوٹ ڈال رہی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ اس آزادی کے مطمئنی ضرور رہے۔

"آزادی کی تشریح آپ نے خوب فرمائی۔ میں بھی آپ کے لیے اسی آزادی کا آرزومند ہوں یعنی صنوبر کہ پابندِ باغ بھی ہے اور آزاد بھی۔"[39]

ان سطور میں وہ شاد کی آزادی کے مطمئنی ہی نہیں اپنی آزادی کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

عائلی زندگی سے وہ اس حد تک بے زار ہو چکے تھے کہ وہ خانہ بدوش سپیرا بن کر جینے کو ترجیح دینے لگے۔ بد بخت ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانے، شراب نوشی میں پناہ لینے یا خودکشی کر کے روح کا بوجھ اتارنے کی خواہش کرنے لگے۔ کتابوں کے خوب صورت اوراق انھیں مردہ اور بنجر نظر آنے لگے یہ اوراق انھیں مسرت دینے کی بجائے وحشت زدہ کرنے لگے۔ ان کا دلِ زندہ دلِ مردہ کا نقشہ پیش کرنے لگا:

"جس زمانے میں میں زندہ تھا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا۔۔۔"[40]

اس سے پہلے کہ ان کے باطن میں لگی ہوئی آگ انھیں جلا کر خاکستر کر دیتی معاشی ضرورتوں اور وقت کے مرہم نے ان کے باطن میں موجود شعلۂ جوالہ کو بظاہر برف کی مانند ٹھنڈا کر دیا۔ عشق کی آگ بجھ کر راکھ کے ڈھیر کا نمونہ پیش کرنے لگی۔ شاد کے خطوط سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں بھی بہت سی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں اور دبی رہیں جو خاص خاص مواقع پر اپنی موجودگی اور حرارت کا احساس دلاتی رہیں:

''پنجاب کا حال بدستور ہے۔ گرمی کا آغاز ہے مگر یہ مارچ کے دن غنیمت ہیں۔ کوئی دن میں شگوفے پھوٹیں گے۔ بہار کی تیاری ہے، جنون پھر تازہ ہوں گے۔ میرا جنون، جو کچھ عرصے پہلے سے مجھے فراموش کر چکا ہے، کیا عجب کہ اس بہار میں عود کر آئے۔ آپ بھی دعا کریں کیوں کہ آپ مستجاب الدعوات ہیں، گو آپ کو اس کی خبر نہیں۔'' 41

اقبال تمام عمر گیلی لکڑی کی مانند اندر ہی اندر سلگتے رہے لیکن اس کا دھواں کسی کسی نے دیکھا۔ شاد کے نام اقبال کے خطوط میں راکھ میں دبی ہوئی اٹھی چنگاریوں اور اڑتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال عورت کو کائنات کی لطیف ترین شے سمجھتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے زندگی کا سوز و ساز ہے اور کائنات میں رنگا رنگی ہے۔ اس صنفِ لطیف کو اسلام نے مردود قرار نہیں دیا بلکہ کائنات میں زندگی کا محرک قرار دیا ہے۔ کائنات کی تکمیل اسی کی ذات سے ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ذیل کا خط پڑھیے ہے:

''لندن میں ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا ''تم مسلمان ہو؟'' میں نے کہا ہاں! تیسرا حصہ مسلمان ہوں'' وہ حیران ہو کر بولے ''کس طرح؟'' میں نے عرض کیا کہ رسول اکرم فرماتے ہیں: مجھے تمھاری دنیا میں سے تین چیزیں پسند ہیں: نماز، خوشبو اور عورت۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے مگر اس تخیل کی داد دینی چاہیے کہ نبی کریم نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز۔ (ص 150)

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب اقبال کا نفسیاتی مطالعہ میں لکھتے ہیں:

''مشرق کے آداب شرافت میں شخصیت پرستی کو بلاوجہ جو اساسی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اس کے مضر اثرات نے شخصیت نگاری کو بالخصوص اور تنقید کو بالعموم متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر میں سیرت بھدی سنہری ملبوسات میں لپٹی خوش رنگ اور خوش نظر تو معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت کے رنگ و بو سے عاری رہتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ایک خاص نوع میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ خوف ہے حقیقت کا! حقائق سے آنکھیں چراتے ہوئے یہ باور کر لینا کہ بس حقیقت کا وجود معدوم ہو گیا یا پھر حقائق کو اپنی سہولت اور ضرورت کے مطابق توڑ موڑ کر حسب منشا پیکر عطا کر کے مطمئن ہو جانا یہ انداز ہمارا قومی نشان بن چکا۔ ہم اس پجاری کی مانند ہیں جو بت کو خدا تو بنا سکتا ہے لیکن اسے بت کے روپ میں دیکھنے کی جرات نہیں رکھتا۔'' [40]

ہم میں سے بہت سے اقبال کو اسی جذبے کے ساتھ دیکھتے اور دکھاتے ہیں کبھی صوفی کا روپ دے کر کبھی درویش کی صورت بنا کر اور کبھی قلندر کے بہروپ میں اور کبھی فرشتہ بنا کر لیکن انھیں بہت کم انسان کے روپ میں بھی پیش کیا گیا۔ یہ خطوط عام انسانی رویوں کے ترجمان ہیں اور اقبال کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جن کا اظہار دوسرے لوگوں کے خطوط میں اس طور نہیں ہو پایا۔ ان خطوط میں وہ ترجمانِ حقیقت، رہبرِ شریعت اور پیرِ طریقت کے مقامِ بلند پر فائز نظر نہیں آتے بلکہ ہمارے جیسے ایک عام انسان نظر آتے ہیں۔ وہ ایک زندہ دل انسان کی طرح قدرت کی نعمتوں اور حسنِ فطرت کے جلووں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ وہ حسن پرست بھی ہیں اور اس کے ثنا خواں بھی اور حسن کی رعنائیوں کو کشید کرنے کے خواہش مند بھی۔ ذیل کی عبارتیں ملاحظہ کیجیے:

''ایک مطربہ پنجاب میں رہتی ہے۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ حسن میں لاجواب ہے اور اپنے گزشتہ اعمال سے تائب ہو کر پردہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ چند روز ہوئے اس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو۔ تمھاری نظم کی وجہ سے تم

سے غائبانہ پیار رکھتی ہوں اور میری توبہ کو ٹھکانے لگا دو۔ دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کا ریخیر میں حصہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں، اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں۔ مجبوراً معذرانہ انکار کرنا پڑا۔" (ص 150)

مذکورہ بالا خط میں لکھتے ہیں:

سرکار نے جو نسخہ میرے لیے تجویز فرمایا ہے ضرور مفید ہوگا کیوں کہ مجرب ہے اور مجھے اس کے استعمال کی خواہش بھی بہت ہے مگر نری خواہش سے کام نہیں چلتا۔ استعمال کے وسائل بھی ضروری ہیں اور وہ مفقود ورنہ یہ تو وہ چیز ہے کہ

"خمار بے حد من بحرها همی طلبند"

(ص 149)

اسی خط میں مطربہ کے بارے میں بات کر کے لکھتے ہیں:

"اب بتایئے کہ آپ کا نسخہ کیسے استعمال میں آئے مگر میں آپ کی ولایت کا قائل ہوں کہ آپ نے ایسے وقت یہ نسخہ تجویز فرمایا کہ مریض کی طبیعت خود بخود ادھر مائل تھی۔ نسخہ مجھے دل سے پسند ہے مگر اس کو کسی اور وقت پر استعمال میں لاؤں گا، جب حالات زیادہ مساعد ہوں گے۔" (ایضاً)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"لاہور میں گرمی کا زور ہے اور اس پر مس گوہر جان (کلکتے کی مشہور کلاکار) کا نغمہ جگر سوز فضائے لاہور کی حدت پر مستزاد ہے۔ مولانا اکبر نے خوب ارشاد فرمایا تھا:

نصیب ایسا کہ رکھتی ہے زر و سیم و گہر گوہر
میسر ہے اسے ہر چیز دنیا میں مگر شوہر

(ص 168)

ایک اور خط دیکھیے:

"جس زمانے میں میں زندہ تھا، یا یوں کہیے کہ زندہ دل تھا، تو تجربے نے یہ اصول سکھایا

کہ جس معشوق سے زیادہ محبت ہو، اس سے اصولاً زیادہ بے اعتنائی کرنی چاہیے۔ لوگوں نے فرمائش کی ہے کہ ہر اصول پر ایک مفصل رسالہ لکھا جائے کہ تماش بینوں کے لیے رہنمائی کا کام دے۔ سو بندہ نے ایک رسالہ موسوم بہ "اجرالسکوت" تحریر کیا ہے۔ جس میں سکوت کے ایسے ایسے دلائل پیش کیے ہیں کہ فریدالدین عطار بھی اگر رسالے کو پڑھے تو اپنے فضائل خاموشی کو فراموش کر جائے۔ وہ رسالہ سینہ بہ سینہ شائع ہوتا تھا مگر اب اس کا نشان باقی نہیں کہ وہ محرکات نہیں جو اس رسالے کی تصنیف کا باعث ہوئے۔"

(ص 139)

یہ خطوط اقبال کی زندگی کے ایسے پہلو کو سامنے لاتے ہیں۔ جس میں اقبال کی زندگی کے ایک خاص رخ، ذہنی رویے، نفسی کیفیت، خیالات اور جذبات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں وہ ایک ایسے انسان کے روپ میں سامنے آئے ہیں جو ماورائی صفات کے حامل نہیں بلکہ ایک گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں، جن کے دل میں خواہشات اور امنگیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں لیکن معاشی مسائل، معاشرتی بندھن اور مجبوریاں انھیں "کارِ خیر" میں حصہ لینے نہیں دیتیں۔ یہ مسائل ان کی قلبی حدت کو بھڑکنے نہیں دیتیں بلکہ ٹھنڈا کیے رکھتی تھیں۔ مذکورہ بالا اول الذکر خط میں "دل تو یہی چاہتا تھا کہ اس کارِ خیر میں حصہ لوں مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں" اقبال کی نفسیاتی صورتِ حال کی پیش کش اس سے بہتر انداز میں شاید ہی کسی خط میں ہوئی ہو۔

پروفیسر مجیب نے لکھا ہے:

"اقبال نے اپنی شخصیت پر خود بھی بہت سے پردے ڈال رکھے تھے۔ وہ ہر ایک کو اپنی اصلی جھلک دکھاتے بھی نہ تھے۔ غالباً ہر ایک اس کی تاب بھی نہ لا سکتا تھا۔[43]

لیکن شاد ان لوگوں میں شامل تھے جنھیں اقبال اپنی شخصیت کی اصلی جھلک دکھانے میں بھی کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔ شاد کے نام خطوط میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اقبال نے اپنا دل کھول کر شاد کے سامنے رکھ دیا ہے۔ کہیں مخفی انداز میں تو کہیں عیاں۔

لیکن ان دھندلے اور واضح نقوش کو اگر ترتیب سے رکھ کر دیکھا جائے تو اقبال کی ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو حقیقی جذبات کی حامل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان خطوط میں اقبال ایک زندہ اور جیتے جاگتے انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے خطوط بعض اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ ان خطوط سے 1916ء سے 1926ء تک کے عرصے پر محیط اقبال کی علمی، شعری اور سیاسی مصروفیات کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ اقبال کی نجی زندگی کے بعض تلخ واقعات سے آگاہی بھی ہوتی ہے۔ یہ خطوط اقبال کی بعض شعری تخلیقات کے محرکات، ان کے ابتدائی متون، ردکردہ کلام کو جاننے اور ان کی تخلیق کے وقت کا تعین کرنے میں بھی مددگار ہیں۔ ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو قوالی سننے [44] (ص 250) اور درویشوں سے ملنے کا بھی بہت شوق تھا۔ [45] وید رامائن [46] اور گیتا [47] کے اردو تراجم کرنا چاہتے تھے۔ اقبال کو سر کا خطاب ملنے کی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔ [48] فارسی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کے بارے میں بعض اہم معلومات بھی انھیں خطوط سے مہیا ہوتی ہیں۔ [49] ان خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسرار خودی ان کی باطنی تحریک کا نتیجہ ہے جو خالق حقیقی کی طرف سے ان کے دل میں ڈالا گیا تھا۔ [50] مزید یہ کہ اس مثنوی کے دوسرے حصے کا کچھ حصہ لاہور سے باہر ایک گاؤں میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے۔ [51] حیدر آباد کے مسائل سے ان کی دلچسپی اور واقفیت، برار کے مسئلے کے حل کے لیے ان کے قانونی مشورے [52] پیش گوئیاں [53] اور رائل کمیشن کی آمد کے وقت اپنی خدمات کی پیش کش [54] کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علی امام کے متعلق ان کی رائے، [55] ادبی مباحث، علمی مسائل، فلسفیانہ موضوعات، مذہبی موضوعات، نجی حالات، نفسی کیفیات مجبوریاں، محرومیاں، پریشانیاں، محبتیں، کلفتیں اور اسی نوع کے دیگر امور کے بارے میں معلومات ان خطوط سے حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ امور اور موضوعات ایسے بھی ہیں جو ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں گم ہو کر رہ گئے۔ مختلف النوع الجھنوں نے ان کو وجود میں آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

غرض 'اقبال بنام شاد' میں موجود خطوط سے اقبال اور شاد کے تعلقات پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ یہ خطوط ایک طرف ادبی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں تو دوسری طرف ان خطوط سے اقبال اور شاد کے نجی معاملات زندگی بھی سامنے آتے ہیں۔ ان خطوط میں حیدرآباد دکن کے بطور سیاسی و ادبی مرکز کی اہمیت کا بھی پتا چلتا ہے اور اس کی ثقافتی اور تہذیبی صورت حال بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ان خطوط میں اقبال ایک ادیب، شاعر اور مفکر کے روپ میں تو سامنے آتے ہی ہیں لیکن یہ ایک دردمند، حساس، عام انسانی جذبات اور بشری صفات کے حامل شخص کی صورت میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان خطوط سے ہم اقبال کو ایک شاعر، ایک ناقد، ایک مفکر، ایک دوست اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح یہ مجموعہ مکاتیب اولین مجموعہ ہائے مکاتیب میں نہ صرف ادبی اہمیت کا حامل ہے بلکہ اقبال شناسی کی روایت میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اقبال اور شاد اور ان کے تعلقات کو جاننے، سمجھنے، پرکھنے کا ایک اہم ترین اور بنیادی ماخذ کی حیثیت کا حامل بھی۔

.....

حواشی و حوالہ جات

1- اقبال خان محمد نیاز الدین خان کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا جب انھوں نے میرے بعض خطوط ایک کتاب میں شائع کر دیے تو مجھے بہت پریشانی ہوئی کہ خطوط ہمیشہ عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدم التفات تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیویٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں، مگر اشاعت ان کی نظر ثانی کے بغیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپروا ہوں۔ امید ہے آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے۔''

''خطوط اقبال'' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابان ادب لاہور 1976ء، ص 33-32

2- ''شاد اقبال'' مرتبہ محی الدین قادری زور، اعظم مشین پریس، حیدرآباد، 1942ء

3- ایضاً مقدمہ ص 36 زور کا بیان ہے:

''اس مجموعے میں جو خطوط شائع کیے جا رہے ہیں وہ مہاراجہ کی وفات سے دو تین سال قبل ہی

بغرض اشاعت وصول ہوئے تھے لیکن ان کی ترتیب وطباعت میں اتنی تعویق ہوگئی کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے دو تین سال بعد شائع ہو رہا ہے۔"

4- دیکھیے "کلیات مکاتیب اقبال" مرتبہ مظفر حسین برنی "کلیات مکاتیب اقبال" کی پہلی جلد 1989ء میں دوسری جلد 1991ء میں اور تیسری جلد 1993ء میں اردو اکادمی دہلی سے شائع ہوئی۔

5- دیکھیے: "اقبال نامہ" مجموعہ مکاتیب اقبال، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، 2005ء ص 521-462

6- "صحیفہ اقبال" نمبر حصہ اول، شمارہ 65، اکتوبر 1973ء، ص 72

7- "اقبال بنام شاد" مرتبہ عبداللہ قریشی، بزم اقبال، لاہور اول 1986ء ص 56، صحیفہ ص 99

8- "اقبال نامہ" مجموعہ مکاتیب اقبال، شیخ عطاء اللہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، 2005ء ص 461

9- "شہر نگاراں" سبط حسن، دانیال کراچی، 1985ء دوم ص 49

10- ایضاً ص 121

11- "پھر نظر میں پھول مہکے" مرزا ظفر الحسن، کتب پرنٹرز و پبلشرز لمیٹڈ، کراچی، اپریل 1974ء

12- "اقبال کی دو نظمیں اور ان کا پس منظر" تحسین سروری، صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول، شمارہ 65، اکتوبر 1973ء، ص 62-61

13- "اقبال اور حیدرآباد" نظر حیدرآبادی، ص، اقبال اکادمی، کراچی، اشاعت اول 1961ء ص 14

14- دیکھیے "اقبال کی دو نظمیں اور ان کا پس منظر" تحسین سروری، صحیفہ اقبال نمبر حصہ اول، شمارہ 65 اکتوبر 1973ء، ص 66

15- "شہر نگاراں" سبط حسن، ص 68-67

16- دیکھیے "پھر نظر میں پھول مہکے" مرزا ظفر الحسن، ص 26-17

17- یہ فہرست مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات مصنفہ مہدی نواز جنگ مطبوعہ حیدرآباد دکن 1950ء سے حاصل کی گئی ہے۔

18- "اقبال اور حیدرآباد" ص 200

19- "اقبال بنام شاد" مرتبہ عبداللہ قریشی ص 29

20- "شاد اقبال" مرتبہ: محی الدین قادری زور، اعظم سٹیم پریس حیدرآباد، 1942ء، ص 25

21- "اقبال بنام شاد" مرتبہ عبداللہ قریشی ص 77,297,311,297,294,287

22- "اقبال" از: عطیہ بیگم، مترجم: ضیاء الدین احمد برنی، اقبال اکیڈمی، کراچی، 1956ء، اول ص 52-51 اس حوالے سے عطیہ فیضی کا بیان ہے "اس کے بعد میں نے ایک اور سخت لکھا ہوگا جس میں انھیں بتایا

ہوگا کہ اگر انھوں نے کسی ہندوستانی ریاست کی ملازمت قبول کر لی تو وہ اپنی خداداد غیر معمولی قابلیت کو کھو بیٹھیں گے۔ ان کا 17 اپریل 1919ء کا خط خود ایک اپنی تشریح ہے۔ (اقبال لکھتے ہیں)

''انھوں (اکبر حیدری) نے آپ کو اس حد تک میرے خلاف بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ پر عدم اخلاص اور عدم صداقت کا الزام دھر رہی ہیں۔ مہربانی کر کے میرے حیدرآباد جانے کے بارے میں کوئی نتائج اخذ نہ کیجیے۔ مثلاً یہ کہ نظام کی جانب سے قدر شناسی وغیرہ وغیرہ۔ میرا بیان نہ سن لیں۔ میں اتنا لمبا سفر محض دوستوں سے ملنے کی خاطر اختیار نہیں کر سکتا تھا ایسے میں جب کہ مجھ میں ایسا کرنے کی قدرت نہ تھی۔ میں آپ سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کی سوسائٹی کے بارے میں جو کچھ آپ کہتی ہیں اس سے میں متفق ہوں۔''

23- ''اقبال اور حیدرآباد'' ص 20

24- دیکھیے مقدمہ ''اقبال بنام شاد'' مرتبہ عبداللہ قریشی ص 49-47

25- مقدمہ ''اقبال بنام شاد'' ص 48-47

26- ''شہر نگاراں'' ص 69

27- اقبال از عطیہ فیضی، ص 36۔ اقبال عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں: ''میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرض دار ہوں اور یہی چیز مجھے روک رہی ہے۔''

28- ''اقبال بنام شاد'' ص 238

29- ایضاً ص 279

30- ایضاً ص 241

31- ''مکاتیب اقبال بنام گرامی''، مرتبہ عبداللہ قریشی، اول ترتیب پبلشرز، لاہور۔ س۔ ن، ص 483

32- ''اقبال بنام شاد'' ص 205

33- ایضاً

34- ایضاً ص 107

35- تفصیل کے لیے دیکھیے: ''زندہ رود'' (2) جاوید اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، دوم 1983ء ص 242-200

36- تفصیل کے لیے دیکھیے: (1) مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات، مہدی نواز جنگ، حیدرآباد دکن 1950ء ص 215 (2) ''شاد اقبال'' مقدمہ ص 16-15

37- ''اقبال اور ان کا فلسفہ''، آل احمد سرور، مکتبہ عالیہ، لاہور، جنوری 1977ء ص 105

38- ''اقبال بنام شاد'' مرتبہ عبداللہ قریشی ص 127

39- ایضاً ص 132

40- ایضاً ص 139

41- ایضاً ص 156-157

42- ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ'' ڈاکٹر سلیم اختر، مکتبہ عالیہ لاہور، 1987ء، ص 20

43- ''اقبال بنام شاد'' مرتبہ عبداللہ قریشی ص 59

44- ایضاً ص 250

45- ایضاً ص 205,258

46- ایضاً ص 252

47- ایضاً ص 257

48- ایضاً ص 357

49- ایضاً ص 158-161

50- ایضاً ص 163

51- ایضاً ص 186

52- ایضاً ص 274

53- ایضاً ص 102,275۔ اقبال 28 اگست 1914ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یورپ میں ایک خوف ناک جنگ ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ یہ وہی جنگ ہو جس کا ذکر پرانی کتب مقدسہ میں ہے۔'' (ص 102)
19 اپریل 1923ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آیندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔'' (ص 275)
اقبال کی دونوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم اسی سال چھڑ گئی اور ہندو مسلم علیحدگی ان کے اندازے سے چھ سال پیش تر ہی انجام کو پہنچ گئی۔

54- ایضاً ص 282

55- ایضاً ص 120

❖❖❖

ڈاکٹر شمیم احمد (نئی دہلی)

جوابِ شکوہ کا موضوعاتی مطالعہ

علامہ اقبال نے اپنی بیش بہا خداداد ذہنی صلاحیتوں کو اپنی گراں مایہ علمی و اکتسابی سرگرمیوں سے کچھ اس طرح فروغ دیا کہ ان پر تخلیقِ آدم کے راز از خود منکشف ہو گئے۔ ہم سبھی بخوبی واقف ہیں کہ ہمیں خدا کی تمام مخلوقات میں اشرف و ممتاز ہونے کا خصوصی شرف حاصل ہے۔ جب کبھی کسی کی زبان سے یہ بات سنتے ہیں یا کسی تحریر میں اپنے اشرف المخلوق ہونے کی بات پڑھتے ہیں تو دل میں کچھ دیر کے لیے بڑائی کا احساس پیدا ہوتا ہے، اپنی صلاحیتوں کے محاسبے کا جوش سر اُبھارتا ہے اور پھر بہت جلد یہ جوش و خروش سرد پڑ جاتا ہے۔ ایک دانش ور مفکر کے طور پر علامہ اقبال کے دل میں اپنے اشرف ہونے کا احساس جاگزیں تھا اور اس احساس نے ان کے ذہن و دل کو ارفع و اعلیٰ مقام عطا کیا تھا۔ یہی احساس اقبال کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ کسی دوسری مخلوق کی مدد لیے بغیر خود براہِ راست خالقِ ارض و سما سے گفتگو کریں اور چوں کہ خود خدائے بزرگ و برتر نے یہ اعلان کیا ہے

کہ وہ حضرتِ انسان کی شہ رگ سے زیادہ اُس کے قریب ہے، اس لیے اقبال ان قربتوں اور اپنائیتوں کے باعث اپنے اندر یہ حوصلہ پاتے ہیں کہ اگر کسی بات کا شکوہ کرنا ہے، کچھ شکایت ہے، کسی کمی کی طرف متوجہ کرنا ہے تو خدا تعالیٰ کی ذات سے براہ راست ہم کلام ہوا جائے۔ اس احساس نے اقبال کو تحریک بخشی کہ انھوں نے نظم کے پیرایے میں اُمت محمدیہ کو درپیش مصائب و مسائل کا شکوہ کیا اور خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ اپنی رحمتوں کا رُخ اغیار کے کاشانوں سے موڑ کر امت مسلمہ کی جانب کر دے۔

شکوہ اور دعا خدا سے تھی لیکن ایک زیریں لہر کے طور پر تمام نظم میں اہل اسلام کے لیے یہ پیغام پوشیدہ تھا کہ دنیا میں ابھرنے اور کامیاب ہونے کے آداب امت نے بھلا دیے ہیں۔ ان راستوں پر چلنا چھوڑ دیا ہے جن پر پیش رفت کامیابی کی ضمانت ہے۔ شکوہ کے بین السطور کارفرما اس پیغام کو کچھ حضرات نے سمجھا بیش تر نے نہیں سمجھا۔ چناں چہ اقبال کو بعض نکات کی صراحت اور وضاحت کے لیے ایک اور نظم کہنی پڑی جس کا نام 'جوابِ شکوہ' ہے۔ ان دونوں نظموں کی تصنیف میں تقریباً دو برس کا فاصلہ ہے۔ تاہم ان دونوں نظموں میں لفظی اور معنوی ارتباط کا حسن اس قدر نمایاں ہے کہ ''جوابِ شکوہ'' کو اپنی پہلی نظم شکوہ کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ ان دونوں نظموں کے مابین باہمی ارتباط کے تعلق سے ماہرین اقبال نے یہ بھی لکھا ہے کہ شکوہ اگر مذہبی واسوخت ہے تو واسوخت کا خاتمہ عام طور پر محبوب سے صلح صفائی پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جوابِ شکوہ تعلقات کے از سرِ نو خوش گوار ہونے اور اعتدال پر آنے کا اعلان ہے۔

شکوہ میں اقبال نے خدا تعالیٰ کے روبرو گفتگو میں جو گستاخی کی تھی، طنز و تعریض کا لہجہ اختیار کیا تھا اُس نے آسماں کے مکینوں کو تو برہم کیا تاہم رحمٰن و رحیم نے اپنے بندوں پر ہمیشہ لطف و عنایات کی بارش کی ہے، عفو و درگزر سے کام لیا ہے، چناں چہ خدا تعالیٰ شکوہ کے ہر ایک سوال کا جواب دیتے ہیں، غلطیوں پر گرفت فرماتے ہیں، اُمت مسلمہ کی کوتاہیوں کو آشکار کرتے ہیں اور بالآخر راہ نجات دکھاتے ہیں جو کامیابی اور کامرانی کی

طرف لے جانے والی ہے۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کے سوال اور خدا کے جواب سب شاعر کے تخیل کا کرشمہ ہیں۔ اقبال نے اپنے خیالات کو خداوند تعالیٰ کی زبان سے ادا کیا ہے اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان میں وزن اور وقار پیدا ہو جائے اور اہل اسلام اس طرف متوجہ ہوں۔ خدا تعالیٰ کی زبانی اپنے سوالات کے جوابات پیش کرنے سے قبل اقبال نے تمہیدی گفتگو کے لیے چار بند مخصوص کیے ہیں اور اپنے شکوے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ کی زبانی جس شکوے کا جواب دینا مقصود ہے اس کی اہمیت قائم ہو جائے۔ یہ بات دلوں میں گھر کر جائے کہ یہ شکوہ کوئی معمولی شکوہ نہیں تھا۔ اس میں اتنی طاقت تھی کہ آسمان کو چیر کر وہاں جا پہنچا جہاں پہنچانا مقصود تھا۔ اسی لیے اقبال پہلے ہی بند میں کہتے ہیں کہ :

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں ، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے ، رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گزر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

اگلے تین بند میں اقبال نے شکوے کے تعلق سے ساکنانِ آسمان کی حیرانی اور باہم سرگوشیوں کی تمثیل باندھی ہے۔ اس تمثیل میں پیرِ گردوں، سیارے، چاند، کہکشاں کی حیرانی اور بے چینی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سب کی زبانی پر تجسس فقرے کہلوائے ہیں اور پھر داروغۂ جنت رضواں کو ان سب پر فوقیت دیتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس شکوے کو سمجھنے والا اگر کوئی ہے تو صرف وہی کیوں کہ اسے جنت میں حضرتِ آدم کے ساتھ وقت گزارنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اگلے دو بند فرشتوں کے اظہارِ حیرت اور جرأت انسان پر گرفت

کے لیے مخصوص ہیں جس کی ابتدا دو مصرعوں پر ہوتی ہے:

ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

ان چار تمہیدی بند کے بعد پھر گریز کا ایک بند آتا ہے جس میں پروردگار عالم کی جانب سے شکوہ کی تعریف میں اقبال نے کہلوایا ہے۔ غم انگیز ہے افسانہ ترا، اشک بے تاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا، اور پھر یہ بھی کہلوا دیا کہ یہ شکوہ، شکوہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت شکر کی ہے جسے اقبال کے حسن ادا نے یہ اعلیٰ درجہ عطا کیا ہے کہ بندے خدا سے ہم سخن ہونے کا شرف حاصل کر رہے ہیں اور پھر ندائے غیب سے وہ بند نازل ہوتا ہے جو ہمارے آپ کے ذہن کا حصہ بن چکا ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے، جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اپنی عظمت، بڑائی اور فیاضی کے بیان کے بعد خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے مخاطب ہو کر ارشاد کرتے ہیں کہ مسلمان اپنی زبوں حالی کے ذمہ دار خود ہیں۔ ان کے دل محبت سے خالی اور بازو طاقت سے محروم ہیں۔ ان کے بزرگوں نے بت شکنی کو وتیرہ بنایا تھا لیکن موجودہ مسلمانوں نے بت گری کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ وہ مالی منفعت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں اور جس خدا کے لیے شکوے میں ہرجائی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اُسے پچھلے لوگ اپنا محبوب گردانتے تھے اور محبوب کے عشق میں ہر اُس راہ سے گزر جاتے تھے جس کا حکم محبوب کی طرف سے ملا تھا جب کہ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ:

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے
تمھیں کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اقبال نے خدا کی زبانی مسلمانوں کی لاپرواہی کے مزید نقشے کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جن بزرگوں نے خدا کا نام بلند کیا تھا ان کی صفات سے موجودہ مسلمان عاری ہیں۔ ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم غیروں کو نوازتے ہیں اور مسلمانوں سے صرف جنت کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے وجہ یہ ہے کہ اُن میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں جس کی مثال ایسی ہے کہ جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مابین تفرقہ اندازی کو موضوع بنایا ہے اور خدا کی زبانی اس حقیقت کا بیان کیا ہے کہ مسلمان ذاتوں اور فرقوں میں تقسیم ہیں۔ کوئی سید ہے کوئی مرزا ہے کوئی افغان ہے لیکن مسلمان کوئی نہیں۔ البتہ غریبوں میں کچھ لوگ ضرور خدا کی طرف متوجہ ہیں لیکن امیروں کو دولت کے نشے نے گم راہ کر دیا۔ مسجدوں کا یہ حال ہے کہ وہ مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی ندرہے مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ انھیں صرف باتیں بنانے کا فن آتا ہے، کچھ کر دکھانا ان کے بس میں نہیں رہا۔ بے عملی ان کا وتیرہ بن چکا ہے اس لیے ان کے اقبال کا سورج غروب ہو گیا۔ ابتدائے اسلام کی نسلوں اور موجودہ نسل کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

خودکشی شیوہ تمہارا ، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں ، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا ، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

نظم محض مسلمانوں کی زبوں حالی پہ ختم نہیں ہو جاتی۔ اُمتِ مسلمہ کو خدا کی جانب سے متنبہ کرنے کے بعد اقبال نے نظم کا رُخ موڑتے ہوئے موضوع کو اس طرح آگے بڑھایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے، لہجے میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے اور نصیحتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ دراصل یہی مطلوب و مقصود ہے۔

خدا تعالیٰ کی زبانی اقبال عہدِ نو کو ایک ایسی برق قرار دیتے ہیں جو ہر خرمن کو آتش زن کرنے کے درپے ہے۔ یہ ایسی آگ ہے جس سے صحرا ہو یا گلشن، کسی کو مفر نہیں۔ سب اس آگ کی زد میں ہیں۔ اس نئی آگ نے اپنے ایندھن کے لیے قدیم اقوام کو پسند کیا ہے اور مسلمانوں کے اسلاف کے کارناموں کو جلا کر نیست و نابود کر کے اپنے یہاں اجالا کیا ہے۔ اس اجالے سے اُمتِ مسلمہ کی آنکھیں خیرہ ہیں اور رسولِ خداؐ کی امت خود کو شعلوں میں گھرا محسوس کر رہی ہے۔ چار مصرعوں میں آگ و آتش کے اس تمثیلی بیان کے بعد اقبال کی فکر حضرتِ ابراہیمؑ کے ایمانِ کامل اور یقینِ صادق کی طرف رجوع کرتی ہے کہ نمرود کی آگ میں گھرے ہونے کے باوجود حضرتِ ابراہیمؑ کا ایمان ذرا متزلزل نہیں ہوا۔ آگ کو حکم ہوا "یٰنارُ کونی بردًا وسلامًا علیٰ ابراھیم" جس طرح وہ آگ ٹھنڈی کر دی گئی دورِ حاضر کی آگ کو بھی ٹھنڈا ہونے کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ایمان میں وہی پختگی پیدا ہو جو حضرتِ ابراہیمؑ سے خاص ہے۔

طویل سرزنش کے بعد ایمان و یقین کو محکم کرنے کی نصیحت توبہ اور اجابتِ توبہ کے در وا کرتی ہے۔ نا امیدی و مایوسی کے پردوں سے امید کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور ارشاد ہوتا ہے:

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

افق پر ابھر آئے عنابی رنگ کو نکلتے ہوئے سورج کی نشانی بتا کر اقبال نے مختلف امتوں کی کامیابی و کامرانی اور ناکامی و نامرادی کو بیک وقت ایک ہی بند میں بیان کر دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان مایوس نہ ہوں کہ دوسری امتیں بھی زوال کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ اگر بعض امتوں کو فروغ حاصل ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ امت مسلمہ کو بھی فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ ہر امت کے لیے نشیب و فراز ہیں۔ عروج و زوال ہیں۔ استعاروں کے پردے میں اقبال نے بعض امتوں کو گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ قرار دیا ہے اور بعض کو محروم ثمر۔ البتہ نخلِ اسلام برومندی کا نمونہ ہے کیوں کہ اس کی چمن بندی میں سینکڑوں برسوں کی جاں فشانی اور قربانی شامل ہے۔ اسلام کی آفاقیت اور تمام دنیا پر اس کے غالب ہونے کی خصوصیت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ اسلام جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر اخوت و انسانیت کا حقیقی پیغام پیش کرتا ہے۔ وطنیت کا محدود تصور اس کے آڑے نہیں آتا اور فلسفۂ اسلام 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' کا بلیغ تصور پیش کرتا ہے۔ اس تصور کو اقبال نے ایک مصرعے میں کس خوبی سے سمو دیا ہے:

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا

حضرت یوسفؑ کی تلمیح سے اپنی بات کے لیے دلیل فراہم کر دی ہے:

تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

مسلمان کے لیے اس کی جائے پیدائش اس کا وطن نہیں ہوتی۔ وہ جس جگہ قیام کرتا ہے وہی اس کے لیے وطن کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کنعاں میں پیدا ہونے والے یوسف کو مصر میں بھی وہی مقام اور مرتبہ حاصل ہے جو انھیں اپنے وطن میں ہوتا۔

اسلام کی عالم گیریت و آفاقیت کی طرف توجہ کرنے کے بعد اقبال اپنے عہد کے عالمی مسائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ یورش تاتار اور یورش بلغاریہ کا ذکر کر کے اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہنگامے دل آزاری کا سامان نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کے ایثار اور خودداری کا امتحان ہیں۔ ان سے ڈرنے یا پسپا ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اسلام کے دشمنوں میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ 'نورِ حق' کو بجھا سکیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے "یریدون ان یطفؤا نورَ اللّٰہ بافواھھم ویابی اللّٰہ الاّ اَنْ یُتِمَّ نورَہٗ." مذکورہ بند میں اس آیت کے پہلے حصے اور اگلے بند میں اس آیت کے دوسرے حصے کو اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ بند اہلِ اسلام کے لیے حوصلہ افزائی اور احساسِ ذمہ داری کی یاد دہانی بن گئے ہیں۔ جب کسی موقع پر مغلوبیت اپنا اثر دکھاتی ہے یا مسلمان اپنی ذمہ داری سے غفلت برتنے لگتا ہے تو قرآنی پیغام کی حامل درج ذیل دو مصرعے اس کے دل کی آگ کو دہکانے کے لیے موجود ہوتے ہیں:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کے اتمام کے لیے یہ لازم ہے کہ رسولِ خداؐ کی پیروی کی جائے۔ آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اور آپؐ کی زبانی اور عملی تعلیم و تربیت کو اپنا کر ہی فتح و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپؐ کی ذاتِ مبارک سے عشق کیا جائے۔ یہی عشق زوال کو عروج میں اور نشیب کو فراز میں بدلنے کا اعلان ثابت ہوگا:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

آں حضرتؐ کی ذاتِ مبارک سے عشق اور آپؐ کی سیرت و کردار کو اپنانے اور اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے ہی میں تمام مسائل و مصائب کا حل موجود ہے۔ مسلمانوں نے تعلیماتِ رسولؐ سے غفلت برتی تو ثریا نے انھیں زمیں پہ دے مارا۔ اگر وہ اب اپنے

زوال پر خدا سے شکوہ کناں ہیں تو اس کا واحد حل یہی ہے کہ اس راستے کو اختیار کیا جائے جس کا زبانی اور عملی روپ آں حضرتؐ کی سیرت ہے۔

رسولِ خداؐ سے اقبال کا بے پناہ عشق انھیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی زبانی کامیابی و کامرانی کی تدبیر کے اعادے کے بعد نعتِ رسول کی طرف بھی توجہ کی جائے۔ آں حضرتؐ کے اعلیٰ مرتبے کا بیان کیا جائے تاکہ دلوں میں رفعتِ شانِ مبارک کا انشراح ہو۔ چوں کہ یہ نعت خدائے بزرگ و برتر کی زبانی بیان ہوئی ہے اس لیے اس کی شان بھی منفرد اور اعلیٰ وارفع ہونی چاہیے۔ اقبال نے اگلے دو بند نعتِ رسول کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ ان میں پہلا بند اس امر کی دلیل بن کر ابھرتا ہے کہ دنیا کی تشکیل اور قیام و انصرام کی واحد وجہ آں حضرتؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ آپؐ کے سبب اس دنیا کو وجود عطا ہوا۔ آسمان و زمین کی تمام گہما گہمی، تمام رونق آپؐ کے ہی دم سے ہے :

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ باقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اگلا بند "**ورفعنالک ذکرک**" کی تفسیر ہے کہ جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں آں حضرتؐ سے ارشاد فرمایا کہ 'ہم نے تمہارا ذکر بلند کر دیا' تو اب اس بلندیِ ذکر کا تمثیلی روپ یہ ہوگا کہ مسلمان اس بات پر یقین رکھیں کہ رسولِ خدا کا ذکر جنگل، پہاڑ اور میدانوں میں ہے۔ سمندر میں اٹھنے والی پانی کی موجیں، اونچی اونچی لہریں، یہاں تک کہ طوفان بھی رسولِ خداؐ کی اسی مبارک شان کی غمازی کرتے ہیں۔ فطری جغرافیائی حدود یعنی بحر و بر سے ماورا ہو کر آنحضرتؐ کی سیرت و کردار اور تعلیمات نے انسانی جغرافیائی

حدود یعنی چین اور مراقش تک بھی رسائی حاصل کی ہے۔ اس مبارک ذکر نے جتنی وسعت خارجی طور پر اختیار کی ہے اتنی ہی وسعت اور گہرائی باطنی طور پر بھی حاصل کی ہے کہ یہی وہ ذاتِ بابرکت ہے جس نے مسلمان کے دلوں میں ایمان کو پختہ کیا ہے۔ یہ ذکر اور اس ذکر کی وسعت وقتی یا عارضی نہیں ہے بلکہ ابد تک یہی سلسلہ جاری رہنے والا ہے۔ اقبال نے اس میں ''ورفعنالک ذکرک'' کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کا ایک عملی روپ یہ بھی ہے کہ ہر اذان میں جہاں اللہ تعالیٰ کے معبود واحد ہونے کی گواہی دی جاتی ہے وہیں محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی بھی شامل ہے۔ دن بھر میں پانچ مرتبہ یہ ذکر تمام خطوں میں بلندی اختیار کرتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق دنیا میں طلوع اور غروب آفتاب کا سلسلہ اور دن اور رات کے بننے کا عمل کچھ اس طور پر جاری ہے کہ 24 گھنٹے کے ہر لمحے دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اذان کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ یعنی 24 گھنٹے میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جو اذان کی آواز سے خالی ہو۔ اذان کے ساتھ ساتھ اقامۃ میں بھی آں حضرت ﷺ کی ذاتِ مبارک کا ذکر بلند ہوتا ہے اور پھر نماز کی تکمیل کے وقت التحیات میں اشھدان لاالٰہ الااللہ کے ساتھ ساتھ اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہٗ کا ذکر بھی ایمان کو تقویت عطا کرتا ہے۔ گویا یہ سب ورفعنالک ذکرک کے مظاہر ہیں۔ جوابِ شکوہ کا بند دیکھیے:

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنا لک ذکرک دیکھے

''جوابِ شکوہ'' کا آخری بند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کچھ اس طرح آشکار

ہوتا ہے کہ اقبال اس میں عقل و عشق اور تقدیر و تدبیر سے متعلق اپنے تصورات کو بھی اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں۔ شکوہ اور شکایتوں کو دور کرنے کا راز اگر ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اپنانے میں ہے تو دوسری طرف خدا تعالیٰ نے انسانوں کو ایسے اوصاف سے متصف کیا ہے جن کا مناسب استعمال ان کی کامرانی کی ضمانت ہے۔ چنان چہ اقبال عقل کو سپر اور عشق کو شمشیر قرار دے کر اعلان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی خلافت تمام دنیا کے لیے ہے۔ یہاں خدا کی زبانی مسلمانوں کو اقبال نے درویش کہلوایا ہے کہ مال و متاع سے بے نیاز ہو کر ہی تمام نیاز مندیاں حاصل ہوتی ہیں۔ بند کے چوتھے مصرعے 'تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری' کہہ کر اگلے دو مصرعوں میں ہونے والے عظیم اعلان کی تمہید باندھی گئی ہے کہ اگر اسلام کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو مسلمان کی ہر تدبیر اس کا مقدر بن جائے گی۔ یعنی وہی کچھ ہوگا جو وہ چاہے گا۔ دنیا کے تمام مصائب و مسائل دم توڑ دیں گے اور صرف اسی دنیا میں نہیں اس دنیا میں بھی کامرانی قدم چومے گی:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

نظم کے لیے اقبال نے مسدس کی ہیئت استعمال کی ہے۔ حالاں کہ اقبال عام طور پر اپنی نظموں کے لیے ترکیب بند کا انتخاب کرتے ہیں کیوں کہ اس کا انداز بڑی حد تک غزل کا سا ہوتا ہے لیکن مذکورہ نظم کا موضوع شاعر کی دلی کیفیات اور جذبات کے اظہار کے لیے زیادہ آزادی چاہتا ہے اور اس کے لیے زیادہ موزوں مسدس کی ہیئت تھی۔ بہت سے شکوے کیے گئے تھے اور ہر ایک کا جواب دینا تھا۔ جیسے سوال بہت تھے ایسے ہی جوابوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اس کے لیے متواتر یونٹوں کی ضرورت تھی۔ چھ مصرعوں پر مشتمل مسدس کا بند کسی خیال یا تجربے کو ادا کرنے کے لیے ایک موزوں یونٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنان چہ اقبال نے اس مناسبت سے مسدس کا انتخاب کیا اور اس ہیئت کے وقار میں بھی اضافہ کیا۔

چوں کہ یہ نظم ایک طویل مکالمہ ہے اس لیے بول چال کی زبان اور عام فہم طرزِ گفتگو ہر جگہ نظر آتی ہے۔ خطابت کا عنصر سب جگہ نمایاں ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

.....

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا

.....

تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

نظم کے بند چھ چھ مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ ہر بند ایک نئی بات، ایک نیا پہلو لے کر نمودار ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر بند کی اپنی منفرد شناخت ہے۔ نظم کے تمام بند پوری طرح مربوط ہونے کے باوجود ہر ایک بند غزل کے اشعار کی طرح خود مکتفی بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بند بلکہ مصرعے بالخصوص ہر بند کے ابتدائی چار مصرعے ایسی فکر انگیز انفرادیت کے حامل ہیں کہ ہر مصرع اپنے مفہوم کو مکمل طور پر بیان کر دیتا ہے۔ گویا نظم کا ہر مصرع بھی خود مکتفی ہے۔ پھر مصرعوں کی روانی اور ان میں زیریں لہر کے طور پر موجود زورِ بیان قاری کے ذہن پہ ایسے نقوش ثبت کرتا ہے کہ یہ مصرعے اس کے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے شکوے کے بہت سے بند اور بہت سے مصرعے زبان زد ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ چند مصرعے دیکھیے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

.....

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

.....

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی

.....

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے

.....

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا

ہر بند کے آخری دو مصرعے چوں کہ تاکیدی یا نتیجہ خیز بیان کے حامل ہیں اس لیے یہ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ مربوط ہیں۔ ان میں معنی کا ارتباط اس قدر ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا آسان نہیں۔ ان میں وہی کیفیت ہے جو غزل کے شعر میں پائی جاتی ہے۔ کچھ بند کے آخری دو مصرعے دیکھیے :

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

.....

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

.....

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

.....

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

.....

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

.....

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

.....

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

.....

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

مسدس کے آخری دو مصرعوں میں غزل کے اشعار کی سی شان نے ان مصرعوں کو بھی ضرب المثل بنا دیا ہے۔ نظم میں تشبیہات، استعارات اور تلمیحات ایسی بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ وارد ہوتی ہیں کہ ایک رو میں قلب و نظر انھیں قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ نگاہ آگے کا سفر جاری رکھتی ہے اور ذہن معنی کی جستجو میں جلد جلد آگے بڑھتا رہتا ہے اور اقبال کی فکر قاری کی فکر کا حصہ بنتی رہتی ہے۔ اس عمل میں کوئی تشبیہ، کوئی استعارہ، کوئی تلمیح مانع نہیں آتی۔ نظم کو اپنی فکر کا حصہ بنا لینے کے بعد جب اس کے لفظی اور معنوی حسن کی طرف الگ سے توجہ کی جاتی ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا فن اپنے ساتھ کتنی نئی تشبیہیں، استعارے اور تلمیحات لے کر نمودار ہوا ہے۔ از سرِ نو غور و فکر کے بعد جو گوہر نایاب دستیاب ہوتے ہیں وہ ہماری حیرتوں میں اضافے کا باعث ہیں۔ نظم کے فنی محاسن کی جستجو یہ باور کراتی ہے کہ یہاں رعایت لفظی ہے اور مراعات النظیر بھی۔ تضاد ہے اور لف و نشر بھی۔ استعارہ ہے اور علامت بھی۔ ایک بند کے یہ دو مصرعے دیکھیے:

وہ بھی دن تھے کہ مایۂ رعنائی تھا
نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا

'لالۂ صحرائی' صحرائے عرب کے ان مسلمانوں کا استعارہ ہے جنھوں نے احکام خداوندی کی تعمیل میں اپنی زندگی وقف کی اور ان کی شخصیت لالے کے پھول کی طرح دور سے اپنی طرف متوجہ کرنے والی، سکون بخشنے والی اور عزم و حوصلہ فراہم کرنے والی ہے۔ اس مصرعے میں موسم گل اسلام کے عہد عروج کا استعارہ ہے کہ انھیں شخصیات کے سبب اسلام کو ساری دنیا میں عزت و وقار حاصل ہوا۔ یہی لالۂ صحرائی مایۂ رعنائی بھی تھے۔ ایک اور بند کے آخری دو مصرعے دیکھیے:

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

یہ دو مصرعے لف و نشر مرتب کی مثال ہیں۔ یہاں قوم کی مناسبت سے جذب باہم اور مذہب کی مناسبت سے محفل انجم کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح ستاروں کی محفل ستاروں کے مابین باہمی یگانگت سے پروان چڑھتی ہے اسی طرح قوم کے لیے مذہب کی حیثیت ہے کہ یہی ہر فرد کو ایک دوسرے کا احترام سکھاتا ہے اور اسی سے قوم وجود میں آتی اور ترقی کرتی ہے۔ اپنی نظم ''بزم انجم'' میں بھی اقبال نے اسی جانب اشارہ کیا ہے:

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے انفرادی مفادات سے بالاتر ہو کر خود کو قومی مفادات کے لیے وقف کر دے۔ اسی سے قوم کے مابین اتحاد اور یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ اپنے اس پیغام کو اقبال نے کئی دوسرے مواقع پر مختلف تشبیہوں کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ نظم ''شمع اور شاعر'' کا یہ شعر اس ضمن میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کے کلام میں مرکب تشبیہات کے ظہور میں بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ اس طرح کے اشعار پڑھ کر قاری معنوی حسن کے اثرات پہلے قبول کرتا ہے اور بعد میں غور و فکر اسے شعر کے خارجی حسن کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یوں بھی ہے کہ اقبال کے کلام میں معنوی اور خارجی حسن باہم ایسے مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں عمومی طور پر جدا کر کے دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ قاری بیک وقت دونوں محاسن سے متاثر ہوتا ہے اور اقبال کے فکر و فن کو ایک اکائی محسوس کرتا ہے۔ جواب شکوہ میں جب اقبال اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے

سے اور اگلے مصرعے میں اپنی بات کی دلیل کے لیے یہ کہتے ہیں 'نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے' تو قاری شعر کی بے ساختگی کے باعث یہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ یہاں اقبال نے ایران کے مٹ جانے اور پیمانے کے ٹوٹ جانے میں ایک تشبیہی تعلق پیدا کیا ہے۔ اس بات کو زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ پیمانہ اگر ٹوٹ جائے تو مے کے نشے پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی سرمستی برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح اگر ایران مٹ جائے تو مسلمان ختم ہوگا نہ اس کا ایمان۔ یہ دونوں نشۂ مے کی مانند ہمیشہ موجود رہیں گے۔

ایک اور بند میں اقبال نے مسلمانوں کو غنچے میں قید خوشبو قرار دیا ہے اور ہوائے چمنستاں میں یعنی اس جہانِ مکافات میں بکھرنے اور پھیل جانے کا مشورہ دیا ہے۔ اگلے مصرعے میں مسلمانوں کو تنگ مایہ اور ذرّہ قرار دیا ہے اور ان کے بیاباں بن جانے کی خواہش کی ہے۔ اس سے اگلے مصرعے میں انھیں نغمۂ موج کہا ہے اور ہنگامۂ طوفاں کی شکل اختیار کرنے کی صلاح دی ہے۔ ذرے کا بیاباں ہونا اور نغمۂ موج کا ہنگامۂ طوفاں ہونا دراصل معمولی سے انتہائی غیر معمولی اور مغلوبیت سے اُٹھ کر غالب ہو جانے کی جانب اشارہ ہے۔

اشاروں، علامتوں اور مختلف شعری لوازمات سے آراستہ اقبال کی نظمیں موضوع اور فن پر دو اعتبار سے اردو ادب میں اضافے کا باعث ہیں۔ ''جوابِ شکوہ'' میں بھی یہی خصوصیت کارفرما ہے۔

❖❖❖

ڈاکٹر ابوبکر عباد (نئی دہلی)

مغربی افکار و تصور اور اقبال

علامہ اقبال عظیم شاعر تھے، بڑے فلسفی تھے، اہم سیاست داں تھے اور حکیم الامت تھے کہ ان کی انگلیاں امت کی نبض پر تھیں۔ وہ امت کے امراض سے آگاہ تھے اور علاج کے لیے نسخۂ کیمیا کا علم بھی رکھتے تھے۔ لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عاشق مشرق تھے لیکن مغرب سے مرعوب تھے، کہ مغربی فلسفے انھیں راس آتے تھے اور وہ مغربی مفکرین کے خوشہ چیں تھے۔ پر کیا کیجیے گا کہ ان ہی کے اشعار سے انھیں مارکسسٹ بھی ثابت کیا جا چکا ہے اور اسلام پسند بھی، ان کے اشعار کے حوالے سے ان کی فکر کو وطنیت اور قومیت تک محدود سمجھا گیا ہے اور ان ہی اشعار کی بنا پر انھیں عالم انسانیت کا علم بردار بھی قرار دیا گیا اور یہ بھی تو ہے کہ ان کے خطبات کو بعض لوگوں نے دنیا کی بہترین کلاسک میں شمار کیا تو چند حضرات نے سمجھ میں نہ آنے والی کتاب بھی کہا ہے۔ اس کا انحصار تو دراصل دیکھنے والوں کی نظر اور سوچنے والوں کی فہم پر ہے۔

کیوں نہ ان بہت سے موضوعات اور ان کے متعدد پہلوؤں پر بحث کے بجائے مغربی افکار و تہذیب کے تئیں علامہ کے ذہنی رویے سے گفتگو کی جائے۔ یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال بعض مغربی مفکرین سے حد درجہ متاثر تھے لیکن مغربی تمدن سے مطمئن نہ تھے۔ وہ مغربی سائنس اور علوم کے قائل تھے لیکن مغربی تہذیب کے حامی نہ تھے۔ وہ مغرب کے نظام سوچ و فکر کے دل دادہ تھے لیکن اس سے اخذ شدہ نتائج کو من و عن قبول کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مغرب کی روشن ضمیری اور وسیع القلبی کے قائل تو تھے لیکن مغربی جمہوریت اور وہاں کے سرمایہ دارانہ نظام سے سخت نالاں تھے۔ ہمارے یہاں سرسید پہلے دانش ور تھے جنھوں نے مغربی فکر اور وہاں کی تہذیب کو خوش آمدید کہا اور ان کی پیروی کو ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کا ضامن بتایا۔ دوسری طرف اکبر الہ آبادی تھے جنھوں نے غالباً سرسید کے ردِ عمل میں مغربی فکر و تہذیب کو یک قلم مسترد کر دیا۔ لیکن اقبال نے نہ تو سرسید کی طرح مغرب سے درآمد شدہ تہذیب و افکار پر آمنا و صدقنا کہا، اور نہ اکبر الہ آبادی کی طرح ان پر لاحول بھیجی۔ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن اور نظریات و افکار کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ انتہائی متانت اور بردباری سے ان پر غور کیا اور بڑے ہی توازن و اعتدال کے ساتھ ان پر اپنی رائے قائم کی۔ انھوں نے بعض نظریوں کو رد کیا، بعض کو ترمیم کے ساتھ قبول کیا، بعض کی تائید کی، بعض کی بنیاد پر اپنی فکر قائم کی اور بعض مغربی نظریوں کو مشرقی الاصل قرار دیا۔ مشرقی نظریوں کے سلسلے میں بھی ان کا طریقۂ کار اس سے مختلف نہ تھا، چنان چہ وہ اگر ایک طرف علم و عقل پر الہام و وجدان کو ترجیح دینے والے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی پیروی کرتے اور اپنے مرشد معنوی مولانا جلال الدین رومی کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتے ہیں تو شیخ محی الدین ابن العربی کے نظریے وحدۃ الوجود کی سخت مخالفت کر کے حافظ شیرازی کی شاعرانہ فکر کو زک پہنچاتے ہیں اور بہت سے صوفیا کی ناراضگی بھی مول لیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال گوئٹے سے حد درجہ متاثر تھے کہ اقبال کے نزدیک باریک بینی، رموز عشق سے آگہی اور کمال فن کاری

میں گوئٹے کا کوئی ثانی نہ تھا۔ گوئٹے مغرب کی زر پرستی، روحانی افلاس اور آپسی رنجشوں کو ناپسند کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ مغرب مشرق سے سادگی، روحانیت اور امن کی فضا مستعار لے لے۔ اقبال گوئٹے پر محض اس لیے فریفتہ نہیں ہیں کہ وہ ایک بڑا فن کار تھا اور مغرب کی لعنتوں کو برا سمجھتا تھا، گوئٹے سے اقبال کی عقیدت کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مشرق کا دل دادہ تھا، اسلام کا گرویدہ تھا اور رسول اکرم کا عقیدت مند تھا۔ اسے اسلام کی یہ ادا بے حد پسند تھی کہ مسلمان اپنی مرضی کو رضائے الٰہی کے تابع کر دیتا ہے۔ وہ قرآن حکیم کو عظیم صحیفہ مانتا تھا اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کو قرآن کا دل کہا کرتا تھا۔ علامہ اقبال نے گوئٹے کے خیالات و نظریات سے متاثر ہو کر ہی کہا تھا: ''نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب''

اقبال مغرب کے جس دوسرے بڑے فلسفی سے متاثر تھے وہ ہے نیتشے۔ نیتشے کا قوت کا فلسفہ اور سپرمین کا نظریہ پوری دنیا بالخصوص یوروپ والوں کو حد درجہ پر کشش معلوم ہوا۔ بلاشبہ اس کے فلسفے کو ہم خودی کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں کہ خودی نام ہے اپنی ذات کی شناخت اور اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہو کر دنیا کو تسخیر کرنے کا، اور اس سے بھلا ہم کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ اقبال کی شہرت کی ایک بڑی وجہ ان کی خودی کا فلسفہ بھی ہے۔ گو کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو نیتشے کے فلسفے کی فوٹو کاپی نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اقبال نے نیتشے کے فلسفے سے استفادہ کیا ہے۔ دونوں کے فلسفۂ خودی میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ نیتشے اپنی خودی کے حوالے سے مذہب کو انسان کی کم زوری قرار دیتا تھا۔ خدا کو دنیوی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تسلیم کرتا تھا چنان چہ اس نے اعلان کیا کہ ''خدا مر گیا ہے'' جب کہ اقبال کے فلسفۂ خودی میں خدا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور مذہب ذہن کی مثبت تربیت کرتا ہے چنان چہ انسان کا سر اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کے وجودی قوت کے آگے نہیں بلکہ خدا کے سامنے ہی جھکتا ہے۔ اسی طرح نیتشے کے سپرمین اور اقبال کے مرد کامل میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ نیتشے کا

سپرمین تمام اخلاقی قیود سے آزاد اور خودسر ہے جب کہ اقبال کا مردِ کامل خدا کا مطیع و فرماں بردار اور اخلاقی ضابطوں کا پابند ہے۔

ظاہر ہے مشرق و مغرب کے ان دونوں مفکروں کے تصورات کی تشکیل میں ان کی ملکی روایات، مذہبی تربیت، ذہنی ساخت ان کے علمی، ادبی سیاسی اور گھریلو ماحول اور ان حضرات کی ذاتی شخصیتوں کے عناصر کارفرما رہے ہیں۔ کہ نیتشے مغربی روش کو پسند کرتا تھا۔ عیسائیت سے متنفر تھا، مذہب کو انسان کی کم زوری جانتا تھا اور خدا کی موت کا اعلان کر چکا تھا۔ جب کہ اقبال مشرق کی روحانیت کے دل دادہ تھے، اور اسلام کے پرستار، مذہب کو انسان کی طاقت سمجھتے تھے اور خدا کے ابدالآباد ہونے کا اقرار کرتے تھے۔ ہاں قوت اور تحرک و عمل سے متعلق دونوں کے نظریات یکساں ہیں۔ نیتشے موت کو کم زوری کا نتیجہ کہتا تھا، اقبال کہتے ہیں: ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔ نیتشے کے نظام فکر میں سعی و عمل کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، اقبال بھی جہد و عمل کو انسانی زندگی میں مرکزی مقام عطا کرتے ہیں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبال اپنے ہم عصر جرمن فلسفی، برگساں کی شخصیت سے بھی متاثر تھے اور برگساں کے وقت اور عقل کے نظریات اور اقبال کا وقت اور عقل کا تصور کچھ نازک امتیازات کے ساتھ ایک جیسے ہیں مثلاً نیوٹن یا دوسرے مفکرین کے برعکس برگساں زمانے کی تقسیم کا انکار کرتے ہیں وہ زمانے کو ماضی، حال اور مستقبل میں بانٹنے کے بجائے ایک مسلسل حرکت مانتے ہیں جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ وسط اور نہ انجام، البتہ وہ مسلسل بہہ رہے وقت کے دھارے میں ہر لمحہ تبدیلی کے قائل ہیں۔ اقبال بھی تو وقت کے تعلق سے یہی کہتے ہیں:

بڑی تیز جولاں، بڑی زود رس
ازل سے ابد تک دمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دنوں کے الٹ پھیر کا نام ہے

(بال جبریل)

تاہم دونوں کے نظریے میں فرق یہ ہے کہ برگساں کے مطابق ہر لمحے ارتقا پذیر کائنات کی اساس حرکت پر ہے اور یہ حرکت اور کائنات کا ارتقا بے ارادہ اور بے مقصد ہے، یہ حرکت و ارتقا نہ تو کسی نظام کے تحت ہے اور نہ کسی کے زیر فرمان۔ یعنی برگساں کے نظریے اور حرکت و ارتقا کے اصول میں خدا کی کوئی جگہ نہیں ہے جب کہ اقبال کے نظام فکر میں یہ حرکت و ارتقا نہ تو بلا ارادہ ہے نہ بے مقصد، اور یہ کہ حرکت و ارتقا قدرت کے نظام اور خدائے تعالیٰ کے زیر فرمان ہے۔ اس واقعے سے ادب کے بیش تر طالب علم واقف ہوں گے کہ جب فرانس میں اقبال برگساں سے ملنے گئے تو دوران گفتگو اقبال نے انھیں یہ حدیث قدسی سنائی "**الدھر و انا الدھر**"، زمانے کو گالی مت دو، کہ میں ہی زمانہ ہوں۔ یہ سن کر برگساں اچھل پڑا حیرت سے پوچھا، کس نے کہی یہ بات؟ کب کہی؟ اور جب حقیقت سے آگاہی ہوئی تو اس نے کہا جس نتیجے پر میں آج تک نہ پہنچ سکا اسلام وہاں صدیوں پہلے پہنچ گیا تھا۔ برگساں کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ عقل کے ذریعے کسی شے کی حقیقت کو سمجھ لینا ممکن نہیں ہے کہ عقل انسانی ناقص ہے صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر ہے اور حقیقت کے ادراک میں ناکام ہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے اس کی بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ لکھتے ہیں: ''ایک ہی عقل ہے جو خدا کے وجود کے خلاف دس دلیلیں پیش کرتی ہے اور یہی عقل اس کے وجود کے بیس ثبوت فراہم کر دیتی ہے۔'' چنان چہ اقبال جب لینن کو خدا کے حضور میں پیش کرتے ہیں تو لینن رب العزت کے سامنے اپنی بات یوں رکھتا ہے:

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے، یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے، خرد کے نظریات

ہاں اقبال اور برگساں دونوں اس بات پر متفق تھے کہ جہاں عقل کی رسائی ممکن نہیں وہاں وجدان و الہام کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے کہ اقبال انسان کو محض عقل کا پتلا نہیں، کچھ اور بھی سمجھتے ہیں:

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی چاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

جہاں تک مغربی تہذیب وتمدن سے اقبال کا تعلق ہے تو بیش تر صورتوں میں اس کی بنیاد ناپسندیدگی اور نفی و تردید پر ہے۔ وہ مشرقی اقوام اور ملت اسلامیہ کے امراض میں مبتلا ہونے کا ایک بڑا سبب خودی کی موت اور مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوبیت کو قرار دیتے ہیں۔ اپنے تمام شعری اور نثری تحریروں میں اقبال نے مغربی تمدن، مغربی فکر اور مغربی استعمار کے حربوں کو جس کمال بصیرت اور فنی حسن کے ساتھ صراحت کی ہے وہ صرف اردو اور فارسی میں ہی نہیں عالمی ادب میں بھی لائق امتیاز و افتخار ہے۔ اس حوالے سے ''پیامِ مشرق''، ''زبورِ عجم''، ''بالِ جبریل''، جاوید نامہ، ''ضربِ کلیم'' اور مثنوی ''پس چہ باید کرد'' بطور خاص لائق مطالعہ ہیں۔ اقبال اپنے قیام یورپ (1907ء) میں ہی لکھتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

بلکہ وہ تو مغربی تہذیب کے قریب مرگ ہونے کی بھی پیشن گوئی کرتے ہیں:

زندہ کرسکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر
یہ فرنگی مدنیت، کہ جو ہے خود لب گور

مغربی تہذیب سے متعلق علامہ کے خیالات ''زبورِ عجم'' کے ان اشعار میں ملاحظہ فرمایئے:

فریاد ز افرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

علامہ نے ''جاوید نامہ'' کے طاسین مسیح میں حکیم طالسطائی کا ایک خواب بیان کیا ہے جس میں مغربی تہذیب کو ایک نسائی پیکر میں دکھایا ہے۔ اس پیکر سے پہلے اقبال نے حضرت عیسیٰ کے ایک نوجوان حواری کو بھی پیش کیا ہے جو حضرت عیسیٰ سے غداری کر کے روم کے حاکم فلاطوس کا حامی بن گیا تھا۔ غداری کی سزا کے طور پر اس نوجوان کو جوئے سیماب میں کمر تک غرق دکھایا گیا ہے۔ اس موقع پر وہ نسائی پیکر جسے اقبال نے افرنگیں کا تمثیلی نام دیا ہے نوجوان کو طعنے دیتی ہے۔ جس کے جواب میں نوجوان غصے اور طنزیہ لہجے میں یوں وار کرتا ہے:

''اے ریاکار گندم نما جو فروش افرنگیں! تیرے ہاتھوں شیخ و برہمن ملت فروش ہو گئے۔ تیری کافری نے عقل و دیں دونوں کو خوار کر دیا۔ تری سوداگری سے عشق کو ذلت ملی۔ تیری محبت سوائے آزار کے کچھ نہیں۔ تیرا کینہ موت ہے اور موت بھی وہ جسے مرگ ناگہاں کہا جائے۔ تو نے آب و گل کی صحبت کیا اختیار کی، بندے کو حق کے سامنے سے چھین کر اسے عبدیت سے محروم کر دیا۔ تیری حکمت و دانش نے جو عقدے کھولے، اس نے تجھے فکر چنگیزی کے سوا کچھ نہ دیا۔ تیرے ہاتھوں وجود انسانی، روح کا قبرستان بن گیا ہے۔ تیری موت اہل جہاں کے لیے پیام زندگی ہے۔''

(ترجمہ، ڈاکٹر تحسین فراقی بہ اقبال چند نئے مباحث لاہور، ص 101)

ظاہر ہے نسائی پیکر مغربی تہذیب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے غداری کر کے شہنشاہِ روم کا حامی بن جانے والا نوجوان ایشیائی اقوام اور ملت اسلامیہ کی تمثیل ہے۔

جمہوریت سے متعلق اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار نثر میں بھی کیا ہے اور نظم میں بھی۔ ان کا یہ شعر تو زبان زدِ خاص و عام ہے:

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
لوگوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ان کی مشہور نظم ''خضرِ راہ'' میں جمہوریت سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری!

افغانستان اور عراق میں جمہوریت کے نام پر مغرب نے جو کچھ کیا یا کر رہا ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں کہ مغرب کی قائم کی ہوئی جمہوریت میں نہ صرف نظامت و معیشت تباہ ہوئی بلکہ ڈکٹیٹرشپ اور مذہبی شدت پسند حکومت سے سینکڑوں گنا زیادہ انسانی لہو بہایا گیا، جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

مغربی فکر و تہذیب نے تیسری دنیا کے غریب اقوام کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور انھیں کیسے کیسے فریب دیے ان سب پر اقبال کی گہری نظر تھی جسے انھوں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ مغربی سیاست غلاموں کی غلامی کو اور بدتر بنا دیتی ہے اور شہنشاہیت کے چہرے پر نقاب ڈال کر اسے جمہوریت کے دل فریب اور مسحور کن روپ میں ظاہر کرتی ہے۔ وہ پنجرے میں قید پنچھی کو آزادی دلانے کی بجائے

یہ باور کراتی ہے کہ سبزہ زار اور جنگل میں آشیاں بنانا بے حد خطرناک ہے کہ شاہین و شہباز ان کی جان کے دشمن ہیں، سو بہتر ہے کہ صیاد کے پنجرے میں ہی گھر بنالو۔ اب مثنوی ''پس چہ باید کرد'' میں، سیاسیات حاضرہ، کے عنوان سے پیش کیے گئے حصے کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

گفت با مرغ قفس اے درد مند
آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ
او نباشد ایمن از شاہین و چرغ

مغربی تمدن نے اہل مشرق اور مسلمانوں سے کیا کیا چیزیں لیں اور بدلے میں انھیں کیا کچھ دیا یہ سب کو معلوم ہے اور یہیں سے مغرب اور مشرق کی تہذیبی کش مکش کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اقبال کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمایئے جو ضرب کلیم میں ''یورپ اور سوریا'' کے عنوان سے درج ہے:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
نبیِ عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے
مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری!

ظاہر ہے یہ قطعہ سوریا سے مخصوص ہے لیکن اس کا اطلاق ان تمام ممالک اور اقوام پر ہوتا ہے جو آج بھی مغرب کی ذہنی یا جسمانی غلامی میں مبتلا ہیں۔ شاید ہی مشرق کا کوئی ملک ہو جہاں جوئے، شراب اور زنان بازاری کی لعنت عام کرنے میں مغرب کامیاب نہ ہوا ہو، اور جہاں یہ لعنت اب تک نہ پہنچ سکی اس کے لیے مغرب نہ صرف یہ سوچ کر پریشان ہے کہ ایسے چند ایک ممالک اب تک غیر مہذب ہیں بلکہ انھیں اپنی طرح مہذب بنانے کے مختلف حیلے بھی تلاش کر چکے ہیں عالمی اور ملکی سطح پر اور اب کالج

اور یونیورسٹیوں کی سطح پر بھی حسن کے مقابلے، فیشن ٹی وی، ٹرینڈز ٹی وی، زی کیفے اور وی چینل کے پروگرامز اور انٹرنیٹ پر فحاشی کا سیلاب وغیرہ تو محض ذہن سازی کے حربے ہیں، اب تو اشیائے خوردنی کی مانند اشیائے ہوس بھی ہوم ڈلیوری کی طرح رائج ہو چکی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان چیزوں کے منکر ممالک کو عوام کی ذہنی اور شخصی آزادی کا فریب دے کر اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب و معاشرت اپنائیں، جو محبت اور آزادی کا درس دیتی۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ جب محبت صرف جنسی ہوس، جنگ علاقے ہتھیانے کی بھوک اور عوامی آزادی کے نام پر حکومتوں کی تبدیلی معاشی لوٹ کا دوسرا نام بن جائے تو یہی ہوتا ہے۔ بالی کے نائٹ کلب میں بم دھماکے کا معاملہ ہو، افغانستان کی زبردست مزاحمت ہو، فلسطین کی تحریک انتفاضہ ہو، ہندوستان میں بیئر بار میں ہنگامے کا معاملہ ہو یا مہاراشٹرا میں ویلنٹائن ڈے پر توڑ پھوڑ کا واقعہ ہو یا پھر بدلتی ہوئی صورت حال دیکھ کر بعض عرب ممالک کے عوام کی شدید بے چینی اور وقتاً فوقتاً پرتشدد انداز میں اس کا اظہار، یہ سب دراصل مغربی باشندوں کے تئیں غصے کا نہیں مغربی تہذیب اور مغربی فریب کے خلاف نفرت کا اظہار یا ردعمل ہے۔

2008ء میں بیشتر اخبار میں نمایاں طور پر خبر شائع ہوئی تھی کہ عرب لیگ نے ایسے تمام چینلوں کو اپنے یہاں بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو جوئے، شراب اور سیمیں بدن حسیناؤں سے محظوظ ہونے یا اپنے یہاں اس طرح کا ماحول Create کرنے کی ترغیب یا کہیے کہ گھر گھر جا کر دعوتِ ہوس دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے تمام ممالک یا اقوام جو مغربی تہذیب و تمدن کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ ان کی نظروں میں غیر مہذب ہیں اور مغرب انھیں تہذیب یافتہ بنانا اپنی ذمے داری سمجھتا ہے۔ اب اقبال کی نظم ''انتساب'' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری

جہاں قمار نہیں ، زن ننگ لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقۂ اب وجد سے نہیں ہے بے زاری
جسو رو زیرک و پُر دم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتیب کا چشمۂ جاری
نظرورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

استعماری حیلوں کے علاوہ، مغرب کی نظر کو خیرہ کرنے والی ظاہری چمک، مغرب کی جارحانہ قوم پرستی اور مادہ پرستی کے تمام تر مظاہر کی اقبال نے زوردار مخالفت کی ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اقبال نے مغرب کو یک قلم رد نہیں کیا ہے، بلکہ ایک وسیع القلب، حقیقت پسند، منصف مزاج اور سچے دانش ور کی طرح مغربی تہذیب وتمدن کے بعض مثبت پہلوؤں کو سراہا اور انھیں قابل تقلید بھی بتایا ہے، کہ وہ مشرق کی بعض کم زوریوں کی طرح مغرب کی خامیوں کو بھی دور کر کے ایک خوب صورت دنیا کی تعمیر چاہتے تھے:

مشرق سے ہو بے زار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کی فکر اور اس کے نتیجے میں تخلیق ہونے والی ان کی شاعری اور نثری خطبات کا مقصد یہ ہے کہ قوم بے دار ہو، بھلے برے میں تمیز کر سکے، محکومی سے نجات حاصل کرے، دنیا میں عزت کے مقام پر فائز ہو اور اپنی تعمیر نو کے بعد دنیا کی بھی تعمیر نو کرے۔

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ
معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

❖❖❖

ڈاکٹر محمد کاظم (نئی دہلی)

فنونِ لطیفہ اور اقبال

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

مندرجہ بالا اشعار سے ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ اقبال فنونِ لطیفہ سے متعلق کیا سوچتے ہیں اور ان کی نظر میں فنونِ لطیفہ کے کیا معنی ہیں۔ ان ہی اشعار میں انھوں نے فنونِ لطیفہ سے متعلق کئی اہم لوازم کا ذکر کیا ہے۔ رنگ، خشت، سنگ، چنگ، حرف و صوت، صدا، سرور اور سرود اس کی غماز ہے کہ انھیں فنونِ لطیفہ کا نہ صرف علم تھا بلکہ وہ اس کی قوت و اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اچھا ہنر وہی ہوتا ہے جس سے قوم و ملت کے قلوب استوار ہوں اور جو قوموں کا رخ انحطاط سے عروج کی طرف موڑ دے۔

انسان کے دلوں میں مثبت حرکت پیدا کرے نہ کہ صرف تفریح فراہم کرے۔ اس جانب خود اقبال نے اپنی ایک مختصر نظم "فنونِ لطیفہ" جو صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے میں اشارہ کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
ہے معجزہ دنیا میں ابھرتی ہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ہم سب واقف ہیں کہ آرٹ کسی بھی قوم کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نظر میں ایک سنجیدہ فن کی ہے۔ ان کی نظر میں فن کار نسلِ انسانی کا معلم اور انقلاب کا نقیب ہوتا ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کو صرف تفریح و تسلی اور سستی افادیت کے لیے استعمال کرنے کے خلاف ہیں۔ اقبال آرٹ سے انسانی خودی اور اس کی شخصیت کی تعمیر کا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ مظاہر و مناظر میں مقید رہنے کے بجائے فنونِ لطیفہ کو دلوں تک پہنچنے کا راستہ بنانا چاہیے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ فن کار کا پہلا فرض ہے کہ:

"اپنی خودی، اپنے اندرون اور اپنے حقیقی یا روحانی وجود کا اثبات کرے اس لیے کہ اظہارِ 'انا' اور اثباتِ وجودی سے 'بقائے دوام' بھی ملتی [ملتا] ہے..... فن کار کو

اپنی ذات سے چل کر کائنات تک پہنچنا چاہیے اور کثرت میں وحدت، جلوت میں خلوت اور اجتماعی بے خودی میں انفرادی خودی کا دامن ہاتھ سے نہ دینا چاہیے، اس لیے کہ یہ مادی کائنات مٹی کی طرح ہر شے کو جذب اور ہضم کر لینا چاہتی ہے۔ چنانچہ ادب اور فن کے وہی شاہکار دوامی اور حقیقی کہے جا سکتے ہیں جن میں مادیت سے روحانیت کی طرف گریز اور مادیت پر فتح مندی ملتی ہو ..... فن کار کو حسن کے امکانات کا سراغ اپنے ہی اندر لگانا چاہیے نہ کہ خارجی اور ظاہری جمالیات کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہیے۔"

(مولوی شمس تبریز خاں، "نقوش اقبال" ص 88)

اس جانب اقبال نے اپنی مختصر نظم 'دین و ہنر' میں کیا خوب اشارہ کیا ہے:

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بے گانہ

اوپر جو اشعار پیش کیے گئے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال نے فنون لطیفہ سے متعلق جو نظریے پیش کیے ہیں وہ فن کو فن کے اصول کے تحت دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے اپنے اصول وضع کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ فنون لطیفہ اور اس کے تفاعل اور مطمح نظر کے اظہار کے لیے اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جن Objects اور خارجی پیکروں کو استعمال کیا ہے ان میں سے زیادہ تر کا تعلق اسلام اور اسلامی ثقافت

سے ہے جس کی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ وہ فن کی اہمیت کے منکر اور اس کی افادیت کے غلو آمیز حد تک مبلغ ہیں۔ لیکن جب ہم ہندوستانی ادبیات میں ٹیگور کے فن میں کم و بیش ایسی ہی صورت حال ہندو مصادر اور ہندو ثقافت سے متعلق علائم کی موجودگی کی شکل میں دیکھتے ہیں تو یہ خیال بار بار پیدا ہوتا ہے کہ ان Objects کے استعمال کو لازماً اقبال کے یہاں اسلامی نظریۂ فن سے تعبیر نہیں کرنا چاہیے کہ اصول فن کے بیان میں انھوں نے ان Objects کا استعمال کیا ہے جو اسلامی ثقافت سے متعلق ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ٹیگور نے ہندو ثقافت سے متعلق Objects سے کام لیا ہے۔

موسیقی انسان کی سرشت میں داخل ہے، خواہ وہ رونا ہو یا آواز لگانا، وہ ڈانٹنا ہو یا چلانا، سب ایک خاص لے میں ہوتا ہے۔ یہی لے جب کسی خاص انداز یا آہنگ کے تابع ہو تو موسیقی کا جزو بن جاتا ہے۔ اقبال کا نظریۂ موسیقی مختلف ہی نہیں نرالا ہے۔ وہ موسیقی سے صرف محظوظ نہیں ہونا چاہتے بلکہ اس سے اپنے خون میں حرارت اور گرمی محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مختصر نظم موسیقی میں اقبال بیان کرتے ہیں :

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل
کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تاب ناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں
پھرا میں مشرق و مغرب کے لالہ زاروں میں
کسی چمن میں گریبانِ لالہ چاک نہیں

اقبال کو موسیقی پسند ہے لیکن وہ کوئی عام نہیں بلکہ ایک خاص موسیقی ہے۔ ان کو سرور و سرود اور صوت و آہنگ میں وہ آتش نوائی اور شعلہ نفسی پسند ہے، جس میں دل کی آنچ ہو اور رگِ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں ہو اور مغنی صرف لہجہ کے اتار چڑھاؤ اور تال، سر اور نغمہ کے زیر و بم کا نمائندہ نہ ہو بلکہ صاحب دل بھی ہو:

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور ے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے
دل کیا ہے اس کی مستی وقوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے
کیوں اس کی زندگی سے ہے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے
کیا بات ہے، کہ صاحب دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سطنت روم و شام ورے
جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

(سرود)

اقبال کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کی درجہ بندی بھی کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی نقطۂ نظر کو بروئے کار لاتے ہوئے موسیقی کو حلال وحرام کے خانوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں۔ حلال موسیقی کی معیار بندی کرتے ہوئے اقبال اس نغمۂ جاوداں، لافانی آہنگ اور اس مغنی آتش نفس کو ڈھونڈتے ہیں، جس سے دل زندہ و بے دار ہو جائے اور ستاروں کا وجود پگھل جائے، جو انسانیت کے لیے مساوات کا پیامی ہو اور جس سے پوری کائنات بے دار ہو جائے لیکن حرام اور حلال کا جو مذہبی تصور ہے اس کی روشنی میں اقبال کے یہاں اس درجہ بندی (Categories) کا استعمال اسلامی نقطۂ نظر کے برعکس زیادہ معلوم ہوتا ہے کیوں کہ موسیقی کو فقہا نے تمام وکمال حرام بتایا ہے۔ ایسی صورت میں اقبال کا اس موسیقی کے لیے جواز پیدا کرنے کی کوشش کرنا جو لہو کو گرماتا ہو، بنیادی طور پر موسیقی اور اس کی قوت کا اعتراف ہی ہے لیکن ہمارے نقادوں نے عام طور پر اس کی تعبیر غلط انداز میں کی ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اقبال نے کس طرح 'سرودِ حلال'

میں اپنے مقاصد بیان کیے ہیں:

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود!
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود
مہ و انجم کا یہ حیرت کدہ باقی نہ رہے
تو رہے اور ترا زمزمۂ لا موجود
جس کو مشروع سمجھتے ہیں فقیہانِ خودی
منتظر ہے کسی مطرب کا ابھی تک وہ سرود

ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اس کا منتظر ہے کہ ہمارے یہاں ایسے نے نواز پیدا ہوں جن کے نغموں سے دل میں ایسی کشود ہو جو زندہ و پائندہ رہے اور نہ صرف محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں بلکہ ہر ایاز محمود بن جائے۔ جو موسیقی انسان کی خفتہ قوتوں کو بے دار کرنے سے قاصر ہو وہ حرام کہی جا سکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ایسی کوئی موسیقی نہیں ہو سکتی جو اپنے سننے والوں پر کسی طرح کا کوئی اثر مرتب نہ کرے۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ اقبال نے ایک لطیف پیرائے میں موسیقی کی حرمت کے استدلال پر سوالیہ نشان ہی قائم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو نغمہ زندگی کی قوتوں کو لوریاں دے کر سلا دے یا حسرت و حرماں سے لبریز ہو وہ سرود حرام میں داخل ہے اور جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ ایسا کوئی نغمہ نہیں ہو سکتا جو انسانی حواس پر اثر انداز نہ ہو۔ اقبال نے اپنے ان خیالات کو اپنی نظم 'سرودِ حرام' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرور
نہ میرا فکر ہے پیمانۂ ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اتفاق ہو مجھ سے
فقیہِ شہر کہ ہے محرمِ حدیث و کتاب
اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

فن قدرت کے ذریعہ عطا کیا ہوا فطری عطیہ ہوتا ہے اور فن کار اس کا فن کارانہ استعمال کر کے اس عطیہ کو انسانوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جو فن کار اس کی تقسیم میں بے ایمانی کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو قدرت اس سے ناراض ہو جاتی ہے اور اس کے فن کا معیار نہ صرف کم ہونے لگتا ہے بلکہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔ فن کار اور اہل کمال میں کچھ وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جو غیر معمولی اور معجزانہ کہی جا سکتی ہیں۔

رقص، موسیقی کی طرح ہی ایک فطری چیز ہے۔ رقص نہ صرف خدا کی بنائی ہوئی مخلوق میں انسان کے حصے میں آیا ہے بلکہ بعض جانوروں میں بھی رقص کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ طاؤس کے رقص کی دل آویزی کتنی مشہور ہے۔ اقبال 'رقص و موسیقی' کے عنوان سے ایک نظم میں رقم طراز ہیں:

شعر سے روشن ہے جانِ جبرئیل و اہرمن
رقص و موسیقی سے ہے سوز و سرودِ انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے، رقص اس کا بدن

ان اشعار سے ایک جانب رقص و موسیقی کے آپسی رشتے کی مضبوطی کا علم ہوتا ہے تو وہیں دوسری جانب اس فن کے اثرات اور اس کی وسعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ رقص کے لیے موسیقی کا ہونا لازمی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہیں۔

اچھا رقص پیش کرنے کے لیے اچھی موسیقی کا ہونا ضروری ہے اور اچھی موسیقی کو اچھا رقص مل جائے تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ حالاں کہ موجودہ دور میں یہ میل کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بلکہ اب تو دل کو سکون پہنچانے والی موسیقی یا رقص کم یاب ہی ہیں ہاں فوری طور پر نوجوانوں کو اپنی جانب راغب کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ لیکن یہ وقتی ہی ثابت ہوا ہے اس میں دائمیت نہیں ہے۔ رقص کے لیے صرف جسم کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس کا تعلق احساسات سے ہے اور احساس اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ روح کو تسکین عطا کرے۔ 'رقص' کے عنوان سے اقبال نے ایک چار مصرعے کی نظم تحریر کی ہے۔ ان کے خیالات آپ بھی دیکھیں:

چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم الٰہی!
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی!

ہندوستانی رقص و موسیقی نہ صرف ہندوستان میری مراد مشترکہ ہندوستان سے ہے، بلکہ عالمی سطح پر اس قدر مقبول ہے کہ اب اس کے رسیا ہندوستان کے باہر بھی کم نہیں ہیں۔ یہاں بھی قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے اقبال کے تصورات کو اس کے کیف و کم کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اقبال موسیقی کو غلاموں کے فنونِ لطیفہ میں شمار کرتے ہیں جن سے فطرت انسانی طرح طرح کی تکلفات کی غلام بن جاتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ نغمہ موسیقی زندگی کے بجائے موت کا پیغام دیتے ہیں اور آدمی کو زار و ناتواں بناتے اور دنیا سے بے زار کر دیتے ہیں۔ اس سے دل کا سوز و گداز ختم ہو کر ایک غم آگیں کیفیت سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس سے وہ غم بھی نہیں ملتا جو دوسرے تمام غموں کو بھلا دیتا ہے، بلکہ اس کا غم یاس و قنوط کی پیداوار ہوتا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے اور

روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم الٰہی!

کا مصرع یہ بتاتا ہے کہ وہ رقص کو مطلقاً حرام و حلال کے خانے میں ڈالنے سے پرہیز کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ رقص کا صلہ تشنگی کام و دہن ہی نہیں درویشی اور شاہنشاہی بھی ہو سکتا ہے۔

رقص و موسیقی کے ساتھ ساتھ فن مصوری بھی دل کو سکون اور روح کو چین عطا کرتا ہے۔ اقبال فن مصوری (Painting) میں انسانی شخصیت کی نمود اور تعمیر انسانیت کے کسی پیام کا وجود ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لیے مشرقی مصوری کی روحانیت کے حامی اور مغرب کی تجریدی مصوری (Abstract Art) کے منکر ہیں۔ مصوری میں انسان کے شائستہ اور ارفع جذبات و احساسات کی نقش آرائی اور صورت گری انھیں پسند ہے اور سطحی اور وقتی خیالات کے وہ قائل نہیں۔ مشرقی مصوری کا ازلی سوز و سرور اور اس کی روحانیت انھیں دل سے پسند ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار اقبال نے اپنی نظم 'مصور' میں کیا ہے:

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگِ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد، عجمی بھی!
مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی
معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی، نئی بھی
فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

اقبال مصوری کو ابراہیمی فطرت اور آذری صنعت سے آزاد پاتے ہیں، اس کے برخلاف اس میں سراسر اوٹ پٹانگ جزیات کی تصویر کشی اور مجموعی حیثیت سے موت کی نقش گری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مصور خود کسی عقیدہ و پیام پر مطمئن نہیں،

اس لیے اس میں نہ لذت تحقیق ہے نہ قوت تخلیق، اس کا اپنا کوئی ذوق نہیں بلکہ وہ عوامی ذوق کا اجیر اور کرائے کا مزدور ہے۔ وہ حسن کو مظاہر قدرت اور مناظر فطرت میں ڈھونڈتا ہے لیکن وہ تو ایک داخلی کیفیت ہے۔ یہاں بھی ظاہر ہے کہ اقبال کو فن مصوری پر اعتراض نہیں بلکہ اس کے بے جا استعمال پر اعتراض ہے۔ وہ ایسے مصور کو دیکھنا پسند نہیں کرتے جو مشرق کا سرور ازلی کھو چکا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی نظر میں مصوری وہ فن ہے جس سے مشرق کے سرور ازلی کا بار گراں اٹھ سکتا ہے۔ یہ فن مصوری کو اقبال کا بڑا خراج عقیدت بھی کہا جا سکتا ہے۔

موسیقی اور مصوری کی مانند سنگ تراشی اور مجسمہ سازی بھی فنون لطیفہ میں اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا میں جتنے بھی ممالک قدیم تہذیب کے پروردہ ہیں ان میں اس فن کو اہم درجہ ملا ہوا ہے۔ یونان، مصر اور ہندوستان کو قدیم ترین تہذیب کے پاس دار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور دنیا کے عجائبات میں سے مصر کے پاس اہرام ہے تو ہندوستان کی عمارت ہے۔ ان دونوں ہی عجائبات میں سنگ تراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ اقبال اس کے مقلد تو نہیں ہیں لیکن اہرام مصر کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس دشت جگر تاب کی خاموش فضا میں
فطرت نے فقط ریت کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر!
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردان ہنر مند کہ نخچیر!

فنون لطیفہ میں شامل تمام فنون خواہ وہ نغمہ نگاری ہو یا گائکی، وہ موسیقی ہو یا رقص، وہ مصوری یا مجسمہ سازی، کو مکمل صورت میں ایک ساتھ اگر کسی فن پارے میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ واحد صنف ڈراما ہے۔ ڈراما ایک پرفارمنگ آرٹ ہے۔ حالاں کہ اردو

میں بھی اس کی ابتدا کھیلنے سے ہوئی لیکن دھیرے دھیرے یہ اسٹیج سے دور ہو کر کاغذوں میں سمٹتا چلا گیا۔ اور ہمارے سنجیدہ ناقدین نے اس کاغذی شیر پر فخر محسوس کرنا شروع کر دیا۔ ہم اس سے واقف ہیں کہ سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد پہلے لوک ناٹکوں کی شکل میں پھر رہس اور اندر سبھا سے ہوتے ہوئے پارسی تھیٹر اور پھر سماجی و اصلاحی تھیٹر تک اردو ڈرامے نے ہندوستان میں ڈرامے کی نمائندگی کی ہے۔ اس کے فن کاروں اور اداکاروں کی نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے کئی ممالکوں میں پرستش تک کی جاتی ہے۔ انھیں سماج میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور کے حصے میں کم کم ہی آیا ہے۔ اس کے باوجود اردو میں ان فن کاروں اور اداکاروں کو ہیچ نظر سے ہی دیکھا گیا ہے۔ وجہ صاف ہے کہ ہم نے اسے مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور مذہبی لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمارے ناقدین نے بھی ڈراما اور تھیٹر سے منسلک فن کاروں اور اداکاروں کو بداخلاق اور بدکردار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ایسا سوچتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ کچھ ڈرامے تفنن طبع کے لیے تحریر کیے جاتے ہیں تو اکثر ڈرامے اصلاح معاشرت کی خاطر لکھے جاتے ہیں۔ سماجی، اخلاقی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور انسان کی زندگی سے متعلق دوسرے تمام مسائل کو جتنے پر اثر طریقے سے ڈرامے کے ذریعہ پیش کیا جا سکتا ہے وہ دوسرے فن کے حصے میں کم کم ہی آیا ہے۔ اقبال اپنی ایک نظم 'تیاتر' میں اس سے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے، اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پروین سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا، خودی غیر کی! معاذاللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

ڈرامے کے بعد اگر کوئی میڈیم ہے جو گھر گھر پر اپنی حکومت قائم کیے ہوئے ہے تو وہ ہے فلم اور ٹیلی ویژن۔ بیسویں صدی میں فلم کی ابتدا اس وقت ہوئی جب تھیٹر اپنے پورے عروج پر تھا۔ فلم کے ابتدائی زمانے میں تھیٹر والوں نے ہی نہ صرف اس دنیا کو آباد کیا بلکہ اسے سجایا سنوارا۔ شروع شروع میں تو تھیٹر کو ہی فلما کر عوام کے سامنے مشین کی مدد سے پیش کیا گیا۔ فلم کو مقبول بنانے کی غرض سے تھیٹر دکھانے کی غرض سے تماش بین کو بلایا جاتا اور ایک ٹکٹ پر دو کھیل یعنی تھیٹر اور فلم دونوں دکھایا جاتا۔ اقبال کے زمانے میں یہ عام چلن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اقبال بلکہ عام لوگ فلم پر تھیٹر کو ترجیح دیتے تھے۔ عوام کے سامنے براہ راست پیش کیے جانے والے فن کی بات ہی کچھ اور تھی یعنی اداکار زندگی کو عوام کے سامنے جی کر دکھاتے تھے۔ چوں کہ اقبال تھیٹر کو اچھا نہیں سمجھتے تھے تو فلم کو کیسے سراہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے سنیما کو بت گری اور بت فروشی سے تعبیر کیا ہے اور اس میں کام کرنے والے اور فلم بنانے والوں کو شیوۂ ساحری اور فلم انڈسٹری کو صنعتِ آذری سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کی نظم سنیما ملاحظہ فرمائیں:

وہی بت فروشی، وہی بت گری ہے
سنیما ہے یا صنعتِ آذری ہے
وہ صنعت نہ تھی، شیوۂ کافری تھا
یہ صنعت نہیں، شیوۂ ساحری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہد کہن کا
یہ تہذیبِ حاضر کی سوداگری ہے
وہ دنیا کی مٹی، یہ دوزخ کی مٹی
وہ بت خانہ خاکی، یہ خاکستری ہے

اقبال کے ان اشعار اور اقوال پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اقبال فنون لطیفہ کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں اس لیے بالعموم یہ سمجھا گیا کہ وہ ایک خاص مقصد کے حصول کا مطالبہ ان فنون سے کرتے ہیں اور اسی لیے یہ بھی سمجھا گیا کہ وہ فنون لطیفہ کے جو اصول مرتب کرتے ہیں اور ان سے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ تمام لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہوں گے، اور نہ ہی اس سے اس فن کی ترقی کی راہ ہموار ہوگی۔ حالاں کہ اصل صورت حال اس کے برعکس وہ تھی جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ غلط فہمی ان فنون پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال کے ایک خاص ثقافت سے وابستہ Objects کو استعمال کرنے کی وجہ سے عام ہوئی جس میں شدت اقبال کے سیاسی عقائد کی موجودگی نے بھی پیدا کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی فن کو حدود میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کا دم پھول جائے گا اور ایک نہ ایک دن وہ گھٹ کر مر جائے گا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر فن کے اصول زمانے کی تبدیلی اور فن کی ضرورت کی مناسبت سے بدلتے رہے ہیں اور اسے مثبت راہ پر آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ اس کے باوجود ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اقبال کو شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی، رقص و سرود کا بھرپور علم تھا۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے ایک جانب فنون لطیفہ سے متعلق ان کے خیالات کی تہہ میں کارفرما اصولوں کا علم ہوتا ہے تو دوسری جانب ان تمام فنون لطیفہ پر ان کی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نہ صرف فنون لطیفہ کے دانائے راز تھے بلکہ اس کے اصول و ضوابط مقرر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ حالاں کہ عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ اصول فن کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ان میں سے بعض اصول آج کے دور میں صادق آتے ہیں تو اکثر نامناسب اور فن کی ترقی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں لیکن اس سے اقبال کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

❖❖❖

ڈاکٹر عطیہ رئیس (نئی دہلی)

''بانگِ درا'' کی نظمیں: ایک تاثر

ماہرِ اقبال پروفیسر عبدالحق کا کہنا ہے کہ:

''ہمارے ناقدین، ادب کے مختلف موضوعات پر، چاہے کچھ بھی لکھ لیں لیکن اُن کی ادبی مغفرت اقبال پر لکھنے کے بعد ہی ہوگی۔''

آپ پروفیسر عبدالحق کی اس رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جب تک اپنے کلاسیکی شعرا خصوصاً میر، غالب اور اقبال کا مطالعہ نہ کیا جائے اُس وقت تک 'ادب دوستی اور ادب نوازی' کا حق ادا نہیں ہوسکتا اور مطالعاتی بصیرت کی کمی کا احساس باقی رہے گا۔ اگر ہم اردو ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ادب شناسی کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان کے مطالعے کے بغیر بات بنتی بھی نہیں ہے کیوں کہ یہ ہماری ادبی میراث ہیں۔

علامہ اقبال ہمارے اُن اکابرین میں شامل ہیں جنہیں ایک سے زیادہ القاب

سے یاد کیا جاتا ہے۔ کوئی انہیں ترجمانِ حقیقت کہتا ہے تو کوئی حکیم الامت، کوئی انہیں شاعرِ مشرق کہتا ہے تو کوئی دانائے راز، کوئی انہیں زندہ رود کہتا ہے تو کوئی تمیذ بلبلِ ہند داغ دہلوی۔ گو کہ ہر اعتبار سے وہ مقبول و معروف اور ہر دل عزیز ہیں۔ اقبال پر لکھنے والوں نے اُن کے فکر و فن اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مضامین اور کتابیں تو غالب سے بھی زیادہ تحریر کی گئی ہیں۔ اقبال کے کلام، اُن کے پیغام، اُن کی فکر، اُن کے فلسفے اور اُن کی زبان و لسان پر اتنی تحریریں وجود میں آ چکی ہیں کہ مزید کچھ لکھنے اور کہنے کے لیے بڑی جسارت چاہیے۔ میں اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ جسارت کر رہی ہوں۔

یہ بات تو سب کے علم میں ہے کہ اقبال نے جوانی کی عمر میں قدم رکھنے سے قبل ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ بقول سید نذیر نیازی:

''ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1885ء یا اُس سے کچھ پہلے ہی ہو گیا تھا۔''

اور اس بات سے بھی سب واقف ہیں کہ اُن کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا تھا۔ ''بانگِ درا'' اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جس کی پہلی اشاعت ستمبر 1924ء میں ہوئی تھی جس پر اُس زمانے کے مشہور ادیب سر عبدالقادر نے دیباچہ لکھا تھا۔ اس سے قبل اقبال کے تین فارسی شعری مجموعے ''اسرارِ خودی''، ''رموزِ بے خودی'' اور ''پیامِ مشرق'' شایع ہو چکے تھے۔ ''بانگِ درا'' میں صرف ایک فارسی نظم 'شاعر' کے عنوان سے ہے۔ اِس مجموعے میں غزلوں کے مقابلے نظموں کی تعداد زیادہ ہے اور ان ساری نظموں اور غزلوں کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 1900ء سے 1905ء تک ہے۔ یہ حصہ، جسے اقبال کے ابتدائی کلام سے موسوم کیا جاتا ہے، 49 نظموں پر مشتمل ہے اور اس میں محض 13 غزلیں ہیں۔ حصہ دوم کی شاعری 1905ء سے 1908ء تک کی شاعری پر محیط ہے۔ اس حصے میں 24 نظمیں ہیں اور 7 غزلیں ہیں۔ تیسرے حصے میں 1908ء کے بعد کا کلام شامل ہے۔ اس حصے میں کل 70 نظمیں اور 8 غزلیں شامل ہیں۔ آخر میں کچھ

ظریفانہ کلام اکبر الہ آبادی کے انداز میں ہے۔ اس طرح ''بانگِ درا'' میں کل 2465 اشعار ہیں۔ غزل سے ابتدا کرنے کے باوجود اقبال نے نظموں کو ذریعۂ اظہار کیوں بنایا یہ ایک الگ بحث ہے تاہم ''بانگِ درا'' میں چوں کہ نظمیں زیادہ ہیں اسی لیے میں نے اسی کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

اس مجموعے میں جو نظمیں شامل ہیں اُن میں کچھ کا تعلق بچوں سے ہے، کچھ حب الوطنی کے حوالے سے ہیں، کچھ مناظرِ فطرت کے بارے میں ہیں، بعض نظموں کا تعلق ملت سے ہے، بعض کا زندگی سے اور بعض کا انسان اور انسانی جبلت سے اور کچھ کائنات پر محیط نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ بعض نظموں کا تعلق اقبال کی ذات سے بھی ہے جس میں خود اُن کے حالات اور واقعات ہیں۔ بقیہ نظمیں کسی مشہور شاعر کی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح ''بانگِ درا'' کی نظمیں ذات و کائنات کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان نظموں میں جو پیغام چھپا ہے وہ دراصل بے داری کا پیغام ہے۔ شاید اسی مناسبت سے اس کی تسمیہ بھی کی گئی ہے۔ ''بانگِ درا'' یعنی گھنٹے کی آواز، جس سے قافلوں کو بے دار کیا جاتا تھا تاکہ وہ اپنے اگلے پڑاؤ کے لیے تیار ہو جائیں۔

''بانگِ درا'' کی ابتدائی نظموں میں بیانیہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے یعنی فکر کی وہ گہرائی یا وہ عمیق تجربے جو اقبال کا امتیاز ہے، اس حصے میں کم سے کم ہے۔ اس لیے 1900ء سے 1905ء تک کی نظموں میں ایسی کوئی فکر انگیز یا حیرت و استعجاب سے بھری ہوئی یا کرشمائی تخلیق موجود نہیں ہے۔ ''ہمالہ''، ''گلِ رنگیں''، ''عہدِ طفلی''، ''ابر کوہسار'' سے لے کر ''التجائے مسافر'' تک سب کی سب نظمیں مشق ہی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ موضوعات کا وہ انجذاب جو اس مجموعے کے تیسرے حصے کی نظموں میں ہے، یہاں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اس حصے کی نظموں میں داخلی وحدت کا عنصر بھی کم سے کم ہے، جو کلام کو روشنی اور تابانی عطا کرتا ہے۔ وہ نظمیں جن میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا گیا ہے، اُن میں البتہ sparking current موجود ہے۔ ''ترانۂ ہندی''، ''ہندوستانی

بچوں کا قومی گیت'' وغیرہ میں یہ current واضح ہے۔ اسی قبیل کی ایک اور نظم ''نیا شوالہ'' ہے جس میں deeply involvement دیکھنے کو ملتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس نظم کا ہر لفظ شاعر کے دل کو چھو کر آ رہا ہے۔ اس نظم میں ہندوستان کی پرانی تہذیب اور اس کے علمی اور جمالیاتی ورثے کو اجاگر کر کے اقبال نے اچھی پیش قدمی کی ہے۔ اسی دور کی شاعری میں ''تصویرِ درد'' بھی ایک کامیاب نظم ہے۔ اس میں پورا ایک ڈرامائی سین موجود ہے جس میں خود شاعر کی ذات و صفات کا بھی بیان ہے اور کارگہِ ہستی کا منظر بھی موجود ہے۔ اس نظم کا فعال جذبہ بھی 'حب الوطنی' ہی ہے۔ اس کے بعد جو نظم مجھے خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہے، وہ ہے ''التجائے مسافر''۔ اس نظم میں محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے دعائے خیر کی درخواست کی گئی ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور نظم حضرت بلال حبشیؓ پر ہے۔ جس میں محبت کا سچا بیان موجود ہے۔ پہلے حصے کی ایک اور نظم ''کنارِ راوی'' ہے، جس میں منظر نگاری کو بڑے ہی سلیقے سے برتا گیا ہے۔ گو کہ پہلے حصے میں اقبال کا تشخص ایک سچے حب الوطن شاعر اور عقیدت مند مسلمان کی حیثیت سے قائم ہوتا ہے۔

''بانگِ درا'' کا دوسرا حصہ 1905ء سے 1908ء تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس زمانے میں اقبال نے اپنا پورا وقت یورپ میں گزارا اور جدید علوم سے قریب ہوتے رہے۔ اس لیے اس دور کی پہلی ہی نظم جس کا عنوان ''محبت'' ہے، مزاج کے اعتبار سے پہلے حصے کی نظموں سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ نظم بھی بیانیہ کا عمدہ نمونہ ہے لیکن اس میں جذبہ و خیال کی چمک اور خلوص و صداقت کا عنصر ماقبل کی نظموں سے کہیں بہتر اور برتر ہے۔ اس نظم کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر یقینی طور پر ایک نئی فکر سے آشنا ہو بھی رہا ہے اور کر بھی رہا ہے۔ اس نظم کے بعد ایک نظم ''حقیقتِ حسن'' ہے جس کے بارے میں ناقدین کا خیال ہے کہ یہ کسی فرنگی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے۔ تاہم یہ نظم اپنی صناعی اور رچے ہوئے شعور کی وجہ سے بے حد مؤثر اور دل کش ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہوگی کہ سروجنی نائیڈو نے اسے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ نظم پڑھتے ہی محسوس ہوتا

ہے کہ یہ نا قابلِ تقسیم وحدت میں ڈھلی ہوئی ہے۔ یہی وہ نظم ہے جس کے بعد اقبال عظمت کی بلندیاں طے کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد چند مزید مختصر نظمیں ہیں۔ ''پیام''، ''سوامی رام تیرتھ''، ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام''، ''اخترِ صبح''، ''حسن و عشق''، ''کلی''، ''وصال''، ''جلوۂ حسن''، ''تنہائی'' وغیرہ۔

نظم ''پیام'' میں اقبال نے صوتی فضا آفرینی سے اپنے پیغام کو معتبر بنایا ہے۔ ''سوامی رام تیرتھ'' میں ایک موحد کو خراجِ عقیدت پیش کی گئی ہے۔ اس خراجِ عقیدت میں ایک قسم کی کائناتی صداقت کوشی اور سرِ تفکر کا انداز نمایاں ہے۔ ''طلبہ علی گڑھ کالج کے نام'' اور ''اخترِ صبح'' میں آہنگ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اقبال ان نظموں میں بڑے ماہر صناع نظر آتے ہیں جو اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ نظم ''کلی'' میں قدرت کی کرشمہ سازی کو بہت سبک اور سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اقبال اسلوب اور اپنے وجدان کے نئے امکانات تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم ''ایک شام اور تنہائی'' میں رات کی منظر کشی کی گئی ہے اور کفایتِ الفاظ میں بیان کی ہوئی بڑی نظم ہے۔ ان نظموں میں اقبال کا جمالیاتی حس اپنے عروج پر ہے۔ ان نظموں میں ایسی سرگوشی موجود ہے جو بار بار قاری کے لیے کشش کا باعث بنتی ہے۔ یہی خوبی اس حصے کی دوسری نظموں میں بھی پوشیدہ ہے۔ گو کہ اس دوسرے حصے کی نظموں میں اقبال کی فکری جہت سے آشنا نظر آتی ہے۔ ان کے پیغام بھی واضح ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنے عقائد میں راسخ اور ملتِ اسلامیہ کے لیے ہم دردانہ جذبے سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حصے کی نظموں میں اقبال کی شوریدہ مزاجی، وحشت و آوارگی اور انتظار ایک ہی مرکز پر مجتمع نظر آتے ہیں۔

''بانگِ درا'' کا تیسرا اور ایک طرح سے آخری حصہ 1908ء کے بعد کا اردو کلام ہے۔ اس حصے کی بیش تر نظمیں ملتِ اسلامیہ اور قومی جذبے پر اساس رکھتی ہیں۔ اس حصے میں کچھ رومانی نظمیں بھی ہیں لیکن کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کی بنیاد پر ہم

انہیں مفکر شاعر کا درجہ دے سکتے ہیں۔ اس حصے کی پہلی نظم ''بلادِ اسلامیہ'' ہے۔ اس نظم میں بالخصوص دلّی، بغداد، اُندلس، قسطنطنیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ شہر ہیں جو ایک زمانے تک اسلام یا اسلامی اقدار کا مرکز رہے ہیں اور اپنے تہذیبی رکھ رکھاؤ اور علم سے دنیا کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے اُسی پس منظر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے اور اختتام میں اُن کی بربادی پر ماتم کیا ہے۔ اس کے بعد نظم ''ستارہ'' ہے جس میں فطرت کے منفرد مناظر کی پُرکشش صورتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ نظم خیال کی رُو سے کوئی بڑی نظم نہیں ہے تاہم اس کا خوب صورت پیرایۂ بیان اسے کامیاب بنا دیتا ہے۔ اس حصے میں چوں کہ 70 نظمیں ہیں اس لیے میں چند اہم نظموں کا ہی ذکر کروں گی۔ ایک نظم ''گورستانِ شاہی'' ہے۔ اس میں تاریخ کے اُس جبر کو پیش کیا گیا ہے جو صدیوں سے چلا آتا ہے اور ہماری تاریخ میں ایک دائمی حقیقت بن گیا ہے۔ مصر کے فاطمی بادشاہوں نے، اُندلس کے اُموی بادشاہوں نے اور بغداد کے عباسی بادشاہوں نے جو ظلم و ستم ہمارے مستند علمائے دین پر کیے تھے وہ ایک تاریخی صداقت ہے۔ ایسا ہی کچھ مغل شہنشاہوں نے بھی کیا تھا۔ یہ تمام واقعات اس نظم میں بنیادی وحدت میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اس حصے میں ایک نظم ہے ''وطنیت''۔ یہ وہ نظم ہے جس سے اقبال کی فکر میں ایک واضح موڑ آتا ہے۔ وطن پرستی کا جذبہ یہاں ایک مکمل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وطنیت کا وہ جذبہ جو ''نیا شوالہ'' میں پروان چڑھا تھا وہ اس نظم میں اپنے بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد جس نظم میں نیا اسلوب، نئی سوچ دیکھنے کو ملتی ہے وہ ہے نظم ''شکوہ''۔ اس نظم میں برتر تصورات و تعقلات پوشیدہ ہے۔ اس لیے اس نظم کو اقبال کی نظمیہ شاعری میں ایک سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔ اس نظم کا موضوع منضبط اور بڑا حرکی (open) ہے۔ جس خود اعتمادی اور جرأت کا اظہار اقبال نے اس نظم میں کیا ہے وہ بہ آسانی انہیں مثبت نتیجے اور مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔ اس نظم کا منفی اسلوبی رویہ حقیقتاً دلوں کو مضطرب کرنے کے لیے نہیں بلکہ زوال پذیری کے صدیوں کے سفر کو شدت کے ساتھ دلوں میں اُتارنے

کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نظم میں خطاب تو باری تعالیٰ سے ہے لیکن معنی و مطالب کی اصلی سطح کے مخاطب مسلمان ہیں۔ یہ ایک طویل استعاراتی نظم ہے جو مسلمانوں کو بے داری کا درس دیتی ہے یعنی مسلمانوں کو خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم جمانے کا پیغام دیتی ہے۔ اس کے بعد بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں ہیں جن میں پیغامات کی مختلف صورتیں اور سطحیں موجود ہیں۔ نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' میں نئی نسل میں مقصدیت کی کمی اور علمی تجسس کے فقدان کو پیش کیا گیا ہے۔ طویل نظم شمع و شاعر میں بنیادی طور پر lack of sensibility کو محور بنایا گیا ہے اور ''شمع و شاعر'' کے سوال و جواب میں غم اور فکر کو یک جا کیا گیا ہے۔ یہ ایک آفاقی نظم ہے جس کا دائرہ پھیل کر بہت سے فکری حدود کو توڑ دیتا ہے اور ہمیں عبرت ناک ماحول سے باہر قدم نکالنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک نظم ہے ''مسلم''۔ یہ نظم بھی فکری اور اسلوبی دونوں اعتبار سے بہت powerful ہے۔ طرابلس کی جنگ میں مسلمانوں نے مردانہ وار جانیں نثار کی تھیں۔ اس نظم میں مسلمانوں کی اسی دلیری اور جاں نثاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر نظم ''حضور رسالت مآب ﷺ میں'' ہے۔ جس میں عشق کی کلی صورت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی جاں نثاری اور شہادت کو تحفۂ مظہر بنا کر آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک بڑی نظم ''جواب شکوہ'' آتی ہے۔ اس نظم میں خدا کے حضور جو شکایت نظم ''شکوہ'' میں کی گئی تھی، اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس نظم کی بنیاد بھی قوم کی کوتاہی، بے عملی، بے جہتی، فراموشی، تفرقہ انگیزی، منافرت اور نادانی جیسے موضوعات پر رکھی گئی ہے اور آخر میں پیروی قرآن کا پیغام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بہت سی چھوٹی نظمیں ہیں، جن میں خیالات کا رچا ہوا شعور موجود ہے۔ پھر ایک قابل بیان نظم آتی ہے جس کا عنوان ہے ''مذہب''۔ یہ نظم جمعیت کے تصور کو پیش کرتی ہے اور اسے مذہب کی بنیادی قوت قرار دیتی ہے۔ اس نظم میں جمعیت پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی حصے میں نظم ''میں اور تو'' بھی عمدہ نظم ہے۔

اس عنوان سے الگ الگ دو نظمیں ہیں۔ دوسری نظم پہلے کے مقابلے زیادہ بصیرت افروز ہے۔ اس میں جرأت، ہمت، قوت اور شوکت کا پیغام دیا گیا ہے۔ نظم ''خضرِ راہ'' ایک بڑی نظم ہے۔ اس نظم کا لہجہ بڑا دھیما اور موثر کن ہے۔ اس نظم میں بھی کفایتِ لفظی کا خوب خوب استعمال ہوا ہے۔ کہیں ایک ہی مصرعہ میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کی ملاقات کا پورا واقعہ پیش کر دیا گیا ہے تو کہیں ابراہیم کا واقعہ۔ یہ نظم اجتماعی شعور میں رچی بسی نظم ہے۔ اقبال نے اس نظم میں اپنے کمالِ فن کو بہت بلندی عطا کی ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ ''بانگِ درا'' کی تمام نظموں میں دو نظمیں ایسی ہیں جنہیں ہم حاصلِ کلام کہہ سکتے ہیں اور وہ ہیں ''شمع و شاعر'' اور ''خضرِ راہ''۔ یہ دونوں نظمیں فکر و فن اور اسلوب کے اعتبار سے بقیہ تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں نظموں میں وحدتِ تاثر اپنے عروج پر ہے۔ محض ان دو نظموں کی بنیاد پر ہم اقبال کو دنیا کی بڑے شعرا کی صف میں رکھ سکتے ہیں۔ گو ''بانگِ درا'' کی نظمیں راست پیغام کی نظمیں ہیں، جن میں تخلیقی جمالیات کی رفعت بھی ہے اور افکار و اسالیب کی خصوصیت بھی۔

❖❖❖

ڈاکٹر احمد امتیاز (نئی دہلی)

اقبال کی متصوفانہ فکر پر ایک نظر

علم تصوف ایک دلچسپ اور وسیع موضوع ہے جو روحانی اور قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۂ اخلاق کا درس دیتا ہے۔ تصوف کی مستند اور مشہور کتابوں میں اس کی اصل غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تصوف، فلسفہ بھی ہے اور مخصوص طریقۂ زندگی بھی، اور یہ وہ علم ہے جو مادیت سے منہ موڑ کر روحانیت کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ رہبانیت کی سرحد میں داخل ہو جائے۔ اسلامی تصوف اور غیر اسلامی تصوف کا بنیادی فرق بھی یہی ہے کہ اسلامی تصوف میں صوفی ترک دنیا نہیں کرتا بلکہ خدا سے رجوع ہو کر بھی مخلوقِ خدا سے اپنا رشتہ قائم رکھتا ہے۔ یہ تصوف ہی ہے جس نے عشقِ الٰہی کے جذبے کو عام کیا اور قربِ الٰہی کے سینکڑوں طریقے سکھائے۔ خدا و کائنات کی حقیقت، وجود و ہستی کی ماہیت، صبر و توکل، زہد و تقویٰ، محبت اور بھائی چارے کا سبق اور اخلاقیات کا درس صوفیائے کرام کا اصل

مقتصد رہا ہے۔ اسی سبب ایران، عراق، وسط ایشیا اور ہندوستان میں درویشانہ ماحول کی فضا قائم ہوئی اور عوام سے لے کر خواص تک اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور ان کے زاویوں، تکیوں، دائروں اور خانقاہوں کو مرجع خلائق کی حیثیت حاصل ہوئی۔ تصوف کے ان ہی گوں نگوں موضوعات و محرکات نے پہلے فارسی شعرا کو متاثر کیا اور فارسی شاعری میں ایسے ایسے صوفی شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے تصوف کے مروجہ تصور کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ عطار، رومی، سعدی، حافظ، اوحدی، مغربی اور عراقی نے اس ضمن میں خاص شہرت حاصل کی۔ انھیں شاعروں کے توسط سے اردو شاعری میں بھی متصوفانہ فکر کو جلا ملی۔ سراج، مرزا مظہر، میر، درد، آتش، غالب، اقبال، آسی، اصغر وغیرہ شعرا نے صوفیانہ خیالات کو خصوصی طور پر اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ حالاں کہ فارسی کے مقابلے اردو میں ایسے معدودے چند ہی شعرا ہیں جو عملاً صوفی بھی تھے ورنہ بیش تر شعرا نے تصوف اور اس کے مضمرات کو محض شعری روایت کے طور پر ہی اپنے یہاں جگہ دی۔

اردو شاعری میں اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس نے صوفیانہ تصورات کو افلاطونی یا سائنسی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن کی اس فلسفیانہ کوشش پر اردو میں سینکڑوں مضامین اور متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔[1] ان کتابوں کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایران میں صوفیانہ شاعری کے عروج و زوال یعنی حکیم سنائی (پانچویں صدی ہجری) تا عبدالرحمان جامی (نویں صدی ہجری) کے پانچ سو برس بعد اقبال نے اسے ہندوستان میں دوبارہ زندہ کیا اور اسے ایک نئی منزل تک پہنچایا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اقبال کو ایرانی صوفی شعرا کے سلسلۂ فکر کی اگلی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے کلام میں جس طرح صوفیائے کرام اور مشائخ سے عقیدت کا اظہار ملتا ہے وہ بھی اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ اقبال کا رشتہ کلاسیکی فارسی شاعری سے ہے۔

پہلی قرأت:

اردو شاعری میں ابتدا ہی سے تصوف اور اُس کے موضوعات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اقبال نے بھی اپنی شاعری میں تصوف کے موضوعات کو بحث کا موضوع بنایا ہے اور اس کی اصطلاحات سے نئے نئے پیکر تراشے ہیں۔ انہیں تصوف کے موضوعات سے بڑی گہری دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ بچپن میں اُن کے والد انہیں محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف تصنیف "فصوص الحکم" اور "فتوحاتِ مکیہ" کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مغربی تعلیم حاصل کرتے ہوئے تصوف کا فلسفہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی تصوف کی تعلیمات اور اُس کے فلسفے سے اُن کا رشتہ آخری عمر تک قائم رہا۔ تصوف کو علمی حلقوں میں جس نے پہلے پہل مقبول و معروف بنایا تھا وہ امام غزالی تھے جنہوں نے وجدان کو عقل پر فوقیت دی تھی۔ اقبال نے بھی امام غزالی کی طرح وجدان کو عقل سے بہتر اور برتر مانا اور استدلالی فکر پر وجدان کو ترجیح دی۔ اس لیے جب ہم اقبال کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر اُن کے ایسے اشعار ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں اسلامی تصوف اور اُس کے فلسفے کو مغربی منطق اور فلسفے پر ترجیح دی گئی ہے:

مرا از منطق آید بوئے خامی
دلیلِ او دلیلِ ناتمامی

.....

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

.....

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

.....

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

مغربی منطق اور فلسفے کے بے تہہ خاص ہونے کا تذکرہ انہوں نے اپنی نثری تصنیف 'الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید' میں بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''سقراط کے شاگردِ رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت ہی رہی، اس کا خیال تھا کہ ادراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا، ہم اس کی بنا پر صرف ایک رائے قائم کر سکتے ہیں، برعکس اس کے قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور انسان کو عنداللہ اپنے اعمال اور افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔''

اقبال نے اپنی دو تصانیف 'ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا' اور 'الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید' میں خصوصی طور پر اسلام اور مسلکِ تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ بعض مکتوبات میں بھی تصوف کے موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ ملتا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ اقبال اس موضوع پر باضابطہ کتاب لکھنے کے خواہش مند بھی تھے جس کے لیے انہوں نے مواد جمع کیے لیکن کتاب وجود میں نہیں آ سکی۔ جو آدھی ادھوری تحریریں اس حوالے سے دستیاب ہوئیں انہیں صابر کلوروی نے 'تاریخِ تصوف' کے عنوان سے ترتیب دے کر شائع کر دیا۔ اس کے مطالعہ سے بھی اقبال کے متصوفانہ خیالات پر کم و بیش روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی تصوف سے اُن کی گہری دلچسپی کا اندازہ اُن کی بعض نظموں، غزلوں اور ''جاوید نامہ'' سے بھی ہوتا ہے اور اُن بیانات سے بھی جسے انہوں نے اپنے والد کے حوالے سے بیان کیا ہے اور اُن سے بھی جسے 'روزگارِ فقیر' میں وحید الدین نے اپنے والد قدیر نجم الدین کے حوالے سے درج کیا ہے۔ نظم 'حرکت بجنت الفردوس' میں اقبال نے

تجلیات ربانی سے مستفیض ہونے اور سلوک کی منزلوں سے گزرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے اور عالم لامکاں کے سیر کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا ہے:

از مقام خود نمی دانم کجا است
ایں قدر دانم کہ از یاراں جدا است

مہاراجہ کشن پرشاد کو خط میں اپنے کشف واحوال کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''یہ مثنوی'' جس کا نام اسرار خودی ہے ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔'' (مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

شاہ سلیمان پھلواروی کو بھی انہوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''حقیقی اسلامی تصوف کا میں کیوں کر مخالف ہوسکتا ہوں کہ خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں۔'' (مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

اسی طرح ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو اسلم جے راجپوری کو لکھے گئے ایک خط میں مرقوم ہے:

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد لی جائے (اور یہی مفہوم قرون اولی میں اس سے مراد لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔''

(مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

تصوف کے تعلق سے اقبال کی دلچسپی اور ان کے تحریری بیانات کو دیکھنے سے کم از کم اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں اردو کے کلاسیکی صوفی شعرا کی طرح محض صوفیانہ خیالات قلم بند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ تصوف کی فلسفیانہ تشریحات کے ساتھ ساتھ باضابطہ نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ لیکن اس نظریہ سازی کے عمل سے گزرتے ہوئے اقبال نہ صرف یہ کہ خود شک وشبہات میں مبتلا ہوئے ہیں بلکہ قاری کو بھی مغالطے میں ڈال دیا ہے۔ حیرانی اُس وقت زیادہ ہوتی ہے جب وہ خود اپنے بیانات کی تردید کرتے ہیں۔ اسلامی تصوف کی حمایت میں اُن کے جو خیالات مندرجہ بالا پیش کیے گئے ہیں اُن سے اقبال کے متصوفانہ ذہن کا پتہ تو چلتا ہے لیکن ہمارے سامنے اُن

کے بعض خیالات ایسے بھی آتے ہیں جو اُن کے خیالات کی تردید کرتے ہیں مثلاً خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیاء کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے۔'' (مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

ایک اور خط میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

''میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔''

(مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

خان محمد نیاز الدین خاں کو بھی ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''الحمدللہ کہ آپ نے مثنوی (اسرار خودی) کو پسند فرمایا۔ افلاطونیت جدید فلسفۂ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعی غیر اسلامی ہے۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بے ہودگی پر تعمیر کی گئی۔'' (مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

اقبال نے تو ایک خط میں پوری صوفیانہ شاعری پر ہی سوال کھڑے کر دیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں ضعیف قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو اُن کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے اُن کے ادبیات کا انحطاطی کمال

لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔" (مشمولہ "اقبال نامہ" مرتب: شیخ عطاء اللہ)

اور اس شعر میں بھی تصوف کو نشانہ بنایا ہے:

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

جہاں تک خواجہ حسن نظامی کو لکھے گئے خطوط اور ان میں تصوف کو غیر اسلامی قرار دینے کی بات ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان تصوف کے بعض موضوعات پر معرکہ آرائی رہی ہے اور جس کے ردِ عمل میں اقبال کی نظم ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام وجود میں آئی تھی اور اس نظم میں اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو چیلنج کیا تھا اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ میں اصل کا خاص سومناتی ہوں، میری کفِ خاک برہمن زاد ہے، فلسفہ میرے آب وگل میں ہے، اس لیے میں اس کی رگ رگ سے باخبر ہوں۔ ممکن ہے خطوط کے یہ بیانات بھی اُسی ردِ عمل کا نتیجہ ہوں۔ لیکن دیگر لوگوں کے خطوط اور اشعار میں بھی یہی رویہ دکھتا ہے تو حیرانی ضرور ہوتی ہے۔ محمد رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کے صوفیانہ خیالات کی تائید میں لکھا ہے کہ:

"اگر اقبال خود خدا کی محبت سے بہرہ ور نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ کبھی اس قیمتی حکیمانہ نتیجہ پر پہنچ سکتا اور یہ ہمارا قیاس ہی نہیں بلکہ خود اقبال کا دعویٰ بھی ہے کہ اُسے روحانیت کا ایک درجہ اور معرفتِ حق تعالیٰ کا ایک مقام عطا کیا گیا ہے۔ اس درجۂ معرفت اور مقامِ محبت کو وہ افروزشِ سینہ، سوزِ درون، ذوقِ نگاہ، بادۂ ناب، وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے لیے درویش، فقیر، قلندر، ایسے القاب استعمال کرتا ہے، جو صوفیا کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔" (اقبالیات کے سو سال)

رفیع الدین ہاشمی کی طرح بہت سے اقبال شناس، اقبال کی بزرگی، کشف اور مرحلۂ شوق کے دعوے کی تائید کرتے ہیں اور اُن کے متضاد بیان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تاہم بعض اہلِ علم اور اقبال شناسوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال کا یہ دعویٰ محض تخلیقی

ترجمانی ہے اور انہوں نے برائے شعر گفتن، تصوف اور اُس کے مقامات و مسائل کو اپنی شاعری یا اپنی نثری تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ اُسی طرح جس طرح ایک صدی قبل غالب نے تصوف اور اُس کے موضوعات کو اپنایا تھا۔ غالب نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہم چو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم
نیست در دہر قلم مدعی و نکتہ گو است

یا سرفراز حسین کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

''میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔''

اسی طرح میر مہدی مجروحؔ کو لکھا تھا:۔

''صبر و تسلیم، توکل و رضا شیوہ صوفیا کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔''

اور علاؤ الدین خاں کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''میں موحد اور خالص مومن کامل ہوں۔ زباں سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔''

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ غالب کا دعویٰ محض دعویٰ نہیں تھا وہ مولانا نصیر الدین عُرف میاں کالے صاحب سے بیعت بھی تھے۔ اِن شواہد سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ایک صوفی صفت شاعر تھے کیوں کہ ان کے کلام میں بھی تصوف کے موضوعات بکھرے پڑے ہیں۔ خواہ اُن موضوعات کا تعلق وجود و ہستی سے ہو، فنا و بقا سے ہو یا جبر و قدر سے لیکن جب انہیں کے دوسرے بیانات پر ہماری نظر پڑتی ہے، مثلاً:

''اگر زندگی میں ایک دن بھی نماز پڑھی ہو تو کافر اور ایک دن بھی شراب ترک کی ہو تو گناہ گار۔''

یا

"آرائش کلام کے لیے یہ تصوف کچھ مہیا کر رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔"

تو تصوف کے باب میں غالب کے اس قسم کے متضاد بیان سے قاری الجھن میں پڑ جاتا ہے اور یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ غالب کو کیا سمجھا جائے۔ غالب کے ناقدین نے بھی غالب کے اس قسم کے متضاد بیان سے صرف نظر کیا ہے اور ایک زبان ہو کر ان کے صوفی شاعر ہونے کی تردید کی ہے۔ ایک ہی موضوع 'تصوف' کے تعلق سے غالب اور اقبال دونوں کے یہاں ایک جیسی صورت ہے۔ پہلے تصوف کی حمایت، پھر تصوف سے انکار، کبھی ہاں اور کبھی نا کی یکساں صورت، دو الگ الگ عہد کے سب سے بڑے شاعر کے یہاں کیسے پیدا ہوئی؟ کیا اس کے پیچھے کوئی دوسرا محرک کام کر رہا تھا؟ جب ہم اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تو فارسی زبان کے ایک بڑے شاعر عبدالقادر بیدل عظیم آبادی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مرزا غالب نے تصوف کے باب میں متضاد بیان دینے کی یہ ادا بیدل ہی سے سیکھی تھی، ممکن ہے اقبال نے بیدل اور غالب دونوں سے سیکھی ہو کیوں کہ بیدل دونوں کے آئیڈیل تھے۔ اس لیے غالب نے اپنی شاعری میں انہیں 'محیط بے ساحل' قرار دیا ہے اور اقبال نے بھی انہیں 'مرشد کامل' سے خطاب کیا ہے:

کہتا تھا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش

یہی نہیں بلکہ ضرب کلیم میں شامل اقبال کی ایک نظم بھی 'مرزا بیدل' کے عنوان سے ہے۔ اور اقبال نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔" ("شذرات فکر اقبال" مترجم: افتخار احمد صدیقی)

لیکن یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بیدل کی سخن سازی کے فن کا اعتراف کرنے کے باوجود اقبال نے تصوف کے معاملے میں بیدل سے سو فی صد اتفاق نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ بیدل کے بہت سے خیالات کو قرآن و احادیث کے مطابق نہیں پاتے تھے۔ 'الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید' کے خطبات میں اس لیے اقبال نے ترکی کے شاعر توفیق فطرت کے خیالات کی مخالفت کی تھی کہ وہ تصوف کے باب میں بیدل کا خوشہ چیں تھا۔

غالب اور اقبال دونوں کے یہاں تصوف کے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں، دونوں نے صوفی ہونے کا دعویٰ پیش کیا ہے اور دونوں کے یہاں اس سے انکار کی صورت بھی موجود ہے۔ پہلی نظر میں ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اقرار اور انکار کی ان صورتوں سے دونوں شعرا نے استعجاب کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ اردو شاعری میں غالب اور اقبال ہی دو ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں استعجابی کیفیت پیدا کرنے کی حد درجہ کوشش کی ہے اور کئی معنوں میں یہ اُن کی شعری شناخت کا سبب بھی بنے ہیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں شعرا کے یہاں تصوف کی تبلیغ یا اُس کی مخالفت، اصل مقصد نہیں تھا بلکہ تصوف کا سہارا لے کر یہ اپنی شاعری کو مؤثر بنانا چاہتے تھے۔ ان دونوں شعرا کے سامنے خواجہ میر درد کی مثال موجود تھی جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے تصوف کی تبلیغ کی تھی اور جس کی وجہ سے اُن کی شاعری جذبات کے مؤثر ترین اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکی تھی۔ اس لیے ان دونوں شعرا کے مذکورہ متضاد بیان کو شعری حربے کے زاویے سے بھی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر میری اس قیاس آرائی میں ذرا بھی صداقت ہے تو پھر ہم بڑے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں شعرا نے تعجب خیزی کی صورت پیدا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

دوسری قرأت:

اقبال کا ذہن مابعد الطبیعاتی تھا اس لیے تصوف کے فلسفیانہ خیالات میں اُن کی دلچسپی گہری ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے مغربی فلسفے کا بغور مطالعہ کیا اور تصوف کے ماخذات

پر بھی گہری نگاہ ڈالی۔ اس طرح اقبال کے فلسفیانہ فکر پر دو مکتب فکر کے اثرات مرتسم ہوئے۔ (۱) افلاطونی فکر (۲) متصوفانہ فکر۔ افلاطونی فکر نے جہاں ایک طرف انہیں دانش وری سے قریب کیا وہیں متصوفانہ فکر نے صوفیت سے ان کے گہرے رشتے استوار کیے۔ ان دو فکری دھاروں کے سبب ہی اقبال فہمی میں دشواری پیدا ہوئی اور اسی وجہ سے اُن کے یہاں متضاد بیان کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ اُن کے دانش ورانہ Approach ہی نے انہیں تصوف کی جمالیاتی فکر کے خلاف ردِ عمل پر آمادہ کیا۔ 'توحید وجودی' اور 'وحدت الوجود' کی مخالفت بھی اسی سبب کی۔ تصوف ہی وہ موضوع ہے جو اقبال کی دانش وری اور سخن وری کے درمیان ایک قسم کی کش مکش پیدا کرتا ہے جسے ہم اپنی آسانی کے لیے نفسیاتی کش مکش کا نام دے سکتے ہیں۔ اس کشمکش پر جتنی بھی موشگافیاں کی جائیں مگر اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہماری اردو فارسی شاعری کو اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ یہ اقبال کی نفسیاتی کش مکش ہی تھی جس کی وجہ سے خودی اور بے خودی، عشق و عرفان اور خدا و بشر کے درمیانی رشتوں پر نئے زاویے سے روشنی پڑی اور شعری و فکری تصورات کی حدیں وسیع ہوئیں۔

غالب کے یہاں بھی مابعد الطبیعاتی ذہن کے عناصر موجود تھے۔ انہیں بھی فلسفیانہ خیالات سے گہری دلچسپی تھی۔ لیکن غالب کا عہد فکری اعتبار سے مشرقی تہذیب و روایات سے زیادہ قریب تھا۔ پرانی تہذیب و روایت اپنی قدروں کے ساتھ منتقل ہوکر غالب تک پہنچی تھی۔ انہیں قدروں کے بطن سے غالب نے اپنے لیے زاویے پیدا کیے تھے اور اپنے زمانے کے علوم سے رشتہ قائم کیا تھا اور عرفان و آگہی کی حقیقتوں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مقابلے میں اقبال کا عہد فکری اعتبار سے مغرب اور مغربی علوم سے زیادہ قریب ہو چکا تھا۔ فکر و فلسفے کی نئی دنیا آباد ہو چکی تھی جسے مغرب میں رہ کر اقبال خود محسوس کر چکے تھے اور نئے علوم سے روشنی کسب کرنے کے نئے طریقوں سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔ اس لیے غالب کے مقابلے اقبال کو تصورات کی ایک بڑی دنیا میں اپنے فکر و خیالات کو آزمانے کا موقع ملا۔ اُن کا ذہن تجرباتی بھی تھا اور تجزیاتی بھی لہٰذا انہوں نے ماضی اور

حال کے رشتوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 1908ء میں یورپ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے 'وحدت الوجودی' فکر کی مخالفت کی اور 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' میں اُسے منتہی تک پہنچا دیا۔ ظاہر ہے اس سے قبل وہ نہ تو تصوف کے مخالف تھے اور نہ ہی وحدت الوجود کے۔

مغربی فکر کے زیر اثر جو کرید اور جستجو اُن کے اندر پیدا ہوئی اسی کے سبب تصوف کے بعض موضوعات پر بہت سخت تنقید بھی کی۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ''مجھے تسلیم ہے کہ میں تصوف سے کچھ بے زار ہوں۔'' یہ بے زاری کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ تھی جس کا احساس سید سلیمان ندوی کے نام لکھے گئے بہت سے خطوط سے ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک خط کا یہ اقتباس دیکھیں:

> ''میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ تصوفِ ازہر اور مسلکِ وحدت الوجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے، یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں حالانکہ حضرت محی الدین کا تصور اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔'' (مشمولہ اقبال نامہ مرتب: شیخ عطاء اللہ)

کچھ ایسی ہی بے زاری اور بے چینی اسلم جے راجپوری کے مکتوب سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

> ''..... جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم، حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اُس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔'' (مشمولہ ''اقبال نامہ'' مرتب: شیخ عطاء اللہ)

ذرا غور کیجیے یہ وہی اقبال ہیں جنہوں نے 'الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید' میں متصوفانہ تجربے کو بہت اہمیت دی تھی اور اُس کے تجزیے کو ناممکن قرار دیا تھا۔ اقبال کے متصوفانہ فکر پر جب ہم مجموعی اعتبار سے غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن

تصوف کے باب میں اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کی تلاش و جستجو پر مرکوز رہتا ہے۔ 15 جنوری 1916ء کو انہوں نے رسالہ "وکیل" (لاہور) میں لکھا بھی تھا کہ:

"اگر وقت نے مساعدت کی تو میں تحریک تصوف کی ایک مفصل تاریخ لکھوں گا۔ اللہ ایسا کرے تصوف پر حملہ نہیں بلکہ تصوف کی خیر خواہی ہے کیوں کہ میرا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ اس تحریک میں غیر اسلامی عناصر کون کون سے ہیں اور اسلامی عناصر کون کون سے۔"

علامہ اقبال کو جیتے جی اس کی سعادت حاصل نہیں ہوئی اور وہ تصوف میں اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کو ظاہر کرنے سے قبل ہی رحلت فرما گئے۔ اس لیے ان کے ذہن میں تصوف کی جو مجموعی شکل ڈھلی تھی اس پر پردہ ہی رہا۔ بعض حوالوں سے جو باتیں ہمارے سامنے آئیں ان پر نظر ڈالنے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض امور میں شدت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے اس تلاش و جستجو میں اُن سے لغزش بھی ہوئی اور وہ ویدانت اور وحدت الوجود کے فلسفے کو تقریباً ایک ہی چیز سمجھ بیٹھے حالاں کہ وحدت الوجود کا نظریہ محض وہی نہیں تھا جیسا کہ انہوں نے بعض صوفیائے کرام کے تناظر میں سمجھا تھا۔ اس لیے ان کی اس تفہیم سے ہمارے بعض علما اور اقبال شناسوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ تصوف کے تعلق سے اقبال کو بعض جگہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس کے عوامل زندگی سے گریز پیدا کرتے ہیں اور انسانوں کو متحرک کرنے کے بجائے انہیں پابند اور محدود کرتے ہیں یا پھر فرار کی ترغیب دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا ایسا سوچنا بھی درست نہیں تھا کیوں کہ تصوف کی تعلیم کی بنیاد بھی عمل صالح پر ہی ہے۔

تاہم اقبال اُس عملی تصوف کے آرزومند تھے جو ترقی اور تسخیر فطرت پر اُکساتا ہے۔ وہ اخلاق حسنہ اور تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ تنگ نظری، معاشرتی ہیئت کذائی، بے ہنگم سماجی زندگی اور ذہنی دیوالیہ پن کا بھی سدِ باب چاہتے تھے۔ اُن کی نگاہ میں صوفی کی ذمہ داریوں میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں جسے بعض صوفیائے کرام نے سرے سے نظر انداز کر دیا تھا اور اپنے حجرے میں بیٹھ کر اپنے مریدین کو محض اخلاقی درستگی اور

نفس کی صفائی کی تلقین کیا کرتے تھے۔ بغور دیکھا جائے تو مذکورہ خرابیوں کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی، نفس کی صفائی ہی سے ممکن ہے لیکن اقبال اس معاشرتی ناہمواری میں اصلاح کے لیے صوفیوں سے مزید تحریک کے خواہاں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ حجرے یا خانقاہ میں بیٹھ کر اس پسماندگی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کی متعدد غزلوں اور نظموں مثلاً ''صوفی سے''، ''خانقاہ''، ''تصوف''، ''فقر و راہبی''، ''تسلیم و رضا'' وغیرہ میں اس پر بھرپور اشارے ملتے ہیں۔ یہاں اُن کی چار مصرعوں کی نظم ''خانقاہ'' ہی کو سامنے رکھیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا:

رمز و ایما اس زمانے کے لیے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اس نظم کا پہلا مصرع ہی ہمیں یہ بتا دیتا ہے کہ اقبال زمانے کے تبدیل ہو جانے سے صوفیانہ رمز و ایما کو نامناسب سمجھتے ہیں اور براہِ راست گفتگو کے خواہش مند ہیں اور آخری مصرع میں طنز کی تیز لہر یہ بھی بتا دیتی ہے کہ خانقاہوں میں اب صوفیا نہیں بلکہ مجاور اور گورکن رہ گئے ہیں۔ اس حوالے سے مزید اشعار دیکھیے، جن میں صوفیائے کرام کے اپنے دور کے رویّوں پر بھرپور طنز ہے:

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری
حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی
تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا
مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا

اقبال کے متصوفانہ نظریے میں جہالت اور بے عملی کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ انہوں نے ایسے تصوف سے ہمیں بار بار خبردار کیا ہے جو مابعد الطبیعاتی فکر سے دور لے جاتی ہے۔ اقبال تو اُس تصوف کے دل دادہ تھے جو زہد و عبادت کے ساتھ ساتھ اخلاص فی العمل کا راستہ دکھاتا ہو۔ اقبال کی یہ صوفیانہ تعبیر، روایتی اسلامی صوفیانہ تعبیر سے مختلف تھی۔ اس تعبیر میں انہوں نے قرآن و احادیث کو ضرور ماخذ بنایا لیکن تصوف کو سائنسی اصولوں پر پرکھنے کے سبب بہت حد تک وہ خود بھی افرنگی دانش اور ایمانِ زناری کے درمیان متذبذب رہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال وہ پہلا شاعر ہے جس نے روایتی صوفیانہ تحریک پر ضرب لگائی اور سوچ کی نئی رہ گزر تلاش کی۔ انہوں نے نہ صرف قرونِ وسطیٰ کے صوفیانہ فکر میں تجدید کی صورت پیدا کی بلکہ اس کے اصطلاحات کو بھی نئے معنی اور نئے مفاہیم عطا کیے اور خانقاہی تصوف کے تصور کو بدل کر تصوف کی نئی تشکیل کی کوشش کی۔

❖❖❖

ڈاکٹر عمر غزالی (کولکاتا)

تفہیمِ اقبال : ایک مطالعہ

اردو میں غالب کے بعد اگر کسی شاعر کی سب سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں تو وہ کلامِ اقبال کی شرحیں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق ''فکرِ اقبال کی سرگذشت'' میں لکھتے ہیں :

''اردو ادب میں غالب پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی۔ تقریباً اکیس شرحیں لکھی گئیں۔ اس اعتبار سے اقبال پر توجہ نہیں دی گئی اور غالباً ایسی ضرورت بھی نہ تھی۔ مزید برآں اقبال کی تمام تخلیقات کی شرح لکھنے کے لیے ایک عمر بھی چاہیے۔ غالب کے برعکس اقبال کے یہاں وہ مشکل پسندی یا پیچیدگی بیانی نہیں اور نہ تو معمہ سازی ہی ہے کہ قاری کو سمجھنے میں دشواری ہو۔ اقبال کے چند اساسی تصورات ہیں جنھیں ان کی فکر یا پیغام کا حاصل کہا جاسکتا ہے۔ انھیں تصورات کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے ان میں نظم و ضبط ہے اور وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک پیغام اور ایک مرکزی فکر کے اظہار کے لیے ابہام اور یاوہ گوئی دونوں غیر پسندیدہ ہیں۔ اس بنیادی فکر کو ذہن میں رکھیے تو تمام اشعار

بالتحقیقات کے رشتہ دیوانہ کو سمجھنا مشکل نہیں۔ قاری کے لیے کلام اقبال کی تفہیم اور اس کا سیاق و سباق زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔"

(ناشر صائمہ حق، شفاحق، رحمن منزل، جواگھاٹ، جون پور، 1989ء، ص83-84)

یہ درست نہیں کہ غالب کے کلام کی صرف اکیس شرحیں لکھی گئیں، بلکہ اور بھی زیادہ شرحوں کا وجود عمل میں آیا۔ موصوف کا دوسرا جملہ کہ "اس اعتبار سے اقبال پر توجہ نہیں دی گئی اور غالباً ایسی ضرورت بھی نہ تھی" غور طلب ہے۔ یہاں "اس اعتبار سے" کی وضاحت ضروری ہے اور پھر ان کا یہ کہنا کہ "ایسی ضرورت بھی نہ تھی" قابل توضیح ہے۔ بہرحال، ہمارا مقصد یہاں ان کی باتوں کو الفظ کرنا نہیں ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہو سکتی ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ کلام اقبال کی شرح لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ خود اقبال کو سمجھنا ہر شارح کا کام نہیں ہے اور پھر کلام اقبال کی تفہیم و شرح اس سے بھی زیادہ مشکل امر ہے۔

ان مباحث سے قطع نظر ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ غالب کے بعد اردو میں سب سے زیادہ شرحیں کلام اقبال کی لکھی گئیں۔ اس لیے کلام اقبال کی شرحوں کا ایک مختصر سا تعارف یہاں ضروری ہو جاتا ہے، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کس نوعیت کی شرحیں سامنے آئیں۔ سب سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اقبال نے غالب کی طرح اپنے شاگردوں اور دوستوں کی درخواست پر اپنے اشعار کی شرح نہیں لکھی بلکہ حاشیاتی شرح کے رواج کو آگے بڑھایا، جس کے خالق شاہ رفیع الدین ہیں، جنھوں نے اپنی کتاب "موضح القرآن" میں اسے پہلی بار برتا ہے۔ گویا اقبال نے حاشیے کے ذریعہ ایسے اشارے دیے ہیں، جن سے اشعار کے اصل ماخذ تک رسائی ممکن ہو سکے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق رقم طراز ہیں :

"اقبال کے یہاں حوالوں کی کثرت ملتی ہے اور استفادوں کی بھی۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی سے ذکر بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی وہ انوکھا شاعر ہے۔ کثرت مطالعہ کے

علاوہ کلاسیکی روایات سے استفادہ کی یہی صورت ان کے کلام کو بے کراں اسلوب و اظہار سے تنوع بخشتی ہے۔ کہیں نفسِ مضمون ہے تو کہیں تضمین، کہیں اشارہ ہے تو کہیں حوالہ۔"

("فکرِ اقبال کی سرگذشت" ص-85)

متذکرہ سرچشموں کی شرح اگر نہیں کی گئی تو اقبال کے کلام کو سمجھ پانا کارِ محال ہے۔ اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے ماخذ اور اشاروں کی شرح لکھی۔

کلامِ اقبال کے باضابطہ شارحین میں رشید الزماں، نشتر جالندھری اور عبدالرشید فاضل جعفر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں اور کلامِ اقبال کے دو بڑے اہم شارح یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر ہیں۔ شارح یوسف سلیم چشتی نے بہت ساری شرحیں لکھی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ پہچانے بھی جاتے ہیں۔ ان کی شناخت ایک شارح کی حیثیت سے ہے جب کہ غلام رسول مہر ایک شارح ہی نہیں بلکہ ادیب و ناقد اور محقق بھی ہیں۔ ان کی شناخت پہلے بحیثیت ادیب و ناقد اور محقق کی ہے۔

شارح یوسف سلیم چشتی نے "بانگِ درا" کی شرح لکھنے سے قبل "مقدمہ" میں بعض اہم نکات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کے کیا اسباب ہیں، بیان کیا ہے :

"1- یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور دوسری کتابوں کے مقابلہ میں آسان ہے۔
(اگرچہ بجائے خود کافی مشکل ہے۔)

2- اس میں وہ غزلیں اور نظمیں ہیں جو برسوں پہلے ملک میں مشہور ہو چکی تھیں اور غزلیں تو لاہور سے حیدر آباد دکن تک لوگوں کی زبان پر چڑھ چکی تھیں، مثلاً :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

3- اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جن سے وطن دوستی (یعنی نظم) کا رنگ ٹپکتا ہے، مثلاً :

اس لیے مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

4- اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو علامہ نے انجمن حمایت الاسلام، لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی تھیں اور ان کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

5- اس میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو داغ اور میر کے رنگ میں لکھی گئی ہیں اور اس صدی کے آغاز میں یہ رنگ قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا۔

6- اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن میں مرحوم نے غیر مذاہب کے بزرگوں مثلاً گرو نانک، شری رام چندر اور سوامی رام تیرتھ کی مدح کی ہے۔

7- اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں جو "بانگ درا" کی اشاعت سے برسوں پہلے ہندوستان کے مختلف رسائل میں شائع ہو کر عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہو چکی تھیں، مثلاً اس کتاب کی پہلی نظم "ہمالہ" 1901ء میں "مخزن" میں شائع ہوئی تھی۔"

("شرح بانگ درا" ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس 1969ء، ص 8-7)

متذکرہ تمام وجوہ علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے اہم نہیں ہیں مگر وری نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہیں۔ شارح نے مقدمے کے ذریعہ کچھ ضروری چیزوں کی طرف اشارہ دیا ہے۔ مثال کے طور پر "بانگ درا" میں شامل نظموں اور غزلوں کے تین ادوار کی خصوصیات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد "بانگ درا" پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے اور اقبال کی مختلف النوع نظموں پر طبع آزمائی کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے "بانگ درا" کی دس مختلف النوع نظموں کو اس طرح سے پیش کیا ہے :

"1- فطری یا نیچرل نظمیں جن میں اقبال نے مناظر فطرت کی تصویر کھینچی ہے مثلاً ہمالہ، گل رنگیں، ابر کوہسار، آفتاب، صبح، چاند، جگنو، شمع اور بزم انجم وغیرہ۔

2- وطنی اور قومی نظمیں جن میں انھوں نے وطن دوستی کے جذبات کو ابھارا ہے یا

قوم کو عمل کی دعوت دی ہے مثلاً "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت"، "ترانہ ملی"، "نیا شوالہ"، "وطنیت"، "خطاب بہ جوانان اسلام" اور "بلال عید" وغیرہ۔

3- اخلاقی نظمیں جن میں انھوں نے قوم کو اپنے اندر اخلاق حسن پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا کسی واقعہ سے کوئی سبق اخذ کیا ہے مثلاً "کل یا مردہ"، "زہد اور رندی"، "طفل شیر خوار"، "گورستان شاہی"، "شبنم اور ستارے" وغیرہ۔

4- تاریخی نظمیں جن میں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں یا بعض مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے مثلاً "بلال"، "صقلیہ"، "غلام قادر روہیلہ"، "حضور رسالت مآب میں"، "فاطمہ بنت عبداللہ"، "معاصر اور ہرن"، "صدیق اکبر"، "بلاد اسلامیہ" وغیرہ۔

5- فلسفیانہ نظمیں جن میں فلسفہ اور حکمت کے نکتے بیان کیے گئے ہیں مثلاً "شمع"، "موج دریا"، "سرگزشت آدم"، "جگنو"، "بچہ اور شمع"، "نوائے غم"، "فلسفہ غم"، "بزم انجم"، "انسان"، "مکالمہ ارتھ" وغیرہ۔

6- دعائیہ نظمیں جن میں انھوں نے دعائیں کی ہیں مثلاً "التجائے مسافر"، "ایک آرزو"، "دعا" وغیرہ۔

7- بعض نظموں میں انھوں نے فارسی شعرا کے اشعار پر تضمین کی ہے مثلاً تضمین بر شعر انیسی شاملو، ملا عرشی، ابو طالب کلیم ضیغی، رضی، دانش، ملک بھیکی، مرزا صائب اور مرزا بیدل وغیرہ۔

8- بعض نظموں میں انھوں نے مشہور شعرا کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے مثلاً داغ، حالی، شبلی، غالب، عرفی اور شیکسپیئر

9- بعض نظموں میں انھوں نے ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماؤں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے مثلاً گوتم، رام چندر، نانک اور رام تیرتھ۔

10- ظریفانہ نظمیں جن میں انھوں نے بعض اہم معاشرتی اور سیاسی مسائل پر ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔"

("شرح بانگ درا" ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس 1969ء، ص 24-33)

اقبال کی مختلف النوع نظموں کے تذکرے کے بعد شارح نے ''بانگ درا'' کی دوسری تمام خصوصیات کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے یہاں نظموں میں فارسی ترکیبوں کا وافر استعمال، مفہوم کی وضاحت کے لیے جدید ترکیبوں کا وضع کرنا (جیسے توسن ادراک انسان، فاقہ، شاہد رحمت، قتیل ذوق، استفہام قرب، فراق آمیز یزداں، ساکنان نشیب و فراز، تپش آموز جان عشق، طوق گلوئے حسن تماشا پسند، شورش سے خانۂ انساں، دختر خوش خرام ابر، جوئے سرود آفرین، شانۂ موج صرصر، داغ مداد شب، سیارۂ ثابت نما، کلیم ذرہ، سینائے علم، مایہ دار اشک عنابی، شکست رشتۂ تسبیح و شیخ وغیرہ)، اشعار کی برجستگی، دل کشی، معنویت اور موزونیت کے سبب زبان زد خلائق ہونا، ان کی نظموں میں سوز و گداز کی کیفیتوں کی وضاحت اور ان میں 'وحدۃ الوجود' کے اثر کو واضح طور پر شاعر نے قلم بند کیا۔

اسی مقدمے اور تبصرہ کے اخیر میں شارح نے ''نوٹ'' لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شارح نے طلبا کی ضرورتوں کے پیش نظر شرح لکھی ہے۔ نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

> ''مجھے اعتراف ہے کہ اختصار کو مد نظر رکھنے کی وجہ سے ''بانگ درا'' کے محاسن شعری پر کماحقہ تبصرہ نہ کر سکا لیکن جو کچھ میں نے لکھا ہے، طلبا کی ضروریات کو پورا کرنے اور اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ اس مختصر مقدمہ کے بعد اب میں بانگ درا کی شرح شروع کرتا ہوں۔''

(''شرح بانگ درا'' ناشر: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس 1969ء ص 34-33)

کلام اقبال کی شرحوں کے جائزے کا جہاں تک سوال ہے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہمارے شارحین اقبال نے اس باب میں کون کون سے انداز اپنانے کی سعی کی ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے شرح بال جبریل کے مقدمے میں شرح بانگ درا کے مقدمے کو ہی اختیار کیا ہے مگر یہاں انداز ذرا مختلف ہے۔ مقدمے کے آغاز میں شارح نے اقبال کی

اردو کی چار کتابوں کا تقابل پیش کیا ہے۔ وہ بھی بالِ جبریل کی مقبولیت کے تعلق سے مثلاً شارح کا بیان دیکھیے :

''بالِ جبریل اردو زبان میں ہے اور شاعرانہ ہے۔ جاوید نامہ فارسی زبان میں ہے اور فلسفیانہ ہے۔''

اردو زبان میں مرحوم کے قلم سے چار کتابیں نکلی ہیں۔ ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' حصہ اردو۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان چاروں میں ''بالِ جبریل'' گلِ سرسبد ہے۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' دونوں اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ ان کا باہمی موازنہ تو بہت تفصیل طلب ہے۔ صرف اس قدر کافی ہے کہ :

''بالِ جبریل میں فلسفہ کم ہے، شاعری زیادہ ہے۔ ضربِ کلیم میں فلسفہ زیادہ ہے، شاعری کم ہے۔''

''بالِ جبریل'' کی ترکیب اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اس کتاب میں بلند اور پاکیزہ مضامین قلم بند کیے گئے ہیں جو روحانی تسکین عطا کر سکتے ہیں۔

''ضربِ کلیم'' کی ترکیب اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کتاب میں باطل کے طلسم کو پاش پاش کیا گیا ہے۔ بالفاظِ دگر :

''بالِ جبریل کا مقصد اعلیٰ، روحانی حقائق کا اثبات ہے اور ضربِ کلیم کا مقصد غلط عقائد اور باطل افکار کا ابطال ہے۔''

(''شرح بالِ جبریل'' مولفہ: (پروفیسر) یوسف سلیم چشتی 1970ء، ص 5-3)

یوسف سلیم چشتی نے ''بالِ جبریل'' میں بھی شرح بانگِ درا کی طرح خصوصیات بیان کی ہیں جو طالب علموں کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ جیسے پہلی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''بانگِ درا'' سے قبل اقبال کی تین فارسی کتابیں ''اسرارِ خودی'' (1914ء)، ''رموزِ بے خودی'' (1915ء) اور ''پیامِ مشرق'' شائع ہوئیں اور بالکل اسی طرح ''بالِ جبریل'' سے پہلے بھی ''زبورِ عجم'' (1927ء)، ''جاوید نامہ'' (1932ء) اور ''مسافر'' (1933ء)

فارسی میں لکھی گئیں جس طرح سے ''بانگِ درا'' کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اسی طرح سے ایک لمبے عرصے کے بعد جب اردو میں اقبال کی دوسری تخلیق منظرِ عام پر آئی تو جو لوگ فارسی سے ناآشنائے محض تھے، اسے کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور پزیرائی ہوئی۔ دوسری خصوصیت کے لیے ''خودی کے فلسفہ'' کو اہمیت دی کیوں کہ پہلی بار اردو میں اس تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 'عشق'، 'فقر'، 'علم'، 'فرد'، 'حیات' اور 'مومن' وغیرہ کے تصورات کی بھی شرح کی ہے۔ اس کتاب کی کئی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اقبال کی غزلوں میں جامی اور بیدل کا اسلوب بیان جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ کتاب رنگِ تغزل کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ شارح نے آخری خصوصیت کتاب کی یہ بیان کی ہے کہ اقبال نے اس کتاب کے ذریعہ سرمایہ داری (Capitalism) کے نظام کی اچھی خبر لی ہے۔

ان خصوصیات کے اظہار کے بعد شارح نے اب ''بالِ جبریل'' کی شاعرانہ خصوصیات کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ اس موضوع کے تحت بالِ جبریل کی سولہ شاعرانہ خصوصیات کا ذکر ملتا ہے جن میں کچھ اہم ہیں اور بعض خصوصیات کے اظہار سے پتہ چلتا ہے کہ شارح نے طلبا و طالبات کو مدِ نگاہ رکھ کر انھیں بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر تیرہویں خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے شارح نے لکھا ہے کہ ''بلاغت'' کی شان ''بالِ جبریل'' کے اکثر اشعار میں نظر آتی ہے۔ اب اس لفظ ''بلاغت'' کی تعریف اور اس کے الگ الگ حصوں کی وضاحت کی ہے، پھر علمِ بیان کی رو سے اس کے چار بنیادی صنائع کو واضح کیا ہے اور اس کی تعریف کے بعد مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ مگر بڑی تعداد میں ان کے یہاں تاثراتی، ادبی، علمی، تنقیدی و تحقیقی انداز کی شرحوں کی جھلک بھی ملتی ہے، جو بہت ہی اہم ہے۔

شارحینِ اقبال میں دوسرا سب سے اہم نام غلام رسول مہر کا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب (شرح) ''مطالبِ بانگِ درا'' میں یوسف سلیم چشتی کی طرح ہی ''بانگِ درا''

کی خصوصیت بیان کی ہیں جیسے :

''1- اس میں ان کے کمال فکری کی گوناگوں گل کاریاں دیکھی جا سکتی ہیں، جیسے قدرتی مناظر پر نظمیں، قومی نظمیں، فلسفیانہ نظمیں، غزلیں، مرثیے وغیرہ۔ حسن خیال دل آویزی بیان کے ایسے رنگا رنگ مرقعے کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتے۔

2- فکر اقبال کے ارتقائی مدارج کا مکمل اور جامع انداز ''بانگ درا'' سے ہی ہو سکتا ہے۔

3- اگرچہ اس کتاب میں ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جنھیں اقبال کے پیغام خاص کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاید چنداں اہم نہ سمجھا جائے لیکن جن خداداد جوہروں نے کمال بلوغ کے بعد اقبال کی عظمت کے بلند مقام پر پہنچایا، ان کے جلوے ''بانگ درا'' کے صفحات پر بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم زندگی کے ابتدائی دور میں بھی ممتاز و یگانہ سمجھے جاتے تھے۔''

(''مطالب بانگ درا'' از: غلام رسول مہر ص 3-4)

اس طرح سے غلام رسول مہر نے ''مطالب بانگ درا'' کے آغاز میں ''بانگ درا'' کے امتیاز کی مختلف وجوہ کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال اور کلام اقبال سے اپنی رغبت کی وضاحت کی ہے کہ وہ کس طرح شرح کی طرف مائل ہوئے۔ اردو کا ہر طالب علم واقف ہے کہ مہر پہلے ادیب و ناقد اور محقق تھے اور ان کی یہ بوقلمونی اور وسیع المشربی اس وقت کارگر ثابت ہوئی جب انھوں نے کلام اقبال کے مطالعہ کے دوران کچھ ایسی تشریحات دیکھیں جو اقبال کے معنی و مفہوم سے قدرے مختلف تھیں، تو اصل مفہوم کو واضح کرنا چاہا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں :

''یہ طے کر لینے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ معاون کا درجہ کیا رکھا جائے۔ آیا وہ صرف معاون ہو جس میں اتنی ہی تصریحات پر اکتفا کیا جائے جو شعروں کے سمجھنے کے لیے اشد ضروری

ہوں؟ یا ایسی شرحیں لکھی جائیں جن میں لفظوں کی بحث سے شعروں کے مفہوم اور ان کے مختلف مواد تک ہر شے آجائے؟ غور و فکر کے بعد جی مناسب سمجھا گیا کہ معاون اپنے جائز حدود سے تجاوز نہ کرے، یعنی وہ صرف اعانت دار کا فرض ادا کرے۔ ان میں محض ان چیزوں کی اجمالی تشریح ہو جو ہر پڑھنے والے پر واضح نہیں ہوتیں۔ اگر وہ واضح ہو جائیں تو شعر فہمی کا سمجھا ہوا ذوق حاصل نہ ہونے کے باوجود دل و دماغ معانی کی لذت و تاثیر سے محروم نہیں رہتے نیز اس قسم کا معاون چنداں ضخیم نہ ہوگا کہ اس کی خرید عام شائقین کی دست رس سے باہر ہو۔"

("مطالب بانگ درا" از: غلام رسول مہر ص 5-6)

شارح نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ شرح لکھنے سے قبل چند نظموں سے متعلق تاریخی پس منظر کے اشاراتی ماخذ بھی تھے جو اقبال کی نظموں کو سمجھنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔ غلام رسول مہر نے شرح کرتے وقت اقبال کی تصریحات کو بھی مدنظر رکھا ہے جنھیں خود اقبال نے متعدد نظموں اور اشعار میں فراہم کی تھیں۔ مہر اپنی شرح کی خوبی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شرح کو نہ اتنا پھیلایا گیا کہ پڑھنے والے پر بار ہو یا عام خواندہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ نہ اتنا مجمل رکھا گیا ہے کہ مفہوم تشنہ رہ جائے۔ جہاں جہاں ضروری تھا اشعار کے محاسن کی طرف بھی اشارہ کر دیے گئے ہیں۔ پوری احتیاط ملحوظ رہی ہے کہ اقبال کے مفہوم میں نہ اپنی طرف سے کوئی آمیزش ہو، نہ اسے کھینچ تان کر انفرادی تصورات کے مطابق بنایا جائے، نہ کسی ایسی تصریح کا اضافہ کیا جائے جسے نظموں کے اوقات و مواقع سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ کوشش یہی رہی ہے کہ اقبال نے جس ماحول میں خاص تصورات کے پیش نظر جو کچھ کہا ہے اسے دیانت داری سے اسی رنگ میں پیش کر دیا جائے۔"

("مطالب بانگ درا" از: غلام رسول مہر ص 6)

مذکورہ اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شارح نے کس انداز سے شرح لکھنے کی کوشش کی ہوگی اور کن لوازمات کا خیال رکھا ہوگا۔ ایسی صورت میں ان کی شرح کا معیار بلند ہوتا نظر آتا ہے۔ بقول شارح ''بانگ درا'' کی متعدد نظموں کی تفہیم وتعبیر میں لوگوں سے چوک ہوئی ہے اور اس چوک کو نظر انداز کرنے کے لیے یہ جواز روا رکھا کہ اقبال کی شاعری میں پہلے وطنیت کا غلبہ رہا، پھر اسلامی فکر وفلسفہ سر چڑھ کر بولنے لگا۔ یہ حقیقت ہے کہ فکر ونظر کے آگے بڑھتے رہنے سے جزئیات کی شرح میں ہر کسی کے انداز، اسلوب اور طریق استدلال کا تبدیل ہونا بعید از قیاس نہیں، مگر اس کے برخلاف مقاصد اور معانی کا تبدیل ہونا ممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''اقبال جیسے ابتدا میں وطن پرور تھے، ویسے آخر دم تک رہے۔ وہ پہلے بھی اپنے ملک کی آزادی اور خدمت گزاری کے سرگرم حامی تھے۔ اور یہ طبعی انسانی جذبہ آخری دور تک ان کے سینہ..... میں بدستور جوشاں رہا۔ وہ وطن پروری کے مخالف کبھی نہ ہوئے البتہ وطنیت کے یورپی مفہوم کی مخالفت برابر کرتے رہے اور اسے ملت اسلامیہ کی اساس تنظیم کے منافی بتاتے رہے۔ یہ صدائے حق انھوں نے اس وقت بلند کی جب اہل وطن قومیت کے یورپی مفہوم تک سے نا آشنا تھے لیکن یہ تعلیم یا دعوت وطن پروری کے خلاف نہ تھی۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہ تھا کہ یہاں کے مسلمان ملک کی آزادی یا اہل ملک کی صحیح خدمت سے بے تعلق ہو جائیں۔
>
> جیسے جیسے حالات بدلتے گئے، نئی نئی قوتوں کے ظہور اور سرگرمی عمل نے نئے نئے مسئلے پیدا کر دیے۔ اقبال بھی طبیب حاذق کی طرح قوم کے سامنے ضرورت واقتضائے وقت کے مطابق نسخے پیش کرتے رہے۔ جن باتوں پر انھوں نے خاص اوقات میں زیادہ زور دیا اور انھیں بہ تکرار پیش کیا، یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ان کے نزدیک بہ لحاظ وقت زیادہ ضروری تھیں لیکن ان کی بنیادی تعلیم اول سے آخر تک یکساں رہی۔ وہ ابتدا میں بھی بے لوث محبت، پرخلوص مردانہ جدوجہد اور محکم یقین وایمان کے داعی تھے۔ آخری دور میں بھی ان کی

تعلیم کے اہم اجزا یہی تھے۔ وہ شروع میں بھی تفریق و تعصب یا تنگ نظری و کم حوصلگی کو برا سمجھتے تھے۔ بعد میں بھی ان کی رائے یہی رہی۔

("مطالب بانگ درا" از: غلام رسول مہر ص 8-7)

اقبال سے متعلق مہر کی یہ رائے بڑی اہم ہے۔ اس سے مہر کی ناقدانہ و علمی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ناقدانہ صلاحیت کا استعمال جا بجا ان کی شرحوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک اچھے شارح ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اخیر میں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ :

"..... عام خواندگان کرام سے عموماً اور اہل علم سے خصوصاً میری التجا ہے کہ اگر میرے قلم سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جو ان کی معلومات کے مطابق درست نہ ہو تو لطفاً مجھے مطلع فرمائیں۔ میں دلی شکریہ کے ساتھ ان کے ارشادات سے استفادہ کروں گا۔ مقصود یہ نہیں کہ اپنی معلومات پر بے وجہ اصرار کیا جائے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ کلام اقبال کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے مستند معلومات کا ذخیرہ یک جا ہو جائے۔"

("مطالب بانگ درا" از: غلام رسول مہر ص 9)

محولہ عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ شارح کا مطمحِ نظر ہی یہ ہے کہ کلامِ اقبال کی معقول تفہیم و تعبیر سامنے آئے اور ایک جملہ بھی بھرتی کا نہ ہو کہ اقبال کا منشائے تحقیق کالعدم قرار دے دیا جائے اور شاعر کے کلام کی غلط تفہیم پیش کی جاتی رہے۔ اس کے لیے غلام رسول مہر نے یہ طریق کار اپنایا کہ نظم اقبال کی شرح سے قبل "تمہیدی نوٹ" کے موضوع سے انھوں نے تمام جانکاری فراہم کی ہے، جو عام قاری کے نقطۂ نظر سے ضروری بھی ہے۔ نظم سے متعلق ضروری واقفیت سے روشناس کرانے کے بعد ہر بند کے الفاظ کے معانی درج کیے گئے ہیں اور پھر شرح لکھی گئی ہے۔ جب کہ یوسف سلیم چشتی کا طریق کار یہ ہے کہ پہلے حلِ لغات تحریر کرتے ہیں اور جب تشریح مشکلات پیش کرتے ہیں، اس کے بعد نظم کا مطلب اور اخیر میں تبصرہ بھی کر گزرتے ہیں۔ متذکرہ طریق کار

کو دونوں نے شرح کرتے وقت برتا ہے مگر تمام نظموں کی شرح کے وقت یہی طریق کار اختیار نہیں کیا گیا ہے جب کہ کہیں کہیں اپنی مرضی اور نظم کی مناسبت سے طریق کار میں تبدیلی بھی روا رکھی گئی ہے۔

غلام رسول مہر نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اگر ایک ایک مسئلے پر غائرانہ مطالعہ کیا جائے تو شرح کی ضخامت بڑھ جائے اور عام قارئین اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے :

> ''لہٰذا تشریح مطالب کا ایسا انداز اختیار کیا گیا کہ کتاب میں زیادہ ضخیم نہ ہونے پائیں اور اشعار کا مفہوم بخوبی ذہن نشین ہو جائے چنان چہ مشکل الفاظ و تراکیب اور اشعار کے معنوی محاسن کی توضیح کے علاوہ مسائل کے متعلق بھی ایسے اشارے جا بجا کر دیے گئے ہیں کہ خوانندگان کرام ان سے بہ طریق احسن مستفید ہو سکیں۔''

(''مطالب بال جبریل'' از: غلام رسول مہر ص۔3)

اوپر کے بیان سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ شارح نے کس کس نکتے کا خیال رکھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جہاں جہاں جس چیز کی وضاحت کی ضرورت آن پڑتی ہے، اس کی تفصیل بھی پیش کر دی ہے۔ اقبال کی کتاب ''ضرب کلیم'' سے متعلق جس طرح کی رائے یوسف سلیم چشتی نے دی ہے، اسی طرح کی رائے مہر نے بھی پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

> ''عموماً دیکھا گیا ہے کہ ابتدائی دور میں شاعر کے ہاں الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اور مضامین کم۔ متوسط دور میں الفاظ و مضامین کے درمیان توازن ہوتا ہے۔ آخری دور میں مضامین و حقائق کی فراوانی کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ الفاظ کا ذخیرہ ساتھ دینے سے قدم قدم پر قاصر نظر آتا ہے۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہر مجموعۂ کلام میں شاعروں کے آخری دور کا رنگ نمایاں ہے، یعنی مضامین زیادہ الفاظ کم۔ اس نقطۂ نگاہ سے اردو میں ''ضرب کلیم'' اور فارسی میں ''ارمغان حجاز'' شعر و ادب کے بہترین مرقعے قرار پا سکتے ہیں۔ افسوس کہ حقائق

کی فراوانی کے باعث بعض اصحاب "ضربِ کلیم" کے شعری محاسن کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔"

("مطالب ضربِ کلیم" از غلام رسول مہر، ص ۱۸)

اس طرح کے تنقیدی اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شارح غلام رسول مہر اور شارح یوسف سلیم چشتی دونوں نے ایک ہی بات بیان کی ہے اور یہاں پر دونوں کی گرفت یکساں ہے مگر مہر آخر میں تنقیدی نقطۂ نگاہ سے اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ مواد و حقائق کی فراوانی کے باوجود اگر "ضربِ کلیم" کے شعری محاسن کا اندازہ بہتر طریقے سے نہ ہو تو بات قابلِ افسوس ہے۔

کلامِ اقبال کے ان دو ممتاز شارحین کی شرحوں کے علاوہ یہ سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ ایک اور شرح سامنے آئے گی جو متن و شرح کلیاتِ اقبال ہوگی لیکن یہ پاکستان میں پہلی بار کلامِ اقبال پر متن و شرح شائع ہوئی جو قابلِ قدر ہے۔ اس کتاب کا نام "متن و شرح کلیاتِ اقبال" ہے۔ اس "کلیاتِ اقبال" کی شرح میں دو شارحین نے جولانیِ قلم دکھائی ہے۔ "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" کے شارح اسرار زیدی ہیں جب کہ تشریح الفاظ کا مشکل ترین کام نثار اکبر آبادی نے سرانجام دیا ہے۔ دوسری طرف "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" کی شرح ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے لکھی ہے۔

اس لحاظ سے یہ بات پوری انوکھی ہے کہ "بانگِ درا" اور "بالِ جبریل" کے شارح کے علاوہ تشریحِ الفاظ کے لیے نثار اکبر آبادی نے پوری سعی کی۔ اس طرح کی شرح غالباً کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس کتاب کا دیباچہ شیخ عبدالقادر "بیرسٹر ایٹ لاء و سابق مدیر "مخزن" نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ اگرچہ طویل نہیں مگر پر از معلومات اور مبسوط ضرور ہے۔ اقبال کو اچھے اچھے رہنما اور علما نصیب ہوئے۔ ان میں کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارلی وغیرہ اہم نام ہیں۔ اس دیباچے کے ذریعہ یہ معلومات فراہم کی گئی ہیں کہ پروفیسر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کو انگریزی زبان میں منتقل کیا اور اس پر دیباچہ اور حواشی لکھ کر یورپ اور امریکا میں اقبال کو متعارف کرایا۔ یہاں یہ بھی

بتادینا ضروری ہے کہ یہ وہی شیخ عبدالقادر، مدیر ''مخزن'' ہیں جنھوں نے اقبال کے کلام کو اپنے رسالے میں جگہ دی۔ اور یہ اقبال کے قریبی بھی تھے جس کی وجہ سے ان تمام باتوں کا ذکر ملتا ہے جو دونوں کے درمیان ہوتی تھیں۔ اس طرح کی ملاقاتوں اور باتوں کا تذکرہ شاید ہی دوسرے شارحین اقبال کے یہاں دیکھنے کو مل سکے۔ شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں :

''شیخ صاحب اس وقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانہ میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا ہوا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت وقت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں، جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں خود وہ انھیں قلم بند بھی نہیں کرتے ..... مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونیِ طبع وہ حسبِ فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہیے، کہہ دے۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے ..... ''

(''متن و شرح کلیاتِ اقبال'' از: بانگِ درا (دیباچہ) ص 9-8)

انھوں نے اسی دیباچہ میں ایک اور اہم بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ اقبال نے جب شاعری کو ترک کرنا چاہا تو کسی شخص کی وجہ سے دوبارہ شاعری کی طرف رجوع ہوئے۔ فرماتے ہیں :

''ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھائیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے، جسے ترک کرنا چاہیے۔ بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے محسن ہے ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بے کار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عمل دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں، وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔''

(''متن و شرح کلیات اقبال'' از: بانگ درا [دیباچہ] ص10)

اس طرح دیباچہ سے بہت کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں شرح کا انداز اور اس کا طریق کار بہت ہی سادہ ہے۔ پہلے معنی کا بیان ملتا ہے اور پھر شعر یا بند کا مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ شارح اسرار زیدی نے ''بال جبریل'' کی شرح کے آغاز سے قبل ''چند گزارشات'' کے عنوان سے کام کی بنیادی باتوں کی طرف اشارہ دیا اور دوسرے شارحین اقبال پر انگشت نمائی بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''1- اقبال کے شارحین ان کے فن اور نظریات سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر تھے چنان چہ انھیں تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھنے سے شعوری یا لاشعوری طور پر گریز کیا۔

2- اقبال نے غزل اور نظم کو تکنیکی سطح پر جس طرح سے مربوط کیا اس میں جو نئے تجربے کیے اور منفرد امیجری وضع کی، ان حوالوں سے وہ اپنے عہد سے بہت آگے ہیں جب کہ شارحین کی رسائی اپنے عہد تک تھی۔ چنان چہ وہ زیادہ سے

زیادہ واقعاتی حوالوں سے بات کرتے ہیں۔

3- ان شرحوں میں اقبال کی سائنٹفک اور فلسفیانہ سوچ کو بھی اپنے ذاتی عقائد تک محدود کر دیا گیا ہے۔

4- بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری "اقبال کے ہاں تمثال نگاری میں جو بنیادی قوت ملتی ہے، وہ ان کا تہذیبی لاشعور ہے۔ یہی تہذیبی لاشعور ان کی تمثالوں کا بنیادی سرچشمہ ہے۔" غالباً یہ نکتہ بھی شارحین کی نگاہ سے اوجھل رہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی بیش تر شاعری کو ملت اسلامیہ کے خصوصی تناظر میں رکھنے کی گنجائش تو موجود ہے لیکن انھوں نے بین الاقوامی اور کائناتی سطح پر جو اشعار تخلیق کیے ہیں ان کی تفہیم کے لیے زیادہ وسعت نظر درکار ہے۔"

("متن و شرح کلیات اقبال" از: باقر، در [دیباچہ] ص 360-361)

محولہ بالا عبارتوں سے دوسرے شارحینِ اقبال کی قلعی کھل جاتی ہے، جس سے یہ علم ہوتا ہے کہ شارح نے ان ہی چیزوں پر خاص توجہ صرف کی ہے اور ان کمیوں کو دور کرنے کی سعی کی ہے، جو دوسرے شارحین کے یہاں در آئی ہیں۔ "متن و شرح کلیاتِ اقبال" کے تیسرے اور آخری حصے میں "ضربِ کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" کی شرحیں موجود ہیں۔ ان دو کتابوں کے شارح ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم نے خود ہی معنی اور مطالب بیان کیے ہیں۔ ناشر نسیم صلاحیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب کی شرح ایسے شارح نے کیا ہے، جس کی لیاقت پر کسی کو ذرہ برابر بھی شک نہیں ہوسکتا اور جو کلامِ اقبال کی روح سے بخوبی واقف ہے۔ اس کتاب کے عرضِ ناشر میں لکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ :

"1- اس میں "ضربِ کلیم" کے اشعار کے مطالب اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ جس کے پڑھنے کے بعد قاری کسی اور کتاب یا استاد کا محتاج نہیں رہتا۔

2- اس میں انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے "ضربِ کلیم" کا شعر لکھا گیا ہے اور

پھر تشریحی مطالب بیان کیا گیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو "ضربِ کلیم" کی اصل کتاب الگ خریدنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

3۔ ہر شعر لکھنے کے بعد اس شعر کے مشکل اور آسان لفظ کے معنی لکھ دیے گئے ہیں، جس کی بنا پر مبتدی قاری بھی شعر کے معانی سمجھنے میں دقت محسوس نہیں کرے گا۔

4۔ معانی لکھنے کے بعد ہر شعر کا مطلب اس طرح کھول کر بیان کر دیا گیا کہ وہ تشریح کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اسے پڑھ کر قاری شعر کی تفہیم پوری طرح کر سکے گا۔"

("متن، شرح کلیاتِ اقبال" از: بانگ درا [دیباچہ] ص 38)

"عرضِ ناشر" کے عنوان سے جن باتوں کی نشان دہی کی گئی ہے، ان میں حقیقت کا عنصر ملتا ہے مگر ان کا دعویٰ مبالغہ آمیز نظر آتا ہے کیوں کہ کوئی منجھا ہوا شارح بزعم خود اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مزید کسی اور شرح یا مطلب کی حاجت نہیں۔ ہاں، ناشر کی یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ کتاب کو اس طرح سے پروجیکٹ یا تشہیر کیا جائے کہ اس کی اہمیت بڑھ جائے اور کتاب کی نکاسی میں دشواریاں حائل نہ ہوں۔ مگر یہ ناشر کوئی معمولی ناشر نہیں ہے بلکہ اس کے اندر وہ صلاحیت ہے جس سے کتاب کی پرکھ کی جا سکے۔ اس لیے تاثیر کی بات کو سرے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کلامِ اقبال کی شرحوں کے تعارف کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم اس موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ جہاں سے کسی شارح کا نام نظر نہیں آتا بلکہ شرح مرتب کی گئی ہے۔ یہاں اس بیان کا مقصد صرف یہ ہے کہ غالباً غالب کے کلام کی بھی شرح کسی نے مرتب نہیں کی ہے جب کہ "شرحِ کلامِ اقبال" کو "حلقۂ مصنفین" پٹنہ نے مرتب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شرح درسی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کتاب میں شرح کے طریق کار کو آمد اور مفید انداز سے برتا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ حلِ مشکلات میں الفاظ کے معنی دیے گئے ہیں اور پھر اس کی شرح درج کی گئی ہے، جس کا نام خلاصہ دیا گیا ہے اور اگر مزید ضرورت محسوس ہوئی تو اسے "نوٹ" کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش

کی گئی ہے۔ ناشر نے مزید لکھا ہے کہ :

''اس شرح میں یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا گیا ہے کہ طلبہ کے علاوہ اقبال کے کلام کے دیگر شائقین بھی لطف اندوز ہو سکیں۔''

(''شرح کلام اقبال'' مرتبہ: حلقۂ مصنفین، پٹنہ عرض ناشر)

کلام اقبال کی باضابطہ شرحوں کے بعد ایک طویل فہرست ان شرحوں کی ملتی ہے جو باضابطہ تو نہیں لکھی گئیں، مگر اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ :

"Iqbal's name has already passed into a legend. He is a figure of legendary greatness amongst the poets of this country and his inclusive thought has been winning increasing attention and respect amongest discerning students of Philosophy as well as contemporary problems."

("Iqbal's Educational Philosophy" by K. G. Saiyadain, Joint Educational Advisor to Govt. of India, Published by: Sheikh Md. Ashraf, Kashmiri Bazar, Lahore, Preface, 4th Ed. 1954)

اقبال ایک عظیم شاعر، عظیم فلسفی، عظیم مسلم رہ نما اور عظیم محسن انسانیت ہیں۔ اس لیے ایک عظیم شاعر جس کی شخصیت ہمہ گیر اور وسیع المشرب ہو، اس کی شاعری کا کیا کہنا۔ ایسی حالت میں متفرق اشعار اور نظموں کی شرحوں کا در آنا کوئی مضائقہ نہیں۔ ان متفرق اشعار اور نظموں کی شرحوں کے وقت اسلوبیاتی، تاثراتی، ادبی، علمی و تحقیقی اور تنقیدی تجزیاتی مطالعے کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح کی شرحیں زیادہ تر تنقیدی کتابوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے جید نقادوں کی نگارشات میں بھی اسی نہج کی شرحوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ کلام اقبال کے ان شارحین میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، کلیم الدین احمد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عبدالمغنی، سید عابد علی عابد، مولانا صلاح الدین احمد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اپنی کتاب ''تصورات اقبال'' میں اقبال کے ان

تمام تصورات کا غائر مطالعہ اور ان کی شرح کی ہے جنھیں سمجھے بغیر اقبال اور ان کی شاعری کو سمجھنا محال ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اقبال کا تصورِ شاہین، تصورِ مملکت، تصورِ فقر، تصورِ معیشت، تصورِ معاشرت، تصورِ حسن، تصورِ خودی اور مردِ مومن کے نظریے کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر اہم باتوں کی شرح کر دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر موصوف نے اقبال کی شاعری کی دو بنیادی کیفیات کا پتہ لگایا ہے اور یہ دو بنیادی کیفیتیں ''حرارت اور حرکت'' ہیں۔ یہاں ان کی کتاب پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ صلاح الدین احمد نے اسی کتاب میں اقبال کے دس متفرق اشعار کی شرح بھی درج کی ہے، جو بہت ہی اہم ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے ایک کتاب ''اقبال اور قرآن'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کو ہم شرح نہیں کہہ سکتے مگر شرح کے زمرے میں ضرور رکھ سکتے ہیں کیوں کہ اقبال کے وہ تصورات جنھیں اپنے کلام میں برت کر انھوں نے اپنے نظریات و محسوسات اور فکر و سخن کو جنم دیا، اس کے بنیادی ماخذ کی جانکاری ضروری ہے، جو اس کتاب میں درج ہے۔ وہ اس کتاب کی تقسیم کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''تبصرہ و ذکری'' کے ذیل میں قرآن سے متعلق علامہ اقبال کے خیالات، نظریات اور واقعات درج کر دیے گئے ہیں اور ''لکل عبد منیب'' کے تحت ان کے ہر مجموعۂ کلام کے قرآنی مضامین کو حتی الامکان جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآنی آیات کا ترجمہ شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا احمد رضا خانؒ سے لیا گیا ہے اور بعض مقامات پر خود بھی کر دیا ہے۔''

(''اقبال اور قرآن'' ناشر: اقبال اکادمی، پاکستان 1988ء، ص-9)

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ''غلام مصطفےٰ خان'' نے دیدہ ریزی اور وسیع و غائر مطالعے سے اقبال کے ہر مجموعۂ کلام اور خطبات کو بھی قرآنی مضامین کے مستعارات کو پیش کیا ہے۔ ان کا انداز شرح دیکھیں :

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

(گل رنگیں)

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں "سوز و سازِ آرزو" کا ذکر ہے جو علامہ اقبال کا خاص پیام ہے۔ مسلمانوں کی خفتہ صلاحیتوں کو بے دار کرنے کا بالواسطہ حکم سورۃ الجاثیہ-13 میں موجود ہے:

وسخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض جمیعاً منہ ط ان فی ذلک لآیٰت لقوم یتفکرون ۔

(اور مسخر کر دیے تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہے، سب کا سب، اس کی طرف سے، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں۔)

پھر سورۃ البقرہ آیت-36 میں ہے :

فازلھما الشیطٰن عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ و قلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدوٌ ولکم فی الارض مستقر و متاعٌ الیٰ حین ۔

(پس شیطان نے جنت سے انھیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے ان کو خارج کرا دیا اور ہم نے فرمایا، نیچے اترو۔ آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن ہے اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے۔)

"متاعٌ الیٰ حین" سے بھی "سوز و سازِ آرزو" کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے شعر میں "چمن سے دور ہونا" جنت سے نکلنے کی طرف اشارہ ہے۔"

سورۃ المومنون آیت-20 میں ارشاد ہے :

وَشجرۃ تخرج من طور سیناء تنبت بالدھن و صبغ لّلاٰکلین ۔

''اور وہ درخت (زیتون) پیدا کیا کہ طور سینا سے نکلتا ہے، لے کر اگتا ہے تیل کھانے والوں کے لیے سالن جس طرح تیل اور سالن کے لیے زیتون ہوتا ہے اسی طرح انسان بھی ''برگ ریاض طور'' (یعنی مقدس) ہونے کی وجہ سے تخلق کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔''

اسی نظم میں اور اسی صفحے میں ایک شعر ہے :

یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغ خانۂ حکمت نہ ہو

علامہ اقبال نے (سکوت و جمود کے برخلاف عمل، ولولہ، سخت کوشی اور مشکل پسندی کی تعلیم دی ہے اور پریشانی جگر کاوی کو ہر وقت لبیک کہا ہے۔

سورۃ لقمان آیت-20 میں ہے :

''الم تروا ان اللہ سخر لکم مافی السموت و ما فی الارض واسبغ علیکم نعمہٗ ظاھرۃ و باطنۃ ط و من الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم و لاھدیً و لا کتٰب منیر ۔

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے مسخر کر دیا تمہارے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور پھر دیں تم کو اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی ہوئی اور ایک آدمی وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں۔ وہ نہ سمجھ رکھیں اور نہ سوجھ بوجھ اور نہ کتاب روشن۔

آسمانوں اور زمین کے اندر جو کچھ ہے اور جو نعمتیں کھلی اور چھپی ہوئی ہیں ان سب پر قبضہ کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کی گئی ہے اور اس طرح ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے عزم، حوصلہ اور پیہم جستجو سے ان چیزوں کو مسخر کرے اور اپنی زندگی کا ثبوت دے۔)

(''اقبال اور قرآن'' ناشر: اقبال اکادمی، پاکستان 1988ء ص209-207)

مذکورہ اقتباس میں جس طرح سے اقبال کے اشعار کو قرآن کی آیات سے مدد لے کر تشریح کیا گیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غلام مصطفےٰ خان کا مطالعہ کتنا وسیع

اور مشاہدہ کتنا عمیق ہے۔ اقبال کے اشعار کو قرآنی آیات سے رجوع کرانے کے بعد جس طرح سے اشعار اقبال کے مطالب بیان کیے گئے ہیں، وہ واقعی عالمانہ ہیں۔ اس لیے ان اشاروں اور ماخذوں کو شرح کے زمرے میں نہ رکھنا غالباً ایک بڑی غلطی ہوگی۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسرے شارحین نے اقبال کے کلام کو اسلام اور مسلمانوں کے تناظر میں پرکھنے کی سعی کی ہے جو ایک حد تک تو ٹھیک ہے مگر اس کے برخلاف کچھ دیگر شارحین نے کلام اقبال کو اپنے اپنے اصول و نظریات کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھا ہے جو گم راہی کا سبب بن سکتا ہے کیوں کہ اقبال کی فکر غالب سے یک سر مختلف ہے۔ غالب کے اشعار کو جس طرح واضح کرنا چاہیں ان کے معنی میں اضافہ ہی ہوگا مگر اقبال کے اشعار کو اقبال کے معنی میں نہ سمجھ کر کسی اور معنی کا جامہ پہنانا قطعی مہمل اور گم راہ کن ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری، اختر حسین رائے پوری اور مجنوں گورکھ پوری نے بھی اشعار اقبال پر رائے زنی کی ہے۔ وہ معنی کو اپنا رنگ دینے سے قاصر رہے، تاہم اپنے طور پر کوششیں ہوئیں جیسے علی سردار جعفری نے درج ذیل شعر کو جو "جاوید نامہ" سے ماخوذ ہے :

یا جواں مردے چوں صرصر تند خیز
شہر گیرد و خویش باز اندر ستیز
روز کیں کشور کشا از قاہری
روز صلح از شیوہ ہائے دل بری

(جاوید نامہ)

کو پنڈت جواہر لال نہرو سے مماثل اور منسلک کیا اور اس میں ان کی شخصیت تلاش کی گئی جس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں کہ :

"دور از کار مطالب برآمد کرنے میں اشعار کے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے ایسے معانی بتائے ہیں کہ علمی بددیانتی کی ایسی مکروہ تعبیریں شاید ہی ملیں۔"

("فکر اقبال کی سرگذشت" 1989ء، ص-96)

اس طرح سے خود کو اجتہادی اور جدت طراز کہلانے اور نئے نئے معانی کی پرورش و پرداخت کی خاطر گتھیاں کھولی جاتی ہیں اور پھر اسے سلجھانے کی کوشش میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں جس کے نتیجے میں اقبال کو فاشسٹ بھی کہا گیا اور دلائل بھی پیش کیے گئے جن کا حقیقت سے کوئی سروکار نہیں۔ سلیم اختر نے اپنی کتاب ''اقبال کا نصب العین'' میں بڑے اہم مضامین پیش کیے، جن میں نظریۂ شعر و فن پر بحث ملتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر شارحین کے یہاں بھی معانی کی تفہیم و تعبیر کے باب میں فنی اور شعری صناعی کی چاشنی ملتی ہے۔ عبدالمغنی نے اپنی کتاب ''اقبال کا نظامِ فن'' میں ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' کی غزلوں اور اہم نظموں کی تفہیم و تعبیر کی ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' کی چار اہم اور مشہور نظموں کی شرح بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی کتاب ''اقبال شناسی'' میں شرح کا متوازن تجزیاتی رنگ دیکھنے میں آتا ہے جیسے ان کی کتاب ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' میں۔ انھوں نے ''نقشِ اقبال'' میں بھی اقبال کی نمائندہ نظموں ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق و شوق'' کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''لالۂ صحرا'' کی انگریزی زبان میں شرح بھی لکھی گئی ہے۔ اردو کے مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اقبال: ایک مطالعہ'' میں ضروری افکارِ اقبال کی تنقیدی وضاحت کی ہے اور اسی پیرائے میں کلامِ اقبال کی چھوٹی بڑی کل تیرہ نظموں کی تفہیم و تعبیر بھی پیش کی ہے۔ ''نقوشِ اقبال'' ماہرِ اسلامیات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ہے جس میں شرح کا تجزیاتی انداز اسلامی، تہذیبی و ثقافتی ہے۔

تفہیمِ اقبال کے اس مختصر مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلامِ اقبال کی باضابطہ اور متفرق شرحیں سامنے آئی ہیں جن میں مختلف اور گوناگوں عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ایک ہی کتاب کی شرحوں میں مختلف انداز کی شرحیں دیکھنے میں آتی ہیں اس لیے یہ اندازہ لگانا کسی بھی عام قاری کے لیے امرِ محال ہے کہ کس نہج پر شعر کی تفہیم کی گئی ہے۔ تفہیمِ اقبال کے تناظر میں تاثراتی شرحیں، درسی شرحیں، ادبی شرحیں، علمی شرحیں اور تحقیقی و

تنقیدی شرحیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ غلام رسول مہر، یوسف سلیم چشتی، اسرار زیدی، ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، رشید الزماں، نشتر جالندھری اور عبدالرشید فاضل جعفر وغیرہ نے باضابطہ تفہیم اقبال کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے ماخذ اور اشاروں کے تحت تفہیم اقبال کی سعی کی ہے۔ تشریح الفاظ کا مشکل ترین کام نثار اکبرآبادی نے بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔ متفرق اشعار اور نظموں کی شرح کے وقت اسلوبیاتی، تاثراتی، ادبی، علمی و تحقیقی اور تنقیدی تفہیم کا خیال ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، کلیم الدین احمد، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، عبدالمغنی، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں وغیرہ نے بہ خوبی رکھا ہے۔ ان شارحین کی شرحوں کے علاوہ بھی دیگر شارحین کی شرحیں آتی رہی ہیں اور تفہیم اقبال کے در وا ہوتے رہے ہیں۔ تفہیم اقبال کا یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے اور بعد تک قائم رہے گا۔

❖❖❖

ڈاکٹر سرفراز جاوید (نئی دہلی)

اقبال اور ضمیرِ کن فکاں

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

یہ شعر ''بانگِ درا'' کی معروف نظم ''خضرِ راہ'' کے بند زندگی کا ہے اور یہی شعر میرے مضمون کے مباحث کا محور و مرکز ہے۔ کلامِ اقبال میں افکار کا سیلاب ہے اور یہ سیلاب طوفان بدوش ہے۔ جس کے فکر و پیغام کی پنہائی بھی وسعت طلب ہے۔ اس کو گرفت میں لانا سعیِ مشکل ہے۔ ان کے بعض مرکزی خیال اشعار میں نقطۂ پرکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تشریح و تعبیر کے لیے دفتر درکار ہیں۔ ایسے اشعار بکھرے ہوئے خیال پاروں کی طرح کلام میں اضطرابی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ''خضرِ راہ'' کا یہ شعر بھی ان ہی میں شمار کیا جائے گا۔ راقم کا خیال ہے کہ اس مفہوم کو فکرِ اقبال کا سرنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ بڑا انقلابی شعر ہے اور اس کا پس منظر بھی ایک عالمی نظام کے طلوعِ صبح کی طرح

نور آفریں ہے۔ اقبال کا اساسی فلسفہ خودی ہے۔ خودی تخلیقی فعالیت کا دوسرا نام ہے۔ خودی کا احساس تعمیر و تخلیق کی بیرونی یا خارجی صورت گری کا نام ہے۔ کائنات کے ساتھ اپنے وجود کو نت نئی آن میں پیش کرتے رہنے کا نام خودی ہے۔ اسی باعث اسے بخشی ہوئی جنت بھی اچھی نہیں لگتی۔ یہی فکری فعالیت ہے جو اسے مضطرب رکھتی ہے اور نئی سے نئی تخلیق کے لیے آمادہ کرتی رہتی ہے۔ اسی باعث وہ کہتا ہے :

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

بنی آدم اس جہانِ فانی میں اپنے احساس و فکر اور فعل و عمل کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اس مردِ کار نے عالم رنگ و بو کی گہ۔ بانی ہی نہیں کی بلکہ اس کی تزئین و تشکیل کو بھی اپنے ذمہ لے رکھا ہے کیوں کہ فطرت کا کام خام مواد فراہم کرنا ہے اور انسان بکھرے ہوئے خام مواد جیسے پتھروں سے اہرامِ مصر یا تاج محل کے ایوان تعمیر کرتا ہے۔ قدرت نے جنگل و بیابان بنائے ہیں اور انسان اپنے ذوقِ تعمیر سے انھیں چمن زار و باغ میں تبدیل کرتا ہے۔ رات کی تاریکی کو روشن چراغوں سے پرنور بناتا ہے۔ یہ مباحث اقبال کی فکر میں اساسی ندرت کے حامل ہیں اور وہ سب کے سب اسی شعر کے معانی کی تفسیریں ہیں۔ اقبال اس انتہائے فکر کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ جو کام فطرت نہ کر سکی ہو، وہ ہمیں کرنا چاہیے۔ اب اسی سیاق میں مندرجہ ذیل شعر کے نکات پر غور فرمائیں :

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

علامہ اقبال کے فکر و پیغام پر قلم اٹھانے سے قلم اپنی علمی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے کیوں کہ اقبال کے علمی و فکری دبستان کی افہام و تفہیم کے لیے اردو، عربی، فارسی ادب، فلسفہ، تاریخ، اسلام، قرآنِ حکیم اور احادیث کے کماحقہٗ علم کی ضرورت ہے۔ جملہ علوم پر دسترس کے بغیر کوئی علمی نتیجہ برآمد کرنا از حد مشکل ہے۔ اس لیے یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ میری اس تحریر کو محض علامہ اقبال کے کلام سے محبت و عقیدت کا اظہار سمجھا

جائے نہ کہ کوئی علمی کاوش۔

عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال کو بے مثال دماغ اور غیر فانی فکر و عمل کی قوت سے نوازا تھا مگر یہ ہماری کم نصیبی نہیں، تو کوتاہی ضرورت ہے کہ ہم ہنوز اقبال کے کلام میں پوشیدہ افکار کی قدرت کو بروئے کار نہ لا سکے۔ ہاں یہ ضرورت ہے کہ اقبال کے چاہنے والے اپنی نیازمندانہ سعیِ پیہم میں مصروف ہیں اور کلامِ اقبال سے حکمت و دانائی کے نایاب گوہر منظرِ عام پر لانے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ مزید گفتگو کرنے سے قبل، مقالے کے آغاز میں پیش کیے گئے شعر کے نکات پر غور فرمائیں :

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

بہ ظاہر یہ شعر صیغۂ واحد میں ہے، مگر شاعر تمام زندہ اشخاص سے مخاطب ہے۔ مزید کچھ عرض کرنے سے قبل پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے الفاظ میں شعر کی تشریح پیش ہے :

> ''اگر تو ہمیشہ زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو اپنی دنیا آپ پیدا کر یعنی عملِ صالح کی بدولت حیاتِ جاوید حاصل کر لے۔ زندگی سرِ آدم ہے اور رازِ کن فکاں ہے یعنی زندگی کی اصل حقیقت ایک جوش و ولولہ ہے جس کی بدولت وہ ظہور کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ زندہ وہ ہے جو خدا کی طرح نئی دنیا پیدا کر سکے۔''

محولہ بالا تشریح پر کلام سے قطع نظر یہ بات بدیہی ہے کہ علامہ اقبال شعر کے مصرعِ اولیٰ میں بنی آدم سے مخاطب ہیں اور بنی آدم بھی وہ جو زندوں میں ہو۔ یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ اقبال زندہ یعنی متحرک و فعال انسانوں سے مخاطب ہیں، مردوں یعنی بے حس و مجہول لوگوں سے نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ زندہ اور متحرک انسان کون ہے؟ اور وہ کیسا شخص ہو سکتا ہے؟ اس سے یہاں پر یہ نکتہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک بنی آدم کے جسدِ خاکی میں طبعی زندگی کا ہونا یعنی محض انفاس کی تکرار کا ہونا، کسی

شخص کے زندہ ہونے کی علامت نہیں ہے۔ اقبال کے مطالعہ میں یہ بات بہت اہم ہے کہ خاک کے تودے یا ڈھیر کی مانند جسم رکھنے والوں سے وہ سروکار نہیں رکھتے جس میں شعلہ و شرر نہ ہو۔ وہ تڑپنے پھڑکنے کی توفیق طلب کرتے ہیں۔ وہ آزمائش کے قائل ہیں۔ اس مردِ ناداں کو بھی ناپسند کرتے ہیں جس میں درد اور فہم کا شعور نہ ہو۔ انھوں نے تاکید کی ہے کہ ایسا بے شعور انسان کلامِ اقبال کے قریب نہ آئے جو مثلِ پتھر منجمد ہے، جسے حرکت، حرارت، جنبش یا تصادم کا ذوق نہ ہو۔ وہ زمین پر بار اور انبار کا ڈھیر ہے۔ یہاں اسی سبب اقبال زندہ و تواناں سے مخاطب ہوئے ہیں اور جو تگ و تازِ حیات یا مجاہدات کے جذبے سے محروم ہے وہ انسان راکھ کا ڈھیر ہے۔

اب یہاں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ اقبال کے زندہ انسان یعنی کون اور کیسے ہونے چاہیے پر گفتگو کرنے کے لیے قرآن کریم کی سورۂ انعام کی آیت نمبر 122 سے رجوع کرتے ہیں:

و من کان میتا فاحییناہ و جعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمت لیس بخارج منھا ، کذلک زین للکفرین ما کانو یعملون

(ترجمہ: کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے اجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح ان سے نہ نکلتا ہو؟ کافروں کے لیے تو اسی طرح ان کے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں..... تفہیم القرآن)

اب اس ترجمہ کی روشنی میں یہ مفہوم سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو میت یعنی مردہ اور مومن کو حی یعنی زندہ قرار دیا ہے کیوں کہ قرآن حکیم کی رو سے کافر ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور وہ ظلمت سے نکل نہیں پاتا جس کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور مومن کے دل کو اللہ تعالیٰ، ایمان کے ذریعہ روشنی عطا کر دیتا ہے جس سے زندگی کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں، وہ صحیح راستے پر گام زن ہو جاتا ہے یعنی انسان

کو حق و باطل، نیکی و بدی اور درستی و نادرستی کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔

اب مصرع ثانی پر مختصراً عرض ہے کہ اقبال نے انسان کی زندگی کے تعلق سے دو ترکیبیں وضع کی ہیں۔ اول سرِ آدم اور دوم ضمیرِ کن فکاں ہے۔ یہ دونوں اپنا مخصوص پس منظر رکھتی ہیں اور یہ وضاحت طلب ہے کہ آخر سرِ آدم اور ضمیرِ کن فکاں کیا چیزیں ہیں؟ عرض یہ ہے کہ سرِ آدم اور یعنی انسان کا راز کیا ہے؟ اس کے اصل راز کو تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس راز کو تھوڑا بہت سمجھنے کے لیے خالقِ آدم کے کلام سے رجوع کرنا مناسب ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ الحجر کی آیت نمبر 29 کا ترجمہ پیش ہے :

فاذا سویتہٗ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ سجدین.

(ترجمہ: جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔" (تفہیم القرآن)

دوسری ترکیب ضمیرِ کن فکاں کی ہے۔ ضمیر یعنی باطن، راز، بھید اور باطنی قوت ہے اور **کن فکاں** دراصل **کُن فیکون** کا مخفف ہے۔ یہ اللہ کا خاص لفظ ہے جو امرِ ربی ہے اور وہ کُن کہہ کر ہر چیز کو وجود بخش دیتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم کی سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 59 کا ترجمہ پیش ہے :

ان مثل عیسیٰ عند اللّٰہ کمثل آدم ، خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون

ترجمہ: "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔" (تفہیم القرآن)

عرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی تخلیق کے لیے خصوصی اہتمام فرمایا ہے۔ اس اہتمام کی جلوہ گری پوری کائنات میں عام طور پر اور حضرتِ انسان میں خاص طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں پر یہ بات عرض کرنا مناسب ہے کہ جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت عطا کرتی ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفاتِ حسنہ کا پرتو بنی آدم میں ڈالا گیا ہے، اس سے دیگر مخلوقات سرفراز نہیں کی گئی

ہیں۔ بنی آدم جملہ کائنات میں اس لیے اشرف ہے کہ خدا نے انسان کے وجود خاکی میں کچھ پھونکا اور زندگی کی شرف یابی عطا کی۔ اور ارادہ و اختیار کا مجاز بنا کر اسے اچھے برے عمل پر تعمیل کی قدرت عطا کر دی اور نتیجۂ عمل کو اللہ نے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور یہ بات صد فی صد درست ہے۔ اسی لیے سقراط نے ڈھائی ہزار سال قبل کامیابی اور ناکامی کے تعلق سے کہا تھا کہ آپ کو ہر عمل، ہر بات، ہر شے کے چناؤ کی آزادی ہے مگر آزادیِ چناؤ کے بعد چنیدہ عمل، انتخاب رائے اور منتخب شے کے مطلوبہ نتائج کا حصول آپ کی دسترس سے باہر ہے کیوں کہ نتیجہ کے منشا کی آزادی آپ کے پاس نہیں، اس کا تعین دوسرے کریں گے۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح کا عمل کریں گے، نتائج اسی کی روشنی میں برآمد ہوں گے۔

اقبال اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والوں یعنی زندہ انسانوں، خاص طور سے مسلمانوں کو اپنے شعری پیغام کے ذریعہ مہمیز کرتا ہے اور جرأت بخش کر ان کو ان کی حقیقت سے آگاہ بھی کراتا ہے۔ اسی تعلق سے شمع اور شاعر کا پورا بند بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے چند اشعار پیش ہیں :

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

دیکھ آ کر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوف باطل کیا ہے کہ غارت گرِ باطل بھی تو
بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اقبال چشمِ بینا، زندہ شخصیت کی پہچان بتاتے ہیں :

جو ہے پردوں میں پنہاں، چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

اقبال زندگی کا راز، انسان کی کوشش ناتمام میں دیکھتے ہیں :

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ نخجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے زندہ انسان کون اور کیسے ہوں تو میزانِ اقبال میں وہی ہو سکتے ہیں جو فکر و عمل کی تحریک کے مجاز ہوں، جس کے ذریعہ وہ ذاتی اور اجتماعی طور پر اچھے عمل کرنے اور برائی سے رکنے اور روکنے والے ہوں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیکر ہوں اور ان کے فکر و عمل کا ارتکاز اجتماعی مقاصد پر ہو اور وہ اپنی اور دوسروں کی سرنوشت کے سلسلہ میں بے اعتنا نہ رہتے ہوں اور مزید ہم دردی کے جذبے کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے کے دیگر افراد کو ضلالت و گم راہی سے نجات دلانے والے ہوں اور معاشرے کی روحانی، سیاسی اور سماجی ذمہ داری قبول کرتے ہوں۔

اقبال کے یہاں زندہ انسان وہی ہیں جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے ساتھ سرِ آدم اور ضمیرِ کن فکاں کا عرفان رکھتے ہوں اور آدمیت یعنی انسان کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہوں جس سے ان کے مقصد و منشا میں اللہ رب العزت کی مشیت کارفرما ہو جائے۔ جو اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کی معراج ہے اور یہ معراج انسان کو اسلامی نقطۂ نظر اور طرزِ عمل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرزِ عمل میں حضور ﷺ کی کامل اتباع لازمی ہے۔

اسی بنیاد پر زندہ انسان کامرانی کی سعادت سے سرفراز ہوں گے، جن سے دنیا کو ہر قسم کا اطمینان ہی نہیں بلکہ خیر و برکت بھی حاصل ہوگی اور یہ زندہ انسان عام انسانوں کی مصلحتوں کو ان سے زیادہ جاننے والے اور خیال رکھنے والے ہوں گے اور مزید دنیا کے لیے بہتر نگہ بان ثابت ہوں گے۔

اور یہ زندہ انسان ذاتی مفاد سے بے نیاز اور دنیا کے ہر لحہ کو بیش قیمت تصور کرنے والے ہوں اور وہ مادہ پرست، مردہ انسانوں کی طرح دنیا کو خوانِ کرم تسلیم نہیں کریں گے اور وہ اس دنیاوی مال و متاع پر بھوکوں اور ہوس کاروں کی مانند ٹوٹ پڑنے والے نہیں ہوں گے اور وہ اس زندگی کو اللہ کی نعمت جان کر اس دنیا سے صرف اور صرف حیات و زیست کے لیے ناگزیر احتیاجات پورا کریں گے اور اسراف و تبذیر سے اجتناب کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والی فعال و پرجوش شخصیتیں اپنے اثر و نفوذ سے دنیا اور عام زندگی کا رخ تبدیل کر دیتی ہیں۔ مزید یہ کہ انسانوں کا مزاج، ذہن و قلب بدل کر غلط اخلاقی قدریں اور چھوٹے پیمانے تبدیل کر دیتی ہیں اور یہ نظامِ حکومت، سماجی زندگی اور طرزِ معاشرت میں دخیل ہو کر اسے اخلاقی اور معیاری درجہ عطا کر دیتی ہیں اور یہ عہدِ تمدن میں تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق و فضیلت کو فروغ بخشتی ہیں اور انسانی جوہر و کمالات، علم و ذہانت اور طبیعت کی جولانی کو ضائع اور بے محل صرف ہونے سے روک دیتی ہیں۔ غرض کہ انسانیت کے قافلہ کو مادی اور روحانی ترقی کے ساتھ صحیح منزلِ مقصود کی جانب گام زن رکھتی ہیں۔ دراصل وہی زندہ انسان یعنی ضمیر کن فکاں کے مصداق ہوتے ہیں جو کسی بھی شعبہ میں قافلہ سالار بن کر بنی آدم کی خدمات انجام دیتے ہیں اور عوام کو بندوں کی بندگی سے نکال کر وحدہٗ لاشریک کی بندگی کا عادی بناتے ہیں۔ یہی بنیادی خیال تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ان کے پورے کلام میں روحِ رواں بن کر جاری ہے۔ وہ شعر آپ کو یاد دلانا چاہوں گا جو اس کا تتمہ ہے اور سب سے زیادہ انقلابی فکر کا داعی بھی ہے:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

دراصل انسان کو اس جہانِ کارزار میں سورۂ رحمٰن کی آیت کے ٹکڑے کل ھو فی شان کے مصداق ہونا چاہیے یعنی جیسے ہمارا رب وحدہٗ لاشریک اپنی شان کریمی سے کائنات کو نت نئی وسعت بخش رہا ہے۔ الغرض کائنات میں جملہ تصرفات اسی کے امر و مشیت سے بروئے کار آ رہے ہیں۔ وہ ہر ساعت پے در پے نئی نئی چیزوں کو نئی نئی شکلوں اور صفات کے ساتھ وجود بخش رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بنی آدم کو بھی اس کی شریعت کے تابع رہ کر ہر آن کسی نہ کسی عمل میں مصروف رہنا چاہیے، جو کبھی کے مفاد میں ہو اور ہمیں حیاتِ ارضی کے دن رات میں گم ہونے کے بجائے دیگر زمان و مکان کی تگ و دو میں رہنا چاہیے :

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ہم سب خدا کے بندے ہیں اور ہم سب کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس دنیا کو خوب صورت بنانے اور سنوارنے کے لیے خدائی احکام کی روشنی میں اپنی استعداد و اوصاف کو بروئے کار لاتے ہوئے نئی راہیں تلاش کریں اور ہمارا ہر قدم نئی منزل کی تلاش میں ہمہ دم سرگرداں رہے۔

❖❖❖

ڈاکٹر علی احمد ادریسی (نئی دہلی)

اقبال کی شخصیت عطیہ فیضی کے خط کی روشنی میں

علامہ اقبال نے 1910ء میں حیدر آباد کے سفر کے بعد عطیہ فیضی کو جو خط انگریزی میں لکھا تھا، اس کی روشنی میں اس کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ۔(1) میں ایک سیدھی سادی، دیانت دارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔(2) میرے دل اور میری زبان کے درمیان پوری موافقت ہے۔(3) اگر شہرت، عزت اور ستائش حاصل کرنے کے لیے مجھے منافقت اختیار کرنی پڑے تو گم نامی اور کس مپرسی کی حالت میں مرنا زیادہ پسند کروں گا۔(4) عوام الناس کی تعریف حاصل کرنے کے لیے میں ان کی رسوم و روایات کے سامنے سر جھکانے اور ذہن انسانی کی آزادی کو دبانے سے بالکل قاصر ہوں۔(5) میں قوت شعری کے اعتبار سے بائرن، گوئٹے، شیلی سے کم تر ہوسکتا ہوں لیکن اس اعتبار سے ان کا ہم سر ہوں کہ ان کے معاصرین کی طرح میرے معاصرین بھی میری عزت نہیں کرتے۔(6) میں خود کو پرستش کے قابل نہیں سمجھتا کیوں کہ میں فطرتاً خود پجاری ہوں، لیکن اگر میرے

چھپے ہوئے خیالات لوگوں پر ظاہر ہو جائیں تو وہ میری کوتاہیوں کو بھول کر میری پرستش کریں گے اور مجھے آنسوؤں سے خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

اقبال کو قدرت نے پیش بینی اور پیش گوئی کی جو زبردست صلاحیت دی تھی، مذکورہ بالا سطور کے آخری حصے سے پوری طرح ظاہر ہو رہی ہے۔ ان کے افکار کے ظاہر ہو جانے پر ان کے کلام اور ان کے افکار کو جو غیر معمولی قبولیت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اسے شاعری کی زبان میں پرستش ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں دل گدازی اور رقت انگیزی کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ ان کے اشعار جس طرح انسانوں میں وفورِ جذبات کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں، اس کے پیشِ نظر اقبال کی یہ پیشن گوئی بھی غلط نہیں کہ لوگ آنسوؤں کی صورت میں مجھے خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ تاہم ان سطور میں اقبال نے اپنی زندگی کی جس خصوصیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، وہ ایک سیدھی سادی اور دیانت دارانہ زندگی ہے۔ سیدھی سادی سے مراد زیادہ تر طرزِ زیست لی جا سکتی ہے اور دیانت داری کا تعلق زندگی کی عملی اخلاقیات سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اپنی خاندانی روایات اور اپنے طبعی میلانات کی رو سے ایک بے ریا اور بے تکلف زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں کہیں بھی ریاکاری کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح انھوں نے معلومہ حد تک اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی قانوناً یا اخلاقاً کسی بددیانتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی شہرت، عزت و ستائش کی خاطر منافقت سے کام لیا۔ اگر ان میں منافقت کا عنصر ہوتا تو وہ بنیادی اعتبار سے کہیں زیادہ کامیاب انسان ثابت ہوتے۔ اہلِ منصب اور اربابِ ریاست سے ان کے مراسم ضرور تھے، لیکن ان مراسم کی خاطر انھوں نے اپنی ذہنی آزادی اور عزتِ نفس کو کبھی قربان نہیں کیا۔ وہ بیک وقت ایک حقیقت پسند اور خواب بیں انسان تھے۔ اپنی ذاتی زندگی میں حقیقت پسند اور قوم و ملت کے ایک خواب بیں، لیکن اس خواب بینی میں بھی ان کی نظر ہمیشہ خارجی امورِ واقعی اور معروضی حقائق پر ہوتی تھی۔ وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ ان میں

سچا انکسار بھی موجود تھا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلی کے مقابلے میں اپنے آپ کو کم تر شعری صلاحیتوں کا حامل قرار دینا تو ان کی انکساری کی بدولت ہے۔

ان کے دل اور ان کے زبان (قلم) کے درمیان جو حیرت انگیزی موافقت تھی، اس کے اخلاقی مضمرات و ثمرات سے قطع نظر اس کی نفسیاتی معنویت بھی کم اہم نہیں۔ اقبال کی پوری زندگی ایک بے پناہ تخلیقی عمل سے دکھائی دیتی ہے جس میں از اول تا آخر شاعر کے دل اور زبان یا قلم میں حیرت انگیز حد تک کامل مطابقت دکھائی دیتی ہے۔ ان کی زندگی میں اس حقیقت کے آثار و شواہد ان کے عنفوانِ شباب ہی سے ملتے ہیں کہ وہ اپنے ہر خیال اور ہر جذبے کو موزوں اور مناسب پیرائے میں بیان کرتے چلے جانے کے عادی تھے۔ خیال اور اس کے اظہار میں ان کے یہاں ایک مکمل یگانگت دکھائی دیتی ہے۔ تحلیلِ نفسی اور تحلیلِ نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ ان کی ذہنی صحت کی سب سے بڑی علامت تھی کہ ان کا اندرونی مکالمہ ایک دن کے لیے بھی بلکہ شاید ایک لمحہ کے لیے بھی رکا نہیں۔ مجلسی زندگی اور شاعری میں ان کا مخاطب کوئی بھی رہا، ان کی ساری زندگی میں وتو کے مکمل اور بھرپور رشتے کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے 'تو' کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ان کا علم و فضل ان کی وسعتِ مطالعہ اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کی ضمانت، ان کے بروقت لکھے ہوئے خطوط اور ان کی مجلسی زندگی کے احوال بتاتے ہیں کہ انھوں نے زندگی کے کسی تجربے، کسی خیال اور کسی صورتِ حال کو فکری اور تخلیقی اعتبار سے ضائع ہونے نہیں دیا۔ بے شک انھوں نے دنیاوی زندگی کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا اور اپنی پوری زندگی ملتِ اسلامیہ کی احیا و اتحاد کے لیے وقف کیے رکھی لیکن انھوں نے دنیاوی زندگی کو حقیر اور ناقابلِ اعتنا گردانتے ہوئے اسے رد بھی نہیں کیا اور اسے قبول کرتے ہوئے کبھی اپنے انسانی وقار پر بھی آنچ نہیں آنے دی۔

اکبر الہ آبادی، مولانا حالی اور مولانا گرامی کے ساتھ اپنے روابط میں انھوں نے

ثابت کر دکھایا کہ وہ بزرگی اور بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ داغ دہلوی، پروفیسر آرنلڈ اور سید میر حسن کے لیے ان کے احترام اور محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ جن معاصرین نے ان سے اختلاف رائے کیا، اقبال نے ان کے ساتھ مراسلت میں بھی تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ معیاروں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ انھوں نے اپنے کسی مخاطب کی کبھی تحقیر نہیں کیا لیکن کسی مخاطب سے کبھی مرعوب بھی نہیں ہوئے۔ وہ اعتراف کے قائل تھے لیکن کسی سے مرعوب نہیں تھے۔ علمائے کرام کا وہ بالعموم بے حد احترام کرتے تھے اور کسی مسئلے میں استفسار کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔

وہ جس شہر میں بھی جاتے تھے، وہاں کے اہل کمال سے ملنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اگرچہ وہ جہاں بھی جاتے، ان کی پذیرائی کا اہتمام پہلے سے ہو چکا تھا لیکن اگر انھیں ارباب کمال کی خدمت میں خود حاضر ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی تو ایک پل کے لیے بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ علمی حوالوں کی تلاش میں وہ اپنے دوستوں کو مسلسل خط لکھتے تھے۔ ایک بیٹے کی حیثیت سے وہ عمر بھر اپنے والد کے تابع فرمان رہے۔ ''اسرار خودی'' انھوں نے اپنے والد کے کہنے پر ہی لکھی تھی۔ ان کے والد نے ان کو خدمت اسلام کی نصیحت کی تھی۔ اس نصیحت پر انھوں نے عمر بھی عمل کیا۔ ان کے بڑے بھائی ان کی تعلیم کی تکمیل میں ان کے بہت محسن تھے۔ اقبال نے ان کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ بچوں کی مثالی تربیت کے قائل تھے اور انھیں عملی زندگی کا پورا پورا شعور دینا چاہتے تھے۔ وہ ساری زندگی مرجع خلائق رہے لیکن اس پر کبھی نازاں نہیں ہوئے، نہ ملاقاتیوں کی کثرت نے ان کے مزاج کو کبھی مکدر کیا۔ وہ ہر سوال کا جواب علمی نقطہ نظر سے دیتے تھے لیکن کبھی کبھی ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ظرافت بھی علمی نکات سے مملو ہوتی تھی۔

وہ ہر محفل میں مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کر لیتے تھے، لیکن دوسرے کے اظہار ذات کے حق کو اسی طرح تسلیم کرتے تھے جس طرح اپنے حق کو۔ وہ نجی گفتگوؤں

میں بھی ہر خیال کو اس کے انسانی، نفسیاتی، تاریخی اور تمدنی پس منظر میں رکھ کر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ تحریر و تقریر میں ان کے یہاں خیالات اور الفاظ کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی گفتگو میں خاموشی کے معنی خیز وقفے آئے تھے۔ اسی طرح ان کے مکالمے میں توازن اور گہرائی پیدا ہوئی تھی۔ انھیں اپنے آبائی وطن کشمیر سے بے حد محبت تھی، لیکن انھیں پوری اسلامی دنیا سے عشق تھا۔ وہ مردم شناس تھے اور ان میں پیش بینی کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان کا ذہنی عمل فکر و تخیل کے ایک انوکھے امتزاج سے عبارت تھا۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع تھا لیکن انھوں نے الفاظ کا کبھی بے جا استعمال نہیں کیا۔ وہ ہر اعتبار سے خوش ذوق تھے۔ انھیں ماضی سے لگاؤ تھا لیکن ان کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی تھی۔ وہ فلسفے کے طالب علم تھے لیکن فلسفے کو انھوں نے اپنے ذہن کی آزاد فعلیت پر کبھی حاوی نہیں ہونے دیا۔ اردو اور انگریزی اور بعض اوقات جرمن زبانوں میں ان کا خط بے حد خوب صورت ہوتا تھا۔ اردو میں خطِ شکستہ یا خط دیوانی میں لکھتے تھے اور بے حد روانی سے لکھتے تھے۔ یہی روانی اور حسنِ تحریر ان کی انگریزی تحریروں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں اسلام کے سب سے بڑے مفکر تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ایسا نہیں کہا بلکہ اپنے آپ کو فقیر اور قلندر جیسے منکسرانہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ ان میں سچا عالمانہ انکسار تھا، جو سچے عالمانہ وقار سے کبھی خالی نہیں تھا۔ ان کی زندگی تصنع اور بناوٹ سے یکسر عاری تھی۔ ملنے جلنے والوں سے بے تکلفی کے باوجود حفظِ مراتب کے قائل تھے۔ ان کی شخصیت کی سادگی بے حد مسحور کن تھی۔ ان کی صحت دل و دماغ کو آسودگی بخشتی تھی۔ وہ اپنی زندگی ہی میں شاعرِ مشرق کہلائے لیکن عام محفلوں اور مشاعروں میں انھیں اپنے شعر سنانے سے گریز تھا۔ وہ جوانی میں گوئٹے اور غالب کے مداح تھے لیکن بقیہ عمر وہ مولانا روم کے مداح اور انھیں کے مستفیض رہے۔ اولیاء اللہ اور سلاطینِ اسلام کے مزاروں پر حاضر ہونے کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے اور ایسے مواقع پر اکثر ان پر رقت طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن رسمی اور انحطاطی تصوف کے زبردست ناقد تھے۔

آں حضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ان کی محبت عشق کا درجہ رکھتی تھی اور عشقِ رسول ﷺ ان کی زندگی کا سب سے گہرا، سب سے شدید اور سب سے پائیدار جذبہ تھا جس سے ان کے تمام ذہنی اور فکری رشتے وابستہ تھے۔ انھیں اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام آثار یکساں طور پر مسحور کر لیتے تھے لیکن ان کی انتقادی صلاحیتیں بھی ہمیشہ پائیدار رہتی تھیں۔ اقوامِ عالم میں وہ جرمن اور ترک اقوام کو بہت پسند کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے خیالات اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بیان کیے ہیں حالاں کہ ان تینوں میں سے کوئی بھی ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ وہ اردو ادب کے سب سے بڑے اور مولانا روم کی تمدن کے سب سے بڑے شاعر تھے لیکن اپنے آپ کو شاعرِ اعظم کہلانے سے گریزاں تھے۔ وہ واقعی ایک انوکھے اور نادرالظہور شاعر تھے۔ اردو شاعری اور ادبِ عالیہ نے ایسا انقلاب آفریں اور تاریخِ ادب نے ان سے بڑا عہد ساز شاعر اب تک نہیں دیکھا۔

❖❖❖

ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی علیگ (کولکاتا)

اقبال، بنگال اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی

علامہ اقبال غیر منقسم ہندستان کے ایک ایسے درِ نایاب، بطل جلیل اور جاں نثار سپوت تھے جن پر جنت نشان ہندستان کے ہر باشندے کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ سرزمین ہندستان کی تاریخ میں اقبال جیسا عظیم شاعر نہ ان سے پہلے پیدا ہوا اور نہ ان کے بعد۔ اقبال کو محض شاعر کہنا بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ صرف شاعر نہیں تھے۔ شاعری کو تو انہوں نے بس اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''اقبال باوجود اتنا بڑا اور مشہور شاعر ہونے کے، شاعر نہیں ہے، بلکہ اپنے پیام سے مقام نبوت کی جانشینی کا حق ادا کر رہا ہے۔ اقبال نے پیغمبرانہ اور الہامی شاعری کا جو نمونہ و مجموعہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس نے انہیں ایک بے مثال رتبۂ بلند عطا کر دیا ہے۔''

مولوی عبدالحق نے بجا فرمایا ہے کہ:

"اگرچہ اقبال نے اپنے شعر میں ہمیشہ عقل سے نفرت اور جنون سے رغبت پیدا کرنے کی ہدایت کی لیکن اس کی ہر نظم عقل و حکمت پر مبنی تھی۔ اس کا کلام اردو زبان میں ہمیشہ زندہ رہے گا کیوں کہ اس نے مردہ دلوں کو زندہ کیا ہے۔"

اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور گئے۔ پھر حصول علم کے لیے انگلستان اور جرمنی بھی گئے۔ اخیر زمانہ میں اسپین، فرانس، اٹلی، فلسطین اور افغانستان بھی گئے۔ ہندستان کے مشہور علاقوں میں دہلی، مدراس، میسور، بنگلور، سرنگاپٹنم، بھوپال اور حیدرآباد کا دورہ کیا مگر بنگال آنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔

اقبال خود تو کبھی ارضِ بنگالہ کا سفر نہیں کر سکے مگر ان کی دل کش و دل نشیں شاعری بنگال کے ہر گھر ہر فرد تک ضرور پہنچ گئی اور اس نے ساکنانِ ارضِ بنگالہ کے دلوں میں ایسا گھر کیا کہ اقبال ہر انسان کے اولین محبوب شاعر بن گئے۔

میں اپنی اس بات کے لیے دلائل جمع کروں تو ایک بسیط کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ میں فی الوقت صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا۔ یہ واقعہ خود ہزار دلیلوں پر بھاری ہے۔ 21 اپریل 1938ء کو اقبال زیارت حرمین شریفین کی خواہش دل میں بسائے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اقبال کے انتقال پرملال کی خبر پوری علمی و ادبی اور سیاسی و دینی دنیا پر سکوت طاری کر گئی۔ اہلِ کلکتہ پر بھی یہ خبر بجلی بن کر گری۔ کلکتہ والوں کو یہ خبر دن میں کلکتہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ ملی اور آناً فاناً شہر کا بڑا حصہ سوگ میں ڈوب گیا۔ اہلِ کلکتہ نے اس موقع پر پارک سرکس میدان میں جتنی بڑی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اس سے بڑی غائبانہ نماز جنازہ نہ اس سے پہلے دیکھی گئی نہ اس کے بعد۔ اس نماز جنازہ میں پچاس ہزار سے زائد لوگ شریک ہوئے۔ میدان کے باہر ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم مرد و عورت بھی موجود تھے جو ان کی وفاتِ حسرت آیات پر آنسو بہا رہے تھے۔

غائبانہ نماز جنازہ کے معا بعد پارک سرکس میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ اس کے بعد ایک مہینے سے زیادہ تک اقبال کے تعلق سے تعزیتی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔ اکثر اہم علمی اداروں نے باقاعدہ اظہار افسوس کیا۔ شانتی نکیتن وشو بھارتی یونیورسٹی وغیرہ نے باقاعدہ یونیورسٹی میں تعطیل کا اعلان کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اقبال کی وفات لاہور میں نہیں بلکہ کلکتہ میں ہوئی تھی۔

اس موقع پر بنگال کے مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور عظیم بنگالی مجاہد آزادی سبھاش چندر بوس نے تعزیتی پیغامات پیش کر کے خراج عقیدت پیش کیا۔

شیر بنگال اے کے فضل الحق نے کہا:

''اقبال دنیائے ادب کا ایک اہم ستون تھے۔ اقبال کی وفات علمی و ادبی دنیا کا ایک بہت بڑا نقصان اور ایک عظیم قومی سانحہ ہے۔''

سید عزیز الحق اور حبیب اللہ جو بعد میں مشرقی پاکستان کے کیبنٹ ممبر بنے۔ انہوں نے کہا:

''ایک طاقت کا مینارہ گر گیا۔ ایک شاعر، ایک فلسفی اور ایک پیدائشی مجاہد کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا۔ اقبال کا قومی ترانہ جو انہوں نے اردو میں لکھا ہے اس نے ہر بنگالی گھر میں قومی جوش و ولولہ پیدا کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اقبال اردو کے نہیں بلکہ بنگلہ زبان کے شاعر و مفکر تھے۔''

اقبال کی وفات کے چند سالوں کے بعد ملک ظالم انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہو گیا جنہوں نے عرصہ دراز سے ہندستانیوں کو قعر مذلت میں زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندستان کی آزادی جن مجاہدین کی ناقابل فراموش کوششوں کی رہین منت ہے ان میں سب سے بڑا نام اس اقبال کا ہے جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اپنے ملک کے باشندوں کے دلوں میں جذبہ آزادی جگانے میں صرف کر دیا تھا۔ 1947ء میں انگریزوں نے اس ملک کو آزاد تو کر دیا مگر جاتے جاتے

ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ اس تقسیم کی وجہ سے ملک ہندستان کو جو نقصانات ہوئے ان میں سب سے بڑا نقصان ''اقبال کا نقصان'' تھا۔ اقبال لاہور میں دفن تھے اور لاہور پاکستان کے حصے میں چلا گیا۔

پاکستان نے اقبال اور کلامِ اقبال کو سر آنکھوں پر رکھا۔ شاید اسی لیے اقبال اور کلامِ اقبال کو جو مقام ہندستان میں ملنا چاہیے تھا اس سے تھوڑا کم ملا۔ اس پورے عرصے میں بعض منظم اور غیر منظم کوششوں کے باوجود اقبال کو گم نامی کے غار میں دھکیلنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اقبال کے زندہ کلام نے ان کو کبھی مرنے نہیں دیا۔ بلاشبہ اقبال کی سیکڑوں ایسی نظمیں ہیں جو ان کو کبھی مرنے نہیں دیں گی مگر ان میں سے ان کی مشہور نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ایک ایسی نظم ہے جو رہتی دنیا تک ہر ہندستانی کے دل میں اقبال کی محبت پیدا کرنے اور اُن کا اقبال بلند کرنے کے لیے کافی ہے۔

اقبال نے یہ نظم 1904ء میں لکھی تھی اور یہ دیکھی ''اتحاد'' میں شائع ہوئی تھی۔ سو سال سے زائد عرصہ تک اس نظم نے محبِ وطن ہندستانیوں کے جذبۂ وطن دوستی کو تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔ حکومت مغربی بنگال نے خصوصی ایوارڈ کے ذریعہ ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ اب کوئی عاشقِ اقبال یہ تو نہیں کہہ سکے گا کہ جس ہندستان کو اقبال نے ''سارے جہاں سے اچھا'' جیسا لافانی ترانہ دیا۔ اس ملک نے کبھی اس کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اقبال کو ان کی مشہورِ زمانہ نظم ''ترانہ ہندی'' کے لیے بعد از مرگ ایوارڈ دینے کا جرات مندانہ اقدام کیا۔ ہندستان کی آزادی کے بعد یہ پہلا سرکاری ایوارڈ ہے جس کے ذریعہ اقبال کے جذبۂ حب الوطنی اور بے مثال شاعری کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

❖❖❖

ڈاکٹر افسانہ حیات (نئی دہلی)

اقبال کا تصورِ حیات

کسی بھی فن کا تعلق حیاتِ انسانی سے گہرا ہوتا ہے۔ ہر فن زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اقبال زندگی اور فن دونوں کو بامقصد سمجھتے ہیں اور دونوں کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے صرف کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری محض لطف اندوزی کا نام نہیں بلکہ ایک ایسا حیات بخش عمل ہے جس کی نمود خونِ جگر کا متقاضی ہے۔ اقبال کے یہاں زندگی ایک نظام کے تحت ارتقا پزیر ہوتی ہے اور حرکت و عمل، سوز و ساز، ذوق و شوق اور آرزو مندی، خودی اور عشق کی رہ نمائی میں اپنا سفر طے کرتی ہے۔

اقبال سے قبل اردو شاعری میں حیات کی بے ثباتی کی نوحہ خوانی کا تذکرہ عام تھا۔ زندگی یا تو عشقِ مجازی کے پیچ و خم میں الجھی آہ و زاری میں مشغول تھی یا روایتی تصوف میں گم اس کی اصل روح سے بے گانہ ہو کر موت کے سامنے سرنگوں ہو جاتی تھی مگر اقبال کے یہاں زندگی باوقار جمالیات اور انقلابی شان کے ساتھ خودی اور عشق کے جدید لباس

میں نظر آئی۔ اقبال زندگی کو ایک انقلاب، جدوجہد، جنونِ سوز و ساز اور آرزومندی تصور کرتے ہیں جس میں زندہ دلی اور انقلابی شان موت پر بھی فتح حاصل کر لیتی ہے۔ اقبال کے فلسفۂ حیات میں جن بنیادی عناصر کی کارفرمائی ہے اس میں زندگی خودی اور عشق کی رونمائی میں اپنا سفر طے کرتی ہے۔ اقبال اردو شاعری کے روایتی تصورِ زندگی کی بے ثباتی کا رونا نہیں روتے بلکہ موت کو اک ماندگی کا وقفہ تصور کرتے ہیں یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ اسی لیے وہ خدا سے اس کا گلہ نہیں کرتے بلکہ چیلنج کرتے ہیں کہ اگر میرے ذوق وشوق اور کمالِ آرزو کے جوہر کا نظارہ دیکھنا ہے تو پہلے مجھے موت کی قید سے آزاد کر۔ ان ہی خیالات ونظریات کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیِ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

اقبال موت کو زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایسا عمل تصور کرتے ہیں جو نقشِ حیات مٹاتا نہیں، آگے کے سفر کا اعلان کرتا ہے۔ اقبال کی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' زندگی کے اسی تصور کی وضاحت کرتی ہے :

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

اقبال کو زندگی کو موت کی گھات میں سرگرداں پاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں

چارلس ڈارون کا نظریہ منظرِ عام پر آیا جس میں یہ کہا گیا کہ اس جہاں میں جو اہل ہے، وہی زندہ رہے گا۔ اقبال ڈارون کے اس نظریہ سے بڑی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ اس کائنات کو ایک درس گاہ، زندگی کو امتحان اور زمانے کو منتہا تصور کرتے ہیں، جو ہر لحظہ حیاتِ انسانی کو پرکھتا ہے۔ وہی اس دنیا پر حکومت کرے گا جو اپنے آپ کو اہل ثابت کرے گا اور جو اس کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا اس کا مقدر موت ہے۔ فطرت اس پر رحم نہیں کرتی اور اس کے وجود کو مٹا دیتی ہے۔ یہاں وہی زندہ رہتا ہے جو وقت اور حالات کے پیشِ نظر چاق و چوبند رہنے کے ساتھ مسلسل جدوجہد، عملِ پیہم کے ساتھ زندگی کی دشواریوں سے نپٹنے کی تیار میں ہمہ تن گوش رہتا ہے، جس کے لیے اقبال انسان میں شاہینی صفات کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی اور عشق سے بڑا کام لیا۔

اقبال کا فلسفۂ حیات ان ہی دو وسیع دائروں میں پرواز کرتا ہے، جس کا ایک سرا خودی اور دوسرا عشق ہے۔ اقبال کا تصورِ حیات و کائنات اسلامی قوانین کا سرچشمہ ہے جس میں خودی کی تربیت تین مراحل سے ہو کر گزرتی ہے۔ اول اطاعت، دوم ضبطِ نفس، سوم نیابت الٰہی۔ اقبال خودی کو زندگی کی ابتدا اور عشق کو انتہا تصور کرتے ہیں۔ خودی سے عشق کی منزلوں تک سیر کرنے کے لیے خودی کی راہوں سے گزرنا ہوگا جس کا اولین قدم اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی کا پتہ لگا کر اپنی خودی کو عشق کی سرپرستی میں اس درجہ بلندی تک لے جانا ہوتا ہے کہ خالق و مخلوق کے پردے مٹ جائیں۔ عشق کی منزل خودی کے مرحلوں سے گزر کر ملتی ہے۔ اقبال زندگی کو عشق کے بغیر بے معنی اور محض کنارے سے تماشا دیکھنے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ وہ زندگی کو شاہینی صفات سے پر دیکھنا چاہتے ہیں، جس کے لیے خودی اور عشق کی منزلوں کو سر کرنا ہوگا۔ عشق جدوجہد چاہتا ہے، آرام طلبی نہیں۔ جس میں خطرے اٹھانے کا حوصلہ اور جوش باقی نہ ہو، عشق کی منزلوں کو سر نہیں کر سکتا۔ اقبال کا شاہین اسلامی صفات کا پرتو ہے جس میں خودداری بھی ہے، فقیری بھی،

خدا پرستی بھی اور خود نمائی بھی، غیرت مندی بھی اور شدتِ آزادی بھی۔ اقبال عشق کو سراپا حیات، سراپا حرکت و عمل مانتے ہیں:

مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدا دانی

اقبال کی خودی کی ابتدا خود بینی اور عشق کی انتہا خدا بینی ہے، جس میں خودی کی راہوں کا سفر اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی کا پتہ لگانے سے شروع ہو کر دامنِ یزداں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ عشق کے معاملے میں بھی "نہ آتے ہمیں اس سے تکرار کیا تھی"۔ مجازی عشق کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر عشقِ حقیقی کی انتہاؤں کو چھو لیتا ہے جس میں عشق اور خودی اس قلندرانہ شان کو پہنچ جاتے ہیں کہ آدم بہشت سے نکالے جانے پر شرمندہ نہیں بلکہ کارِ جہاں بنانے تک خدا سے انتظار کرنے کی جرأت آمیز بات بڑی دیدہ دلیری سے کرتا ہے اور حوصلہ دیکھیے حقیقت کو مجازی لباس میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اقبال عشق کے دل دادہ ہیں کیوں کہ عشق مصلحت پرست نہیں، وہ خوشامد نہیں کرتا۔ بندۂ آزاد ہے غلامانہ ذہنیت کو قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے اقبال کے یہاں عقل کے مقابلے میں عشق کا مرتبہ اعلیٰ ہے۔ اقبال کا عشق معشوق کے قدموں پر جبہ سائی نہیں کرتا بلکہ اپنی نوائے شوق سے حریمِ ذات اور بت کدہ صفات میں شور برپا کرنے کے ساتھ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ آشکار ہونے اور آشکار کرنے کا تقاضہ بھی کرتا ہے بلکہ دامنِ یزداں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اقبال کا ماننا ہے کہ زندگی کی دشواریوں کا مقابلہ زندگی سے نظر چرا کر نہیں بلکہ دیدہ دلیری سے اس کا مقابلہ کرنے سے کیا جا سکتا ہے اس لیے مسولت کو شاہ باز سے بھڑ جانے کا درس دیتے ہیں اور مزدور کو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلانے کا۔ اقبال زندگی کو جہاد اور ظلم کے خلاف اعلانِ جنگ تصور کرتے ہیں جس کے لیے ہر طرح کی غلامی سے نجات ضروری ہے، ورنہ انسانی صلاحیتیں اس کے اندر دم توڑ دیتی ہیں۔ اسی لیے اقبال ہر طرح کی غلامی کی آزادی کے خواہاں ہیں، کیوں کہ بندگی میں انسان کی صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ اسی رنگ اور اسی تصور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

عشق کے لیے لازمی ہے کہ انسان غلامی اور غلامانہ ذہنیت سے آزاد ہو، آرام طلبی کی بجائے حرکت و عمل اور جدوجہد میں ہر دم کوشاں رہے۔ یہی اقبال کی شاعری اور انسانی زندگی کا تقاضہ ہے۔ اقبال کا تصورِ حیات ایک بحرِ ذخار ہے جس کی موجوں کی طغیانی میں لاتعداد گوہر موجود ہیں۔ اقبال کا فلسفۂ حیات حرکت و عمل کے ضمیر، خودی کے ذوق و شوق، عشق کی آگ، فقر کی قلندرانہ آن بان اور شان لیے ہوئے ہیں جس کی مثال اردو شاعری کی روشن روایت سے لے کر آج تک نہیں ملتی۔ اقبال اس منزل کے یکتا مسافر ہیں۔

❖❖❖

ظفر اقبال (نئی دہلی)

اقبال کی سیاسی بصیرت

شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے توسط سے ساری انسانیت اور بالخصوص امت مسلمہ کو جو آفاقی پیغام دیا ہے، وہ ساری انسانیت کے درد کا مداوا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے توسط سے نوآبادیت کے خلاف محکوم اقوام کو بے دار کرنے کی جو کوششیں کی ہیں، وہ صرف ان ہی کا خاصہ ہیں۔ ہزاروں سال نرگس نے اپنی بے نوری پر جو آنسو بہائے ہیں انہیں کے طفیل اقبالؔ جیسی دیدور شخصیت پیدا ہوئی ہے۔ یہ شخصیت جب ایک طائرانہ نظر خود اپنے ملک، ساری دنیا اور بالخصوص عالم اسلام پر ڈالتی ہے تو اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔ اس مرحلہ پر وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں وہ ان ظالموں کے خلاف اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قوموں کے اندر ان کی خودی کو بے دار کرنے کی کوششیں کریں گے۔ جب ان کی خودی بے دار ہوجائے گی تو یہ محکوم اور مظلوم قومیں اپنی خودی اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو

بروئے کار لاتے ہوئے ظلم اور غلامی اور نو استعماریت کی زنجیروں کو توڑ دیں گی ۔ اس کے بعد ساری انسانیت عدل و انصاف سے مستفید ہو سکے گی ۔

ابتدا میں اقبال کی شاعری زیادہ تر وطن کی محبت میں سرشار نظر آتی ہے کیوں کہ یہ زمانہ تھا جب ہندوستان غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے کروٹ بدل رہا تھا۔ ایک طرف اپنی غلامی، پس ماندگی اور محکومی کے اسباب تلاش کیے جا رہے تھے اور سماج اور معاشرہ کی اصلاح کے ساتھ عظمت رفتہ کی بازیافت کی کوششیں ہو رہی تھی تو دوسری طرف ایک نئی دنیا اور نئے سماج کی تعمیر کا خواب دیکھا جا رہا تھا۔ "ہمالہ"، "تصویر درد"، "ترانہ ہندی"، "نیا شوالہ" جیسی نظمیں اس عہد کی نمائندہ ہیں۔

اس کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں اور کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے ان کی فکر میں ایک زبردست تبدیلی ہوتی ہے۔ وطن کی محبت میں سرشار اقبال کو اچانک محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی سمت میں جا رہے ہیں جو یقیناً ان کا مطمح نظر نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری ایک اور قالب میں ڈھلنے لگتی ہے مگر یہ تبدیلی ان کے یورپ کے قیام اور وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کے براہ راست اور بغور مشاہدہ کا نتیجہ ہے کیوں کہ یورپ میں ہی انہوں نے سرمایہ داری، مادہ پرستی، اخلاقی قدروں کی پامالی، امتیاز رنگ و خون اور نسلی تفاخر پر مبنی جارحانہ وطن پرستی کے مظاہر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور محسوس کیا کہ وطنیت کا خمار دور سے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب قریب سے اس کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کے اندر کی چنگیزیت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کو وطنیت جیسی کسی چہار دیواری میں مقید کرنے کی بجائے ساری دنیا اور ساری انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے محکوم قوموں کو بے دار کرنے کا فیصلہ کیا جنہیں دنیا کی نو استعماری طاقتیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے غلام بنانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اقبال پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی وطنی شاعری سے ملی شاعری کی

طرف پلٹے تو صرف ایک اسلامی شاعر بن کر رہ گئے۔ یہ الزام سراسر غلط اور ان کی شاعری اور پیغام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کے دوسرے دور کی شاعری کا محور اسلام ہے مگر ان کی فکر میں اسلام مخصوص رسوم، عبادات اور عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ ایک فعال، سرگرم اور متحرک نظریۂ حیات ہے۔ جس میں حریت، آزادی، بے نیازی، زور حیدری اور فقر بوذر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر ظلم و جبر، محکومی اور غلامی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اقبال اگر محدود معنوں میں اسلامی شاعر ہوتے تو "بال جبریل" کی طویل نظم "ساقی نامہ" میں چین کے تعلق سے یہ پیشین گوئی نہ کرتے کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب سرمایہ دارانہ نظام کا باقی ایک مداری کی طرح اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جائے گا تو یہ گراں خواب چینی جنہیں فرنگیوں نے افیم کھلا کھلا کر مدہوش کر رکھا ہے وہ اس نظام کی جگہ ایک متبال نظام فراہم کریں گے۔ جب ہم آج کے حالات پر غور کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے تین چوتھائی صدی قبل جو پیشین گوئی کی تھی وہ ہو بہو صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ چین ایشیا میں معاشی اعتبار سے سب سے طاقت ور ملک بن چکا ہے اور صرف امریکہ سے ہی پیچھے ہے۔ اب یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ وہ چند سالوں میں دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت بن جائے گا۔ اس طرح اقبالؔ کی چین کے تعلق سے پیشین گوئی حقیقت بن رہی ہے۔ چین کے بارے میں ان کی یہ پیش گوئی محکوم اور زیردست قوموں کے ساتھ ان کی ہم دردی اور وابستگی کا ثبوت ہے۔

سیاسی اور تاریخی حالات پر گہری نظر ان کے تجزیہ کی غیر معمولی صلاحیت اور ان کے حوالہ سے مستقبل میں جھانکنے کی جو غیر معمولی صلاحیت اقبال کو ودیعت ہوئی تھی وہ ہمیں ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چنان چہ جب ہم عالم اسلام پر نظر ڈالتے ہیں خواہ وہ ایران، خواہ وہ فلسطینی عرب، خواہ افغانستان ہو خواہ کشمیر ہو، ان تمام اقوام کے تعلق سے انہوں نے جو پیشین گوئی کی ہے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسی نوے سال

گزرنے کے بعد بالکل پوری ہونے جارہی ہے اور مسجد قرطبہ کے آخری دو بندوں میں یورپ کی تاریخ کے تجزیہ کے بعد روح مسلم میں جس اضطراب کے کروٹیں لینے کا ذکر تھا وہ اب صاف نظر آرہا ہے۔ سب سے پہلے ہم ایران کو لیتے ہیں اقبالؔ نے ''ضرب کلیم'' میں ''جمعیت اقوام مشرق'' کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے پیشین گوئی کی ہے کہ تہران اگر عالم مشرق کا جنیوا ہوجائے تو شاید مشرق کی تقدیر بدل جائے۔ جب اس مختصر پیشین گوئی کو موجودہ زمانے کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پیشین گوئی صد فی صد درست ہونے جارہی ہے۔ ایران آج فکری، سائنسی، عسکری، معاشی طور سے ایک طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ ایران جس کے تعلق سے اقبال کے عہد میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ ایران جس کو 1907ء میں روس اور برطانیہ نے ایک خفیہ معاہدہ کے تحت آپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا، آج اسی ایران میں ایک سے ایک بڑھ کر عبقری شخصیت موجود ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہے اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب اقبالؔ کی تہران کے مشرق کا جنیوا بننے کی پیشین گوئی بھی صحیح ثابت ہوکر رہے گی۔

اسی طرح اقبال نے ضرب کلیم کی نظم ''فلسطینی عرب سے'' میں فلسطینیوں کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ تیری دوا نہ تو جنیوا میں ہے نہ لندن میں ہے بلکہ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فرنگی جس کو تو اپنے درد کا درماں سمجھتا ہے درحقیقت وہ یہودی کے پنجے میں پھڑپھڑا رہا ہے جو خود بے بس ہو وہ تمہاری کیا مدد کرسکتا ہے۔ اگر تجھ کو اپنی مدد کرنی ہے تو اپنی خودی کو فولاد بنادے تب ہی تو کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔ جب ہم آج کے فلسطین پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے فلسطینیوں کو جو نصیحت کی ہے وہ قوم ان کی نصیحت پر پوری طرح دل جمعی سے کاربند ہے۔

حالیہ عرصوں میں لڑی جانے والی فلسطین اور اسرائیل کی جنگیں جو 2009ء، 2012ء اور 2014ء میں لڑی گئیں، جس میں فلسطینیوں نے اسرائیل پر اپنی برتری کو

ثابت کردیا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اقبال کی دعائیں بارگاہ ایزدی میں مستجاب ہوئی ہیں۔ اسی طرح جب ہم افغانستان پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جس قوم کو برطانیہ، روس اور اب امریکہ اور اس کے حلیف ناٹو ممالک زیر کرنے کی بے جا کوشش کر رہے تھے وہ اپنی خود پہچان رہی ہے جس کی وجہ سے امریکہ اور ناٹو اس طویل جگہ سے پریشان ہوگئے ہیں۔ اس قوم کے تعلق سے اقبالؔ نے اپنی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کے عنوان سے جو پیشین گوئی کی ہے وہ بالکل صحیح ثابت ہورہی ہے۔

اسی طرح جب کشمیر کا ذکر آتا ہے جس سے خود اقبالؔ کا تعلق ہے تو ان کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ انہوں نے ''ارمغان حجاز'' میں ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ انہوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے ان نظموں میں جو باتیں کہی ہیں اگر یہ قوم پوری دل جمعی کے ساتھ ان پر عمل کرے تو وہ بہت جلد کامیابی سے ہم کنار ہوسکتی ہے۔

اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے چھوٹے بڑے بہت سارے سیاسی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے سیاسی شعور کی بدولت ایسی پیشین گوئیاں کی ہے اور جو اتنے برسوں کے بعد آج کے عہد میں بالکل سچ ثابت ہونے والی ہیں۔ اس طرح اقبال نے اس عہد کی مختلف مذہبی و سیاسی شخصیتوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ بھی برحق لگتے ہیں۔ یہ ان کے سیاسی درک، تاریخی شعور اور گہری بصیرت کا ثبوت ہے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو اقبالؔ کو ایسا مفکر شاعر بناتی ہیں جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

❖❖❖

فون9958361526

ابوالبشر (علی گڑھ)

اقبال بحیثیت طنز نگار

طنز نگار ایک طرح کا مصلح ہوتا ہے۔ وہ سماج کے تمام برے، گلے سڑے ناسوروں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ وہ کم زوروں، مظلوموں اور معصوموں کا خدمت گار ہوتا ہے۔ وہ وقت، سماج اور زمانہ کو آئینہ دکھاتا ہے۔ وہ ہر اُس نقب کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے جو حقیقتوں کے ادراک سے عوام کو مرحوم رکھتا ہے۔ طنز نگار ایک طرح کا تنقید نگار ہوتا ہے۔ طنز نگار حیات شناس ہوتا ہے۔

طنز کے متعلق شوکت سبزواری نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"طنز ایک طرح کی تنقید ہے۔ ایک قسم کا عمل جراحی ہے۔ تنقید کئی طرح کی ہوتی ہے۔ طنز شدید، تیز اور بے دردانہ قسم کی تنقید ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ایک قسم کا عمل جراحی کہا۔ تنقید میں ایک چیز کے اچھے اور برے دونوں پہلو سامنے ہوتے ہیں۔ اور ایک نقاد کا فرض ہے کہ وہ جہاں برے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے وہاں

اچھے پہلوؤں کو بھی اُجاگر کرے۔ تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ توازن اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ طنز میں چیز کے بُرے پہلو نمایاں کر کے دکھائے جاتے ہیں۔"

("طنز و مزاح تاریخ و تنقید" طاہر تونسوی

مضمون "اردو شاعری میں طنز" از شوکت سبزواری ص 98)

طنز کے بارے میں تھکرے شاید اس طرح کہتا ہے کہ طنز حتی المقدور زندگی کے ہر شعبہ پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے اور مکر و فریب، رعونت و منافقت کے خلاف اس طور پر علم جہاد بلند کرتا ہے کہ بلآخر ہمارے جذبات محبت و مرحمت یا نفرت و حقارت کی تحریک ہوتی ہے۔ ایک معمولی ذہن کا انسان اپنی پسند یا ناپسندیدگی کا اظہار بالکل براہ راست کرے گا لیکن ایک طنز نگار اپنی بات کو اس طرح کہے گا کہ مخاطب کو خفا یا غصہ ہونے کا بھی موقع نہ مل سکے اور مقصد بھی پورا ہو جائے۔

طنز ایک مہلک ہتھیار ہے۔ اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جہاں پر کوئی حربہ کارگر نہیں ہوتا طنز کا ایک ہلکا سا تیر اپنا کام کر جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال ہر کسی کے بس کی بات نہیں کیوں کہ اگر ذرا سا بھی چوکے تو خود شکاری شکار ہو جاتا ہے۔ بہت سے شعرا نے طنز نگاری میں طبع آزمائی کی ہے جیسے میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، مصحفی، مرزا اسد اللہ خاں غالب وغیرہ یہ تمام شعرا اپنے زمانے کے بڑے شاعر اور طنز و مزاح نگار تھے۔ ان ادیبوں کی روشنی کو علامہ اقبال نے بڑے ہی سلیقے اور ہنر مندی سے جلا بخشی۔

اردو، فارسی اور انگریزی زبان کا ماہر، ایک بہت بڑا شاعر، فلسفی علامہ اقبال جو شاعر مشرق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ 1877ء میں سیالکوٹ کے ایک غریب مگر قناعت پسند صوفی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ 1899ء کو پروفیسر تھامس آرنلڈ کی سرپرستی میں اقبال نے لاہور کالج سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ اس کے بعد آپ اسلامی تاریخ اور فلسفہ عالم کے مطالع میں مصروف ہو گئے۔ ان کی ابتدائی زمانہ کی شاعری میں مناظر قدرت، مظاہر فطرت اور حُب الوطنی

کے موضوعات، بچوں سے متعلق مضامین اور دیگر رومانی موضوعات حاوی نظر آتے ہیں۔

درحقیقت علامہ اقبال نے طنز نگاری کو کبھی بھی بحیثیت ایک مستقل موضوع یا فن کے طور پر نہیں اپنایا لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں جگہ جگہ طنز نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال نے سماج کی بے بصری و غفلت پر، مسائل حیات کی حیات بخش پاکیزگی کی طرف سے برتی جانے والی لاپرواہی پر ایک ماہر طبیب کی طرح طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ان کی تمام شاعری کی طرح ان کا طنز بھی ایک بڑے تعمیری مقصد کا حامل ہے۔ انہوں نے صرف انہیں چیزوں پر طنز کیا ہے جو چیزیں خود بہ خود عقل کے نزدیک قابلِ گرفت ہیں۔ طنز نگاری سے ان کا مقصد تنقید، ذلیل کرنا، دل آزاری کرنا یا ذاتی و شخصی نفرت نہیں ہے بلکہ ان برائیوں کو واضح کرنا ہے جو قوم کی ترقی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

اقبال کا طنز سادہ اور سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بلیغ بھی ہے وہ کبھی صوفی و ملا پر چوٹ کرتے ہیں تو کبھی سماجی کم زوریوں و بے اعتدالیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ آپ قاری کو زندگی کے نشیب و فراز سے ہم کنار کرتے ہیں جس سے قاری اقبال کا ہم نوا بن جاتا ہے اسی وجہ سے اگر اقبال کسی بھی چیز کو برا کہتے ہیں تو قاری بھی اس کو برا کہتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں اللہ تعالیٰ سے جو بھی گفتگو کی ہے وہ شوخی اور طنز سے لبریز ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں اسی وجہ سے اللہ سے شکایت کرتے ہوئے بھی طنز کا استعمال کیا ہے اور کہتے ہیں کہ وہ قوم جس نے خدا اور اس کے دین کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں اور آج وہ قوم خدا کی نظرِ کرم کی محتاج، مجبور و بے کس ہے۔ اپنی قوم کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر ان کی حمیت جاگی اور اس سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنی نظم 'شکوہ' میں شکایت کی ہے اور اس کے جواب میں 'جواب شکوہ' بھی لکھا۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے طنز کا رُخ خود انسان کی طرف موڑ دیا یہاں سنجیدگی اور متانت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی طرح ''بالِ جبریل'' میں خدا سے شکایت کی ہے جو طنزیہ انداز میں پوری ایک روایت کو سلسلہ وار پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ سے چند اشعار پیش کرتا ہوں:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے میرا جہاں روشن
زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

.....

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

.....

قصور وار ، غریب الدّیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد!
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
مقامِ شوق تیرے قدسیوں کی بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

ان اشعار میں طنز کی ایک چھوٹی سی لہر نظر آتی ہے جو اللہ سے شکایت کی شکل میں ہے۔

اب تک علامہ اقبال کے کلام میں طنز نگاری سے متعلق جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس میں ہر جگہ اجتماعی و اصلاحی مقصد نمایاں ہوتا ہے اور ان کا طنز ذاتی عناد و نفرت، انفرادی جذبات سے بالکل پاک و صاف نظر آتا ہے جو ہمارے ذہن کو ایک مثبت سمت کی طرف لے جاتا ہے اور ذہن کو تلخی یا کڑواہٹ سے بھرنے کے بجائے اجتماعی کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف اُبھارتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک نظم ''غلاموں کی نماز'' میں بڑے لطیف پیرایہ میں ہمارے مذہبی رہنماؤں کی عملی بے راہ روی پر طنز کیا ہے۔ جس کو ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام؟

وہ سادہ مردِ مجاہد وہ مومن آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

اسی بات کو علامہ اقبال ایک جگہ کچھ اس طرح کہتے ہیں:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اُمید یہ ہے کہ قاری علامہ اقبال کے ان اشعار کو بغور پڑھیں گے اور نئے مفاہیم تک رسائی حاصل کریں گے جن سے اقبال کی اخلاقی سطح اور ذہنی اُفق تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ دین کی محدود تعبیر اور امامت کے مفہوم کی تنگی پر اس سے زیادہ سخت طنز ممکن نہیں تھا لیکن لہجہ کی نرمی نے اس بات کو سختی یا نکتہ چینی کے بجائے ایک لطیف طنز میں تبدیل کر دیا۔ اقبال کا ایک خاص اظہارِ انداز یہ بھی ہے کہ جہاں سختی، مزمت یا نفرت کا اظہار کرنا چاہیے وہاں لطیف اور ہم دردانہ طنز کے الفاظ استعمال کر کے لطف پیدا کرتے ہیں۔

کلامِ اقبال میں کئی نظمیں ایسی ہیں جس میں سنجیدہ و مفکرانہ طنز بطورِ اصلاح استعمال کیا ہے۔ ان کی وہ نظمیں ''خانقاہ''، ''باغی مرید''، ''اجتہاد''، ''توحید''، ''جہاد''، ''ہندی مسلمان''، ''مرگِ خودی''، ''ملائے حرم'' وغیرہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
بے چارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
یہ مصرعہ لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں جھک گئے مسجد میں جب وقتِ قیام آیا
تیری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

ان اشعار میں ملا کے سوزِ دل سے خالی ہونے پر کتنا گہرا طنز کیا ہے۔ پھر در پردہ ملا کے جمود کو ملت کی پستی کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا جا رہا ہے۔

اقبال کی طنز نگاری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص قوم یا طبقہ کو یا کسی خاص انسان کو اپنے طنز کا نشانہ نہیں بناتے کبھی وہ صوفی کبھی ملا کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ کبھی نئی تہذیب کے پرستاروں کو اور کبھی محکوموں کی نفسیاتِ غلامی پر طنز کرتے ہیں اسی طرح کبھی حاکموں کے شیوہ سیاست پر کبھی موجودہ نظامِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے۔ کبھی خانقاہوں کی خانقاہی نظام کا محاسبہ کرتے ہیں۔ غرض ان کی طنز نگاری میں وہی وسعت و ہمہ گیری ہے جو ان کے پیغام میں ہیں۔ ان کے طنز کی سطح بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی ان کے فلسفہ کی۔ اس کی مناسبت سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
ہے حق میں غلاموں کے یہی تربیت اولیٰ
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

اپنے کلام میں علامہ اقبال نے ڈرامائی انداز سے بھی طنز پیدا کیا ہے۔ آپ ڈرامائی انداز میں مکالمہ کی مدد سے ایک ماحول پیدا کر کے اپنے مفہوم کی ادائیگی میں مدد لیتے ہیں اور اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کا طنز اور نمایاں ہوتا ہے۔

میں بھی موجود تھا واں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ ملّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و بہشت و لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقول
اور تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

ان تمام اشعار کے علاوہ ان کی ایک بہت مشہور و معروف نظم ہے جو مکالمہ نگاری کی بہترین مثال ہے اور اس کو طنزیہ نظم کی فہرست میں بلند مقام حاصل ہے اس نظم کا نام ''جبریل و ابلیس'' ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے مکالمہ کا اعلیٰ معیار اختیار کیا ہے۔

علامہ اقبال کی طنزیہ شاعری کی بارے میں وزیر آغا کچھ یوں عرض کرتے ہیں:

''اقبال کی طنز کا آخری دائرہ زندگی اور کائنات کے بہت سے مسائل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اقبال ایک مفکر کے دھیمے تبسم کے ساتھ کائناتی مسائل کے رموز و نکات کی تقسیم پر آمادہ ہو جاتے ہیں خالقِ کائنات سے ان کا براہِ راست

خطاب اپنے اندر رندی و بے باکی کے علاوہ طنز کے بہت سے تیز نشتر بھی پنہاں رکھتا ہے۔"

("اردو ادب میں طنز و مزاح" وزیر آغا ص:۱۳۰ ایجوکیشنل)

اگر ہم غور کریں تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی بڑے پائے کا ادیب بغیر ایک بڑا ذہن کے تخلیق کار نہیں بن سکتا لیکن طنز نگاری کے لیے خاص طور پر غیر معمولی ذہانت اور قوتِ مشاہدات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری بالعموم اور ان کا طنز بالخصوص اس بات کا شاہد ہے کہ آپ غیر معمولی ذہانت اور قوتِ مشاہدہ کے مالک تھے۔ وہ ایک معمولی واقعہ کو دیکھتے ہیں اور اُس سے ان کا ذہن حیرت انگیز نتائج کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرود

❖❖❖

نوشاد منظر (نئی دہلی)

اقبال کا تصور ابلیس

اُسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

علامہ اقبال (1877ء-1938ء) شاعر، مفکر، حکیم، خودی کے پیام بر، تہذیب و تمدن کے نقاد، انسانیت کی بقا کے علم بردار اور ملک وقوم کے لیے ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ اقبال کی شاعری پیامی شاعری ہے۔ اقبال ایسے ادب کے قائل تھے جو زندگی سنوارنے میں انسان کی مددگار ہو، انھوں نے خوابِ غفلت میں رہنے والی قوم کو اپنی شاعری کے ذریعے بے دار کرنے کی عملی کوشش کی۔ اقبال کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں جن پر کافی کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کئی تاریخی کرداروں کو اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے۔ ان کرداروں میں نبیوں اور پیغمبروں کے ساتھ ساتھ لینن، مارکس جیسے کردار بھی اقبال کو

متوجہ کرتے ہیں، مگر اقبال کے یہاں سب سے زیادہ متحرک کردار ابلیس کا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو کئی نظمیں اور بہت سے اشعار ہیں جن میں اقبال نے ابلیس کے کردار کو پیش کیا ہے۔ میں نے کلام اقبال اردو میں موجود ابلیس کے ذریعے ہی اقبال کے نظریات کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ اقبال نے ابلیس کو محور و مرکز بنا کر پانچ نظمیں ''ابلیس کا فرمان، اپنے سیاسی فرزندوں سے''، ''ابلیس کی عرض داشت''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''، ''مکالمہ جبریل و ابلیس''، ''تقدیر'' (ابلیس و یزداں) لکھیں۔ ان کے علاوہ کئی اشعار ہیں جن میں ''ابلیس'' کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جیسا میں نے اوپر عرض کیا اقبال نے جن کرداروں کو اپنے پیام کا وسیلہ بنایا، ان میں سب سے اہم کردار ابلیس کا ہے۔ اقبال نے ابلیس کو حرکات وسکنات کا سرچشمہ بتایا۔ ابلیس کی بے باکی اقبال کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اس کی زبان سے حرکت وعمل اور محنت وسخت کوشی کا پیغام عوام کو دینا چاہتے تھے۔ حالاں کہ شیطان کو شر کا سرچشمہ تصور کیا جاتا ہے، اس سے کسی بھی خیر کی امید نہیں کی جاتی۔ مختلف مذاہب اور اساطیر میں بھی ابلیس یا شیطان کا وجود مختلف حوالوں سے شر کے نمائندہ کے طور پر موجود ہے مثلاً زرتشت اور مانی مذاہب میں جہاں دو خداؤں کا تصور موجود ہے، وہ ابلیس کو اللہ کی ضد تسلیم کرتے ہیں۔ نیکی کا خدا یزداں ہے اور بدی کا خدا اہرمن یعنی شیطان۔ ہندو اساطیر میں دیوتا اور راکشش بالترتیب خیر وشر کے نمائندہ کے طور پر موجود ہیں۔ بائبل میں جس شیطان کا ذکر ملتا ہے وہ اپنی پوری قوت سے خدا کے ساتھ معرکہ آرائی کرتا نظر آتا ہے۔ وہ خدا کو صرف قوت میں خود سے برتر تسلیم کرتا ہے، جب کہ عقل وخرد میں اپنے مساوی مانتا ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے تو ابلیس روز ازل سے ہی انسان کا دشمن اور بدخواہ ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرنا ہو یا جنت کی پاکیزہ آب وہوا میں دادی حوا کو فریب دے کر شجرِ ممنوعہ کی جانب ترغیب دلانا ہو، اللہ کے حکم کی نافرمانی کے سبب اسے ملعون قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بقول ڈاکٹر منظر حسین لفظ ''ابلیس'' گیارہ بار اور شیطان یا

شیاطین 87 مرتبہ آیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام مذاہب کے پیش نظر ابلیس، شیطان وغیرہ شر کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ ابلیس کی ان ہی باتوں نے عالمی ادب میں اس کو ایک خاص مقام دلایا۔ مغرب کے نمائندہ ادیبوں کرسٹوفر مارلو، جان ملٹن، دانتے اور گوئٹے وغیرہ نے بھی اپنی تخلیقات میں ابلیس کے کردار کو پیش کیا ہے۔ موضوع کی طوالت سے بچنے کے لیے میں نے اپنے مطالعہ کا دائرہ اقبال کی اردو شاعری میں ابلیس کے کردار تک محدود رکھا ہے۔

ابلیس کے ملعون ہونے کی اصل وجہ حکم الٰہی کی نافرمانی اور انکار ہے۔ علامہ اقبال نے بہت ہی خوب صورت انداز میں اس پورے واقعے کو نظم ''تقدیر'' (ابلیس و یزداں) میں اللہ اور ابلیس کے درمیان مکالمہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ نظم کا ایک بند دیکھیے:

اے خدائے ''کن فکاں'' مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود
حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

ابلیس اللہ سے کہتا ہے، اے خالق کائنات! مجھے آدم سے کسی بھی طرح کا کوئی اختلاف نہیں تھا، کیوں کہ جو انسان زمان و مکاں کے معاملات میں الجھا ہوا ہو، اس سے بھلا دشمنی کا کیا فائدہ؟ اے اللہ میرے انکار کی وجہ کچھ اور تھی۔ ابلیس مزید کہتا ہے کہ اے خدا مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں تیرے حضور غرور و تکبر سے بات کرتا، حقیقت یہ ہے کہ تیری مرضی ہی نہیں تھی کہ میں آدم کو سجدہ کروں۔ ابلیس کی اس منطق کے جواب میں اللہ پاک سوال کرتے ہیں کہ اے ابلیس! میری مرضی کا اندازہ تمہیں کب ہوا کہ میں نہیں چاہتا کہ تو آدم کو سجدہ کرے؟

کب کھلا تجھ پہ یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

اللہ کے اس سوال پر ابلیس جواب دیتا ہے کہ یہ راز مجھ پر انکار کے بعد فاش ہوا۔

تب اللہ فرشتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے
کہتا ہے "تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود"
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اللہ پاک فرشتوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ابلیس نے سجدہ نہ کرنے کے جو دلائل دیے ہیں، وہ اس کی فطرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ دراصل ابلیس اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے۔ اس نظم میں ابلیس کے ایمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ابلیس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس روئے زمین کی شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں اس نے اللہ کو سجدہ نہ کیا ہو، وہ اللہ کو اپنا معبود برحق مانتا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ کے حکم کے باوجود اس نے غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع کر دیا۔ یہ جذبہ محبت اور ایمان کی پختگی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اقبال کی نظم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ وہ ابلیس جس نے پوری دنیا میں اللہ کی عبادت کی ہو اسے صرف اس لیے ملعون قرار دیا گیا کیوں کہ اس نے اللہ کے حکم کی ایک نافرمانی یعنی حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اقبال اس نظم سے مسلمانوں کے دلوں میں خوفِ خدا کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔

اقبال کی ایک نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے۔ یہ اقبال کے مجموعہ "ارمغانِ حجاز" میں شامل ہے۔ یہ اقبال کی زندگی کے آخری دنوں میں کہی گئی ایک عمدہ نظم ہے، جس کی اشاعت 1936ء میں ہوئی تھی۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ ابلیس اپنے چند مشیروں کے ساتھ عالمی مسائل اور ابلیسی نظام کے مستقبل پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تاکہ مستقبل میں اس شیطانی نظام کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ نظم کے چند اشعار دیکھیے:

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں
میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کرسکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کرسکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کرتے ہوئے فخریہ انداز میں اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیائے دوں عناصر کا پرانا کھیل ہے، ابلیس بہت خوش ہے کہ اللہ اور ملائک نے بنی نوع انسان سے جو توقعات ابلیس کے خیالات کے برخلاف قائم کی تھیں، وہ ختم ہورہی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانی بستی زوال پذیری کی طرف آمادہ ہے۔ انسان کی اس حالت کو ابلیس اپنی کامیابی تصور کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ذریعے پھیلائی گئی نفرتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فرنگیوں کو بادشاہت کا خواب دکھانے والا، دیروحرم سے غفلت اور بے زاری پیدا کرنے بلکہ اس کے غلبے کو کم کرنے والا میں ہی ہوں۔ سرمایہ داروں کو سرمایہ پرستی اور ناداروں کو بے عمل ہونے اور ہر کام کو تقدیر کے نام کرنا میں نے ہی سکھایا ہے۔ ابلیس فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ جو فساد اور فتنہ ہم نے برپا کردیا ہے، اس کو ختم کرنے کی جسارت کسی میں نہیں۔

ابلیس کی اس تقریر کے بعد پہلا مشیر کہتا ہے کہ یقیناً ابلیسی نظام مستحکم ہے۔ مشیر کہتا ہے کہ اس ابلیسی نظام نے بادشاہ اور غلام دونوں کو جکڑ رکھا ہے۔ روزِ ازل سے ہی

ان غریبوں کے مقدر میں غلامی لکھی ہے اور وہ اپنی پستی پر خوش و خرم ہیں۔ ابلیس کا مشیر یہیں نہیں رکتا بلکہ وہ ابلیسی نظام کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ہماری مسلسل کوشش کا نتیجہ ہے کہ آج مولوی، صوفی وغیرہ کی اکثریت ملوکیت پر راضی ہے۔ ملوکیت کی تعریف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے نقوش اقبال میں یوں کی ہے۔

"انسان دوسروں کی محنت کا استحصال کرے اور جور و جبر یا حیلہ و مکر سے دوسروں کے مال و متاع پر غاصبانہ نظر ڈالے، اس میں فرد و جماعت کسی کی تخصیص نہیں۔"

ابلیس بھی دراصل انسان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر ظلم و جبر اور استحصال کو عام کرنے کا خواہش مند ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کریں:

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علمِ کلام

دوسرا مشیر پہلے کی تائید کرتا ہے مگر اسے جمہوری نظام سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

پہلا مشیر جمہوریت کو خطرہ نہیں مانتا اور وضاحت کرتا ہے کہ جمہوریت اس کے لیے خطرہ نہیں ہے۔ انسان جب ملوکیت کے جبر سے تھک کر بے زار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے جمہوریت کا کھلونا دے کر بہلانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ ہمارے لیے خطرہ ثابت نہ ہو۔ لہٰذا جب دوسرا مشیر یہ کہتا ہے کہ تو دنیا کے نئے فتنوں سے واقف نہیں، یہ جمہوریت ابلیسی نظامِ فکر کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے تو پہلا مشیر اس کے جواب میں نہایت اطمینان سے کہتا ہے کہ اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

پہلا مشیر اس بات پر زور دیتا ہے کہ جمہوری نظام بھی دراصل بادشاہی نظام کی بدلی ہوئی شکل ہے اور یہ کہہ کر وہ مغربی جمہوری نظام پر طنز کرتا ہے۔ پہلے مشیر کا جواب سن کر دوسرا مشیر خاموش ہو جاتا ہے مگر تیسرا مشیر کارل مارکس کے نظریے کو ابلیسی نظام کے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے کہتا ہے:

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیمِ بے تجلی! وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

ابلیس کے مشیروں کو یہ ڈر ہے کہ اگر کارل مارکس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور امیر و غریب کے درمیان بنی معاشی اور سماجی تفریق ختم ہوگئی تو ابلیسی نظام کا خاتمہ طے ہے۔ کارل مارکس کی مشہور کتاب Das Capital کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متکلم کہنا چاہتا ہے کہ کارل مارکس کی کتاب اور اس کے معاشی نظریے کو جس طرح ایک زمانے میں آسمانی صحیفے کی طرح پسند کیا گیا۔ ابلیس کا مشیر کہتا ہے کہ شاہی نظام حکومت سے ڈرنے کی ضرورت تو نہیں ہے مگر اس یہودی (کارل مارکس اور ان کی تصنیف) کی شرارت کا کیا جواب ہوسکتا ہے؟ متکلم کہتا ہے کہ کارل مارکس گرچہ کوئی نبی نہیں تھا مگر اس کے پاس جو کتاب تھی وہ آسمانی صحیفے سے کم مقبول نہیں تھی۔ اس کتاب نے سماج میں پھیلی معاشی تفریق کو کم کرنے، امیروں اور غریبوں کے درمیان معاشی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابلیس اور اس کے فرماں برداروں کو اسی بات کا خوف ہے کہ اگر کارل مارکس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو ابلیسی نظام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اقبال نے ابتدائی دنوں میں اشتراکی نظام کو نہ صرف پسند کیا بلکہ بقول پروفیسر عبدالحق ''اقبال کے نزدیک اس وقت اشتراکی نظام ہی مرض کہن کا چارہ تھا۔'' اقبال نے اشتراکی نظام کی تائید بھی کی مگر بعد میں اس اشتراکی فکر سے اقبال بے زار ہوگئے اور بقول پروفیسر عبدالحق اشتراکیت کے نظام کو حیلۂ پرویزی کہہ کر مسترد کردیا۔

نظم کے آخر کے چند بند کافی اہم ہیں جن میں ابلیس اپنے مشیروں کو مخاطب کرکے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ ان تحریکات اور نظریات سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے ہر کام خواہ وہ سیاسی ہوں کہ سماجی یا اقتدار کی جنگ ہو، سب میں میرا ہاتھ ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہے مرے دست تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں کیا مہر و مہ کیا آسمانِ تو بہ تو

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا شرق و غرب
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو
کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

ابلیس کہتا ہے کہ مجھے کسی بھی چیز سے خطرہ نہیں خواہ وہ زمین ہو، آسمان یا چاند ستارے۔ ابلیس اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یوروپ میں دو ملکوں اور قوموں کے درمیان میں نے جو لڑائی کروائی ہے اسے پوری دنیا جانتی ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ عالمی جنگ اول کی طرف ہے جس کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ ابلیس مزید کہتا ہے کہ مجھے سیاست دانوں یا مذہبی رہ نماؤں سے بھی کوئی خطرہ نہیں لگتا کیوں کہ میری ایک 'ہو' انھیں میرا دیوانہ بنا سکتی ہے۔ جہاں تک اشتراکیت کی بات ہے تو اس سے بھی خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ فطرت کے خلاف انسانوں کی طبعی فرق کو مٹانا چاہتی ہے۔ اقبال نے عالمی جنگ کے لیے ذمہ دار لوگ اور ان کی سوچ، دو قوموں کے درمیان لڑائی، عبادت گاہوں کے تقدس کو پامال کرنے والے مذہبی رہ نماؤں کے فیصلے اور گندی سیاست پر طنز کیا ہے اور اسے ابلیسی عمل بتایا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ ایسے لوگ دراصل ابلیس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ ابلیس کسی سے خوف زدہ نہیں ہے۔ ابلیس کو اپنی حکمت عملی اور منصوبے کے ناکام ہونے کا خدشہ بھی لاحق ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

ابلیس اپنے مشیروں سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے ابلیسی نظام کے لیے اگر کوئی خطرہ ہے تو امت مسلمہ اور امت محمدیہ ہے۔ امت محمدی میں آج بھی ایسے افراد موجود ہیں جن کے اندر جذبۂ شب بے داری و سحر خیزی زندہ ہے۔ مسلم قوم پس ماندہ ضرور ہے مگر یہ ایک ایسی قوم ہے جو کبھی بھی بے دار ہو سکتی ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اہل نظر اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ابلیسی نظام کو اگر کوئی زیر کر سکتا ہے تو وہ قوم مسلمان ہے۔ اقبال نے اشاروں ہی اشاروں میں ان مسلمانوں پر طنز کیا ہے جو اسلامی تعلیمات کو در کنار کر جھوٹ اور فریب، بے ایمانی کو اپنی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

ابلیس اپنے خیالات اور خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ امت محمدی کے پیروکار قرآنی تعلیمات سے دور ہیں اور جس مال کی محبت، ذخیرہ اندوزی سے اسلام نے منع کیا تھا، وہی نفع طلبی اور ذخیرہ اندوزی ان کا مذہب بنتا جا رہا

ہے۔ ابلیس مزید کہتا ہے کہ مجھے اس قوم اور مشرق کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے کیوں کہ علما کرام کی آستین "ید بیضا" سے خالی ہے۔ باوجود اس کے اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ کہیں زمانے کے انقلابات اور تبدیلی اُسے بے دار نہ کردے، جس سے شرع اسلامی اور دین محمدی کی ہمہ گیری پھر سے قائم ہو جائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام مساوات، عزت و حرمت، امانت، شجاعت اور تقویٰ وطہارت کا دین ہے۔ ابلیس کو اصل خطرہ ان ہی باتوں سے ہے:

الحذر آئین پیغمبر ﷺ سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن ، مرد آزما ، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اقبال نے ابلیس کی زبانی نظام اسلامی کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو دور حاضر کے مسائل کا حل معلوم ہوتے ہیں۔ اسلام ایسا مذہب ہے جو مرد وزن کے درمیان مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور ہر قسم کی غلامی کو ناپسند قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام زکوٰۃ دینے کا حکم دیتا ہے جس سے مال واسباب پاک بھی ہوتے ہیں اور غریبوں کی مدد بھی ہوتی ہے۔ یہ وہی مذہب ہے جو امانت میں خیانت کرنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ یہی نہیں مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے اور اس کا مالک کوئی انسان نہیں ہوسکتا۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان تعلیمات اسلام سے دور ہوتا جارہا ہے جس سے ابلیس خوش ہے وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ مسلمان ان تمام باتوں سے واقف نہیں اور ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ مسلمان فروعی مسئلے اور قرآن کی الٹی سیدھی تاویلات میں الجھا رہے۔ جب تک ان سے دین اسلام کی خوبیاں پوشیدہ رہیں گی، ہمارے (ابلیس)

لیے امید باقی رہے گی۔ نظم کے آخری حصے میں اقبال ابلیس کے خیالات کو اس طرح پیش کرتے ہیں :

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

مسلمان جس طرح دنیاداری اور فرسودہ رسم ورواج میں الجھا ہوا ہے، اس سے اسلام کا نقصان ہے۔ ابلیس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان کسی بھی طرح بے دار نہ ہوں بلکہ خواب غفلت اور مسلکی اور علاقائی مسائل میں الجھے رہیں تا کہ انہیں آسانی سے زیر کیا جا سکے۔

علامہ اقبال نے نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بے دار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام مخالف طاقتیں اور ابلیسی نظام اس فکر میں مسلسل لگی ہوئی ہیں کہ کس طرح مسلمانوں کا نقصان کیا جائے، مگر مسلمان جس کے اندر دنیا کو زیروزبر کرنے کی صلاحیت موجود ہے، مگر آج مسائل سے دور ہو گئے ہیں۔ آج مسلمان کا یہ حال ہے کہ ان کا بیش تر وقت ان غیر ضروری مسئلے کو حل کرنے میں گزر جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی یا زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے، قرآن کریم الفاظ کے ساتھ نازل ہوا یا ان کے بغیر، مسلمانوں کا کون سا فرقہ حق پر ہے وغیرہ۔ اقبال کا خیال ہے کہ ابلیس اور ابلیسی فکر رکھنے والے اس بات سے خوش ہیں کہ مسلمان اصل موضوع سے دور ہو گئے ہیں۔ مسلمان بھلے ہی اسلامی تعلیمات کی اہمیت سے واقف نہ ہوں مگر اسلام مخالف طاقتوں کو معلوم ہے کہ اگر اسلام کے ماننے والے اسلام کی بنیادی تعلیمات پر عمل کرنے لگے تو ان کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

یہاں ابلیس وہ ابلیس نہیں ہے جسے انکار کی وجہ سے دھتکارا گیا تھا بلکہ یہ ہم انسانوں میں سے ہے جس کا عمل ابلیس سے کم نہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی پس ماندگی کی اصل وجہ اسلامی تعلیمات کا فقدان ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مسلم مخالف طاقتیں نہیں

چاہتیں کہ مسلمانوں کی حالت بہتر ہو، لہٰذا وہ مسلمانوں کے فرقوں میں منقسم ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک نظم "مکالمہ جبریل و ابلیس" ہے۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے۔ اس نظم میں ابلیس اپنی کارکردگی پر فخر اور حضرت جبریل علیہ السلام کی طاعت گزاری اور فرماں برداری پر طنز کرتا ہے۔ ایک موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت جبریل علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام، ابلیس سے سوال کرتے ہیں:

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو

نظم کی ابتدا اچانک ہونے کے باوجود قاری کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ جبریل اور ابلیس دونوں پرانے دوست ہیں۔ چوں کہ دونوں پرانے دوست ہیں اور ایک زمانے میں ساتھ ساتھ رہتے تھے، لہٰذا حضرت جبریل علیہ السلام ابلیس سے سوال کرتے ہیں کہ اے میرے پرانے دوست دنیا تمھیں کیسی لگی؟ اس سوال کے جواب میں ابلیس کہتا ہے کہ دنیا اسے بے حد پسند آئی کیوں کہ دنیا میں ہر طرف سوز و ساز، داغ و جستجو اور آرزوئیں ہیں۔ تب حضرت جبریل علیہ السلام کچھ دیر سوچ کر کہتے ہیں:

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

ظاہر ہے ابلیس کا شمار بھی فرشتوں میں ہوتا تھا اس لیے حضرت جبریل علیہ السلام ابلیس سے کہتے ہیں کہ آسمان پر ہر گھڑی تیرا ہی ذکر رہتا ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ تو اپنے گناہوں سے توبہ کر لے؟ کیوں کہ تو نے اپنی ایک غلطی کی وجہ سے اپنا بلند و بالا مقام کھو دیا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی اس بات پر ابلیس بڑے ہی تکبر اور تمکنت سے جواب دیتا ہے:

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

اب یہاں میری گذر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں قنطو اچھا ہے یا لا تقنطو!

ابلیس اپنی شاطرانہ چال اور باتوں سے حضرت جبریل علیہ السلام کو قائل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے جبریل تجھے دنیا کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ وہاں ہر طرف رنگینیاں اور رعنائیاں ہیں۔ ابلیس یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے دنیا کی ٹھوکریں تو کھائیں مگر اس سے مجھے اپنی خودی کا عرفان بھی ہوا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اے جبریل اب میرا گزر ایسی دنیا میں ناممکن ہے جہاں زندگی کی ہنگامہ خیزی نہ ہو۔ ابلیس کہتا ہے جس کی وجہ سے ساری دنیا میں سوز و ساز ہو اس کے لیے امید بہتر ہے یا اللہ کی ذات سے نا امیدی؟ حضرت جبریل علیہ السلام، ابلیس کی ان باتوں سے متاثر ہونے کی بجائے اس سے کہتے ہیں:

کھو دیے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

جبریل علیہ السلام، ابلیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو نے اپنی ایک غلطی کی وجہ سے اپنا بلند و بالا مقام کھو دیا ہے یہی نہیں تیری اس حرکت کی وجہ سے اللہ کی نظر میں فرشتوں کی کوئی آبرو باقی نہیں رہی۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو نظر انداز کرتے ہوئے ابلیس جواب دیتا ہے:

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

ابلیس کہتا ہے کہ اے جبریل میری وجہ سے کائنات میں زندگی اور حرکت ہے۔ اے جبریل تو (فرشتے) ساحل کے کنارے خیر و شر کے تماشے دیکھ رہا ہے مگر تجھے کیا معلوم کہ زندگی کے طوفان کا طمانچہ کون کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟ ابلیس کہتا ہے کہ میری موجودگی ہر جگہ ہے، یہی نہیں تیری دنیا بہت خاموش ہے اور مجھے شور شرابہ پسند ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہاں جدوجہد کا موقع میسر نہیں ہے اس لیے مجھے تو دنیا ہی عزیز ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اے جبریل جب کبھی تنہائی میں خدا سے ملاقات کا شرف ملے تو ان سے سوال کرنا کہ قصۂ آدم کو رنگین کس نے بنایا؟ نظم کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

ابلیس کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ساری رعنائیاں اسی کے دم سے ہے۔ میرے انکار کی وجہ سے اللہ کے دل میں ہر وقت یہ بات چبھتی رہتی ہے کہ میں نے کیسے انکار کر دیا۔ دلِ یزداں میں چبھنے کا یہ مطلب ہے کہ میں اللہ کے نیک بندوں کو ہمیشہ بہکاتا رہتا ہوں اور یہ بات ظاہر کہ اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔

''مکالمہ جبریل و ابلیس'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابلیس کا ذکر آسمان پر آج بھی ہوتا ہے اور خوب ہوتا ہے، یہی نہیں حضرت جبریل امین علیہ السلام کی خواہش ہے کہ ابلیس اپنے گناہوں پر نادم ہو اور اللہ سے معافی مانگ لے تاکہ اللہ کی نظر میں فرشتوں کو وہی مقام مل سکے جو ابلیس کے انکار سے پہلے تھا مگر ابلیس اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں اور وہ لگاتار اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ دنیا کی خوب صورتی، رنگینی اور

حرکت اسی کے دم سے ہے۔ یہاں ایک سوال اہم ہے کہ حضرت جبریل جن کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ کوئی بھی کام بغیر اللہ کے حکم کے نہیں کرتے وہ ابلیس کو توبہ کی تلقین کیوں کر رہے ہیں؟ کہیں اللہ کی کی خواہش یہ تو نہیں کہ ابلیس توبہ کر لے؟ ممکن ہے حضرت جبریل نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ابلیس سے گفتگو کی ہو۔

''مکالمہ جبریل و ابلیس'' میں ابلیس کا کردار دلچسپ اور پر کشش اور پوری توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے ابھرتا ہے۔ جب کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام تقدس و احترام کا پیکر ہونے کے باوجود کم زور ہی نظر نہیں آتے بلکہ ابلیس کی دلیلوں کے سامنے بھی وہ کم زور معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ عشق اور جدوجہد پر بڑی سے بڑی شے بھی قربان کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال کی جن نظموں کا مطالعہ میں نے یہاں پیش کیا ہے ان میں ابلیس کی شبیہ کچھ اس طرح ابھرتی ہے کہ کبھی ہمیں اس کی معصومیت پر ترس آتا ہے اور کبھی اس کی سرکشی پر غصہ۔ ابلیس کی وجہ سے مومن عبادت کرتا ہے۔ اگر ابلیس انسان کو بہکانہ چھوڑ دے تو شاید عبادت کی تازگی جاتی رہے، اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس دنیا کے نظام میں انتشار پیدا کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ اقبال کی دو نظموں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' اور ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' میں ابلیس کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں میں ابلیس سے مراد ابلیسی فکر یا انسانیت مخالف فکر کو پیش کیا جاتا ہے۔ اقبال کا ابلیس مختلف جہتیں رکھتا ہے، ایک جہت تو وہی مذہبی روایت کا حصہ ہے جس میں ابلیس کو برائیوں کا سرچشمہ کہا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ ابلیس ہی دراصل بھلائی کی طرف ابھارتا ہے۔

❖❖❖

انگریزی مقالہ: ڈاکٹر سنگھا مترا باسو (نئی دہلی)
اردو ترجمہ: شاہد اقبال (کولکاتا)

شیخ محمد اقبال اور رابندر ناتھ ٹیگور

مشترکہ ثقافتی ورثہ

محمد اقبال (1938ء-1877ء) اور رابندر ناتھ ٹیگور (1941ء-1861ء) برصغیر کے دو عظیم شاعر-فلسفی ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں عالم گیر شہرت پائی۔ دونوں کا تعلق بالکل مختلف سماجی-مذہبی پس منظر سے تھا، دونوں نے بالکل مختلف زبانوں میں لکھا، ان کے معاصر واقعات وحالات کے تئیں ان کی فکر بھی مختلف تھی، مگر دونوں نے ہی اپنے فلسفیانہ تناظر میں انسانیت کی شان وشوکت اور اعلیٰ قدروں کی حمایت کی۔ دونوں کے فلسفے اور شعری نگارشات میں کافی مماثلت موجود ہے۔

خانوادۂ ٹیگور کا تعلق برہمنوں کے سندلیا گوت سے تھا مگر بعد میں ان کے اجداد کے مسلمانوں سے ازدواجی تعلقات کے سبب انھیں پیرالی برہمنوں کے نام سے بھی جانا گیا۔ سوئے اتفاق اقبال کے اجداد کشمیری برہمنوں کی ایک ذیلی ذات سپرو سے تعلق رکھتے

تھے جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ اقبال کو اپنے اجداد کے سپرو برہمن ہونے پر ہمیشہ فخر رہا جو اپنی دانش وری اور عالمیت کے سبب مشہور تھے۔

ٹیگور ایک اصلاحی پسند ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد دیبندر ناتھ ٹیگور فارسی جانتے تھے اور کم سن ٹیگور کو حافظ اور سعدی کے اشعار سنایا کرتے تھے، جس سے ایرانی صوفی شعرا کے تئیں ٹیگور کے دل میں تاحیات عقیدت و احترام پیدا ہوگیا تھا۔

اقبال کی ولادت اور پرورش و پرداخت ایک راسخ العقیدہ سنی مسلم خانوادے میں ہوئی تھی۔ مولانا روم کی شاعری اور فلسفے سے اقبال بے حد متاثر تھے اور انھیں اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

یہ اثرات دونوں ہی کی شاعری میں منعکس ہوتے ہیں۔ ٹیگور بردبار اور سنجیدہ تھے۔ اقبال جارح اور پرجوش تھے۔

مشہور انگریز ناول نگار ای. ایم. فوسٹر نے، جو ہندوستان کو نزدیک سے جانتے تھے، ٹیگور اور اقبال کے فرق کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے :

> ''اقبال کافی ذہین اور دبنگ ہیں اور اگرچہ میں اکثر ان سے اتفاق نہیں کرتا اور ٹیگور سے عموماً متفق ہوتا ہوں، تاہم یہ اقبال ہیں جنھیں میں پڑھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ان کے ساتھ کہاں ہوں۔''

اقبال خود کو 'زندہ رود' کہتے تھے جو رومی کی روبری میں مختلف خطوں اور افلاک سے گزرتا ہوا بالآخر نور یزداں سے جا ملتا ہے۔

عمیق خیالات اور شدتِ جذبات دونوں کی نظموں کی مشترکہ خصوصیات ہے۔ زندگی کا اہم، متحرک اور نیا طرز اظہار دریافت کرتے ہوئے دونوں کی تحریریں ایک بے خوف ذہن کا تاثر چھوڑتی ہیں۔ دونوں نے ہی اپنے عظیم الشان کارناموں کے لیے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ ساری دنیا کے مخلص و سنجیدہ قارئین کی علمی ضرورتوں کے پیش نظر ان کی تخلیقات کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اقبال کی تخلیقی زندگی کے بڑے حصے میں ان کی تحریریں خصوصاً فارسی میں ہیں مگر 1930ء کے بعد انھوں نے زیادہ تر اردو میں لکھنا شروع کر دیا۔

یہ رابندر ناتھ ٹیگور ہی تھے جنھوں نے اپنی نگارشات کے ذریعہ بنگلہ ادب کو عالمی ادبیات کی بہترین اقسام کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔

ٹیگور بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ہمیشہ شاعر ہی رہے۔ ان کے نغموں میں شدتِ جذبات اور خود سپردگی کے ساتھ بے مثال موسیقیت کا اجتماع ملتا ہے جب کہ اقبال از اول تا آخر ایک مبلغ ہی رہے۔ اس سلسلے میں رفیق زکریا کا ایک اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے:

"ٹیگور نے انسان میں رومان کو دریافت کیا؛ اقبال نے جاں بازی و جاں نثاری کو۔ ٹیگور نے نسوانی حسن کی تشریح کی؛ اقبال نے مردانہ شجاعت کی۔ ٹیگور کی شاعری میں موسیقیت ہے؛ اقبال کی شاعری میں آتشیت۔ ٹیگور ہمیشہ باعمل رہے، اقبال پرسکون۔

معروف ماہرِ طبیعیات اور نوبل انعام یافتہ سائنس داں سی وی رمن کے مطابق:

"ٹیگور سکون کی تبلیغ تو کرتے ہیں مگر عمل کی مشق کرتے ہیں؛ اقبال سکون کی مشق کرتے ہیں مگر عمل کی تبلیغ کرتے ہیں۔"

ٹیگور اور اقبال دونوں تقریباً ایک ہی دور سے منسلک تھے اور دونوں میں ایک دوسرے کے تئیں بڑی عزت و تکریم تھی۔ تقابلی مطالعہ پر بات کرنے سے قبل مجھے لازمی طور پر ٹیگور اس کے خط کا ذکر کرنا چاہیے جو انھوں نے اقبال کے دوست ڈاکٹر عباس علی خاں کو 7 فروری 1933ء کو لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات سے دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے میری اور عظیم شاعر سر محمد اقبال کی شاعری میں گہرا ربط پایا..... مجھے اس بات سے اکثر کافی تکلیف پہنچی ہے کہ ناقدوں کا ایک گروہ تقابلی اساس پر میری اور سر محمد اقبال کی ادبی خدمات کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادب (جو ایک آفاقی ہے) کے تئیں یہ ایک غلط رویہ ہے۔ مجھے یقین

ہے کہ میں اور سر محمد اقبال دونوں ادب میں صداقت اور حسن کی تلاش پر مامور دوست ہیں، اور ایک ایسے مقام پر ہماری ملاقات ہوتی ہے جہاں انسانی ذہن آدم ابدی کے حضور میں اپنے بہترین نذرانے پیش کرتا ہے۔''

اقبال نے حالاں کہ کبھی عوامی سطح پر ٹیگور کی ستائش نہیں کی، مگر وہ ٹیگور کی شاعری سے بخوبی واقف تھے۔ جب اقبال کے نجی کتب خانے کی کتابوں کی فہرست سازی کی گئی تو ٹیگور کی کتابوں کے چھ انگریزی ترجمے دریافت ہوئے۔

اقبال اور ٹیگور-محب وطن

دونوں ہی شاعر تقریباً اس دور میں زندگی گزار رہے تھے جب پورے ملک میں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستانی اپنے برطانوی حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور یہ دونوں شاعر اپنے قلم سے ایک فکری انقلاب برپا کر رہے تھے۔ مجاہدین آزادی کو ان کے نشانے کی طرف پیش قدمی کے لیے متاثر کرنے میں یہ دونوں بھی کم نہیں تھے۔ ان شاعروں کی نظمیں جو آزادی کے نعروں سے معمور تھیں، ہر ہندوستانی کے لبوں پر جاری تھیں۔

اقبال کا ''ترانۂ ہندی'' جو دل کو چھو لینے والے شعر ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا..... ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا'' سے شروع ہوتا ہے، مادر وطن کے لیے ان کی والہانہ محبت کا بہترین اظہار ہے۔ یہ ایک لافانی نظم بن چکی ہے اور ہر ہندوستانی شدید جذبات کے ساتھ اسے گنگناتا ہے۔

نظم ''بچے کی دعا'' میں وہ کہتے ہیں کہ ہر بچے کو اپنے وطن کی زینت اسی طرح بڑھانی چاہیے جس طرح پھول سے باغ کی زینت ہوتی ہے۔

اپنی نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں انھوں نے اپنے وطن کی کثیر مذہبی خصوصیت کے باوجود اس (میں بسنے والوں) کی یک جہتی اور اتحاد کو سلام کیا ہے۔

اقبال مختلف طبقوں کے آپسی اختلاف سے باخبر تھے۔ اپنی نظم ''نیا شوالہ'' میں وہ

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے اپنے اختلافات ترک کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ملک کے مختلف طبقات کے مابین ہم آہنگی، محبت اور اخوت کی فضا قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ایک ہی بت 'ہندستان' کی پرستش کی جائے۔ شاید کسی بھی دیگر ہندستانی زبان میں ایسی کوئی نظم نہ ہو جس میں ہندو۔ مسلم اتحاد کا اتنے واضح لفظوں میں اظہار ہوا ہے۔ ان کے نزدیک قومی یک جہتی کی اساس حب الوطنی ہے۔

اپنی نظم ''ہمالہ'' میں اقبال نے کوہِ ہمالہ کو صرف ایک پہاڑ نہیں بلکہ ہندوستان کی قومی یک جہتی کا نگہ بان قرار دیا ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ اپنے مادرِ وطن سے اقبال کی محبت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کے بعد از مرگ شائع ہونے والے مجموعے ''ارمغانِ حجاز'' میں ملک کو آزاد دیکھنے کی ان کی شدید خواہش کا اظہار ملتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور، ایک نادر اور عظیم المرتبت شاعر، فلسفی اور محبِ وطن بھی تھے۔ میدانِ ادب کے علاوہ (میری مراد تحریکِ آزادی ہے) قوم کے لیے ان کی خدمات بہت زیادہ اہم نہیں ہیں۔ مگر (بحیثیت) شاعر ٹیگور نے ایسے نغمے لکھے جو مجاہدینِ آزادی کو متاثر کرتے تھے، جو ہر کسی کو خبردار کرتے تھے کہ مذہبی رجعت پسندی کے سامنے سرنگوں نہ ہو اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر ملک کی آزادی کے نشانے کو حاصل کرے۔ آزادی کے بعد ٹیگور کا گیت ''جَنَ گَنَ مَنَ'' جو مادرِ وطن کی نصرت و فتح کا اعلان کرتا ہے، قومی ترانے کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔

جب کبھی بھی مادرِ وطن نے آواز دی، رابندر ناتھ اپنی تمام تر ذہانت کے ساتھ لبیک کہنے میں کبھی نہیں پیچھے نہیں رہے۔ 1905ء سے 1908ء کے سیاسی خلفشار کے دور میں جب بنگال کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا، انھوں نے ملک کی جس طرح حوصلہ افزائی کی، وہ قابلِ ستائش ہے۔ گیتوں کے ذریعہ، تقریروں کے ذریعہ، طنز و جذبات سے پُر ادبی نگارشات کے ذریعہ، علامتی تحریکات (راکھی بندھن) کے ذریعہ انھوں نے قومی یک جہتی کی روح (Spirit) کو زندہ رکھا۔

ٹیگور اور اقبال - قدرت کے پرستار

بچپن سے ہی رابندر ناتھ ٹیگور کا قدرت سے لگاؤ فطری تھا جیسا کہ وہ رؤسا کے بچوں کی طرح نوکروں کے ذریعہ پروان چڑھے تھے۔ قاری کو یہ احساس ٹیگور کی شاعری میں با آسانی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں حیوانات و نباتات کے ساتھ قدرت اور انسان کے ماحول کے ہر ممکنہ پہلو کی عکاسی ملتی ہے۔ قدرت کے کارخانے کا چھوٹے سا چھوٹا نکتہ ان کی تخلیقات کے کینوس کا حصہ ہے۔

ایک فلسفی - شاعر کی حیثیت سے ٹیگور نے ابدی روح کو قدرت کی صناعی میں موجود پایا۔ ''بن بانی'' کی تمہید میں ٹیگور نے قدرت تک اپنی رسائی کا ایک دلچسپ فلسفیانہ خاکہ کھینچا ہے۔ 'قدرت کی زبان' مخلوق کی دائمی زبان ہے۔ یہ ہمارے شعور کی عمیق ترین پرت تک حقیقت کو پہنچاتی ہے۔ یہ زندگی کی مشترکہ لے کی نقالی کرتی ہے۔ اگر ہم اپنے اندر موجود اس موسیقی کو اپنا سکتے ہیں، تو ہم وحدانیت کی عظیم موسیقی کا بھی ادراک کر سکتے ہیں۔

ان کے نزدیک موسموں کا تغیر محض قدرت کے خارجی مظاہر کی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ایک مرحلے کی تبدیلی کا، حیاتِ داخلی کی تبدیلی کا اشارہ ہے۔

اقبال بھی قدرت کو کم و بیش اسی طرح تصور کرتے ہیں۔ قدرت کے تئیں ان کا نظریہ محض جذباتی یا دانش ورانہ نہیں تھا، بلکہ یہ کسی حد تک دونوں کا آمیزہ تھا۔ اقبال عالم قدرت کو مقدس اور بامقصد تصور کرتے تھے اور اس کے مشاہدہ کو عبادت تسلیم کرتے تھے۔ اقبال کی نظریں مظاہرِ قدرت اور حسنِ فطرت میں خدائے لم یزل کے جلووں کا نظارہ کرتی تھیں۔ یہ تصور ان کی شاعری میں لگاتار ان کے ساتھ رہا۔ اقبال کی بالغ نظر قدرتی شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہمیں ''پیامِ مشرق'' کی نظم ''فصلِ بہار'' میں ملتا ہے۔ موسمِ بہار کی رعنائیاں اور مدہوش کرنے والی خوب صورتی سے تجاوز کرتے ہوئے شاعر تمام مظاہرِ قدرت کی علامتی قدروں کا تعین کرتا ہے۔

'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' میں وہ لکھتے ہیں :

''قدرت کا علم خدا کے Behaviour کا عرفان ہے۔ اپنے مشاہدۂ قدرت میں ہم مجازی طور پر مطلق انا کے ساتھ ایک قسم کی قربت کا اظہار کرتے ہیں، اور یہ پرستش کی ہی ایک قسم ہے۔''

اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ دونوں شاعروں کے مشاہدۂ قدرت میں قاری کو ایک ہی گونج سنائی دے گی۔ دونوں ہی صوفی شاعر مظاہرِ قدرت میں خودی کی تلاش کرتے ہیں۔

اقبال اور ٹیگور-فلسفیانہ افکار

اقبال کی ولادت اور پرورش و پرداخت ایک راسخ العقیدہ گھرانے میں ہوئی تھی جہاں اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر گھر کا نظام چلتا تھا۔ مگر انھوں نے جہاں مغربی فلسفیانہ افکار کا گہرا مطالعہ کیا وہیں ہندوستانی صوفیوں و مفکروں سے بھی متاثر ہوئے۔ اپنی والدہ کے انتقال پر لکھی گئی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' میں وہ لکھتے ہیں :

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

(موت نیند کے پردے میں چھپی زندگی کی حقیقت سے
پردہ اٹھنے کا دوسرا نام ہے اور بیداری کا ایک پیغام ہے۔)

اقبال کا اعتقاد انسانی روح کے لافانی ہونے پر تھا۔ ایسا ہی عقیدہ ٹیگور کا بھی تھا جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

"In my new birth you will call me in new name and a new relal will be established."

(میری حیاتِ نو میں تم مجھے ایک نئے نام سے پکارو گے اور ایک نیا عرفانِ حیات قائم ہوگا۔)

یعنی دونوں ہی شاعر موت کو روح کا خاتمہ نہیں تسلیم کرتے تھے۔

جدید ہندستان کے دو عظیم صوفی شاعر اقبال اور ٹیگور کے ہاں بنیادی فلسفیانہ افکار انسانیت نوازی کے ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوئے ہیں۔ دونوں نے ہی انسانیت کے ساتھ حقانیت یا سچائی یا خدا کا اظہار کیا ہے۔ اقبال تسلیم کرتے ہیں کہ خدا نے اپنی مہم جوئی کا مظاہر کرنے کے لیے تخلیق کا بکھیڑا نہیں لیا۔ دراصل انسان کی تخلیق خدا کی قدرت کی تکمیل کے لیے لازمی تھی۔ (تعمیرِ خودی میں ہے خدائی)۔ ٹیگور بھی کہتے ہیں کہ ''میری دنیا میں تمہارا اعلیٰ ترین استحقاق مختلف رنگوں سے بنے گا۔''

ٹیگور اور اقبال دونوں نے ایک کامل فردِ واحد کی حقیقت کو تسلیم کیا جو دائمی تخلیقیت کے ساتھ یکساں ہے۔ ٹیگور کے مطابق زندگی کا عمل ایک لامحدود جستجو کی جانب پیش قدمی ہے۔ ہم یہاں بھی دونوں کے درمیان تعلق دیکھتے ہیں جیسا کہ اقبال کا خیال بھی ہے کہ آگے اور مزید آگے جانے کے لیے انسان خودی کی احیا کی نئی حالتیں تلاش کرتا ہے۔ (بالِ جبریل)

دونوں بردباری اور میانہ روی کی بنیادوں پر معتدل زندگی گزارتے تھے۔ ہم ''گیتانجلی'' میں ٹیگور کو خدا تعالیٰ سے خطرے سے حفاظت کی دعا مانگتے نہیں دیکھتے بلکہ وہ ناموافق حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کرنے کی دعا مانگتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کی ''پیامِ مشرق'' کے مصرعوں میں بھی اسی طرح کے خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔

"Feast not on the shores for there softly breathes the tune of life. Grapple with the waves and dare; immortality is strife."

درحقیقت رابندر ناتھ کے برعکس اقبال خطرات سے پر زندگی گزارنے میں زیادہ جرأت مند تھے۔

ٹیگور اور اقبال کے نظریات میں عشق کی اہمیت یکساں ملتی ہے۔ ٹیگور کہتے ہیں:

''..... عشق وہ اعلیٰ ترین سعادت ہے جو انسان حاصل کر سکتا ہے، کیوں کہ اسی کے ذریعہ وہ جان سکتا ہے کہ وہ خود سے زیادہ ہے، اور یہ کہ وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے۔''

اقبال کے مصرعوں میں کچھ اس طرح کے خیالات منعکس ہوتے ہیں:

"جب عشق کے ذریعہ خودی مضبوط ہوتی ہے، اس کی طاقت سارے جہاں پر حکمرانی کرتی ہے۔"

مگر اقبال نے ایک شدید اور جارح نظریۂ عشق کی تبلیغ کی۔ ہم انھیں کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ "عشق موت کی ایک چمکتی تلوار ہے۔" شاید ہی کبھی ٹیگور نے عشق کو ایک تلوار سے تشبیہ دی ہو بلکہ ان کے نزدیک یہ تلوار پر فتح حاصل کرتا ہے۔

تاہم نہ تو اقبال اور نہ ہی ٹیگور دانش وری کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک عشق اور عقل دونوں ہی حقانیت کے متلاشی ہوتے ہیں مگر دونوں کے راستے الگ ہوتے ہیں۔

(بھگتی اور جن مارگ)

ہم اقبال اور ٹیگور دونوں کے یہاں شاعر اور ایک عام آدمی کو متحد پاتے ہیں اور وہ دونوں ہی کبھی بھی تحنث اور فرار کے حامی نہیں تھے۔

وجودِ مطلق کی جانب مثبت پیش قدمی کے باوجود ٹیگور نے خدا کے سامنے خود کو سرنگوں کرنے کی تبلیغ کی۔ ٹیگور کے فلسفیانہ افکار میں ہم یہ سطریں پاتے ہیں کہ "اپنی ساری انانیت کو اشکوں میں ڈبو دیا۔" جب کہ اقبال خود کی نفی کے ہر خیال سے منحرف ہیں۔ اقبال کے فلسفے میں نظریۂ خودی رابندر ناتھ سے زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا کمال خدا کے حضور میں اس کے زاویۂ انا کے ارتقا کے متناسب ہوتا ہے۔ انسانیت کی منزل تابع دار ہونا نہیں بلکہ خدا کے حضور میں انسانی انا کی سرفرازی ہے۔ پھر بھی دونوں صوفی شاعروں نے اپنے اپنے مذہب میں عبادت کے مقام کو تسلیم کیا۔

میں اپنی بات کا اختتام ٹیگور کے ان سطروں سے کرتی ہوں جو انھوں نے اقبال کی وفات پر قلم بند کیے تھے :

"سر محمد اقبال کی وفات سے ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو ایک کاری زخم کی مانند بھرنے میں کافی وقت لگائے گا۔ ہندوستان، جس کا مقام دنیا میں بہت کم زور ہے، ایک ایسے شاعر کی کمی کا بہت مشکل سے متحمل ہوگا جس کی شاعری ایسے آفاقی اقدار کی حامل تھی۔"

❖❖❖

ALLAMA IQBAL

HAYAAT - O- KHIDMAAT

Compiled by

Dr. Nayeem Anis

West Bengal Urdu Academy

Minority Affairs & Madrasah Education Department,
Govt. of West Bengal
75/2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016

ISBN 978-93-84286-15-6

Price : ₹ 250 /-